گردِ راہ

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری

URDU ADAB DIGITAL LIBRARY (BAIG_RAJ)

اُردو ادب ڈیجیٹل لائبریری (بیگ راج)

اُردو ادب ڈیجیٹل لائبریری میں تمام ممبران کو خوش آمدید
اُردو ادب کی پی ڈی ایف کتابوں تک با آسانی رسائی کیلئے
ہمارے واٹس ایپ گروپ اور ٹیلی گرام چینل کو جوائن
کریں۔ اور با آسانی کتابیں سرچ اور ڈاؤنلوڈ کریں۔

+92-307-7002092

گردِ راہ

حاصلِ عُمرم سہ سُخن بیش نیست
خام بُودم، پُختہ شُدم، سُوختم (رومی)

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری

گمراہ

(خود نوشت، مطالعہ، مشاہدہ)

مکتبۂ افکار

(رابسن روڈ۔ کراچی)

(جملہ حقوق بحق سلمان حسین محفوظ)

طبع اوّل ——— جنوری ۱۹۸۴ء

سرورق ——— موجد

کتابت ——— عبدالرحیم انصاری

تعداد ——— گیارہ سو

ناشر ——— مکتبۂ افکار۔ رابسن روڈ۔ کراچی

طابع ——— مشہور آفسٹ پریس۔ کراچی

انتساب

حمیدہ کے نام

فہرست

حرفِ آغاز ۹

۱۔ زندگی کے ابتدائی سال ۳۳

۲۔ کلکتہ کی یادیں ۵۱

۳۔ علم و ادب کی سمتیں ۷۲

۴۔ حیدرآباد دکن کی انجمن آرائی ۸۹

۵۔ یورپ کا پہلا سفر ۱۲۱

۶۔ یورپ سے واپسی کے بعد ۱۴۶

۷۔ پاکستان ناگزیر تھا ۱۶۵

۸۔ دنیا بدل گئی ۱۸۹

۹۔ سیرِ عالم ۱۹۹

۱۰۔ ایران میں چار سال ۲۱۳

۱۱ - فلسطین میں چند ہفتے ۲۲۵
۱۲ - اسپین کی جھلکیاں ۲۳۷
۱۳ - اطالوی تاریخ و فن کے نقوش ۲۴۴
۱۴ - امریکہ کے چند تاثرات ۲۴۹
۱۵ - جاپان کی دلآویزی ۲۵۶
۱۶ - چند دیگر ممالک کی بھولی بسری یادیں ۲۶۲
۱۷ - ادب کا ماضی و حال ۲۶۸
۱۸ - حُسن کی تلاش ۲۸۶
۱۹ - حقیقت کی تلاش ۲۹۴
۲۰ - حرفِ آخر ۳۰۹

حرفِ آغاز

بیا و رید گر ایں جا بود زباں دانے
غریبِ شہر سخن ہائے گفتنی دارد

اسمٰعیلی امام حسن دوم نے ایک بار اپنے معتقدوں سے کہا کہ آج قیامت کا دن ہے، آؤ کفن اوڑھ کر داورِ محشر کے حضور لیٹ جاؤ۔ پھر ایک وعظ سُنا کر انھیں سجدے سے اٹھایا۔ کفن اتارا اور اعلان کیا کہ اب تمھارا نیا جنم ہوا ہے۔ تم ظاہری شریعت کی پابندیوں سے آزاد ہو گئے اور تمھارے لیے نیا آئین وضع کیا گیا۔

اس صدی میں بھی کیسے کیسے امام آئے اور انھوں نے کیسی کیسی قیامتیں برپا کیں اور ان قیامتوں سے گزرتے ہوئے زندگی کے سفر میں ہم لوگ کہاں سے کہاں نکل آئے؟

کفن بیار تو تابوت و جامہ نیلی کُن
کہ روزگار طبیب است و عافیت بیمار

جب دن ڈھلنے لگتا ہے تو سامنے دھندلکا ہوتا ہے، وقت پیچھے رہ جاتا ہے اور ماضی سائے کی طرح پاؤں سے لپٹ جاتا ہے۔ سولہ سال کی عمر میں میں علم کی تلاش میں گھر سے نکلا تھا۔ اور اب گردِ راہ کو دامن سے جھٹکنے کی فرصت ملی ہے۔ ہر شخص عموماً اپنی ذات میں گم صُم رہتا ہے۔ بہ ایں ہمہ شعوری یا غیر شعوری طور پر وہ اپنے عہد اور ماحول سے بہت کچھ

اخذ کرتا ہے۔ احباب کا تقاضا ہے کہ از سرِ نو قلم اٹھاؤں اور اپنی سرگزشت لکھ ڈالوں۔ مجھے اس میں تامّل ہے۔ میں طبعاً خلوت پسند ہوں۔ اور دنیا کو رازداں بنانا مجھے پسند نہیں۔ البتہ دوسروں کی طرح میں بھی اپنے دور کا گواہ ہوں۔ اپنے مشاہدے اور مطالعے پر مجھے اعتبار ہے اور کئی ایسی تحریکوں اور شخصیتوں سے واسطہ پڑا جنھوں نے کسی نہ کسی طرح ماحول کو متاثر کیا۔ فطرت اور تاریخ سے دلچسپی نے کیا کیا تماشے دکھلائے۔ مشرق اور مغرب کی کیسی کیسی سیاسی اور ثقافتی محفلوں سے روشناس ہوا اور فکر و عمل کے کیا کیا تجربے ہوئے۔ یہ تذکرہ خالی از لطف نہیں۔

جب گوتم بدھ کا آخری وقت آیا تو اپنے شاگردوں سے پوچھا کہ کیا کوئی ایسا سوال باقی رہ گیا جس کا جواب میں نے نہ دیا ہو۔ ان میں سے کسی نے کہا کہ آپ نے سب کچھ بتایا لیکن یہ معمّا حل نہ کیا کہ آفرینش سے پہلے کیا تھا اور موت کے بعد کیا ہوگا۔ گوتم بدھ نے کہا کہ اس طلسم کی کلید انسان کے پاس نہیں۔ اس کا مقدّر فقط یہ ہے کہ حیاتِ مستعار کے مسائل کو سمجھے اور حل کرے۔ یعنی بقول کارل مارکس، فلسفی زندگی کو سمجھنے میں بہت سر کھپا چکے، اصل مسئلہ اُسے بدلنے کا ہے۔

لامکاں کے مقابلے میں ہمارا ارضی مکان کتنا حقیر ہے اور ناپیدا کنار زمانے کے مقابلے میں حیات کے لمحات کتنے مختصر۔ لاکھوں سال پہلے کُن یا ارتقا کے کرشمے نے ایک دو ٹنگے جانور کو پیدا کیا جو بھوک، شہوت اور زمین گردی کی تسکین میں ہمہ تن مصروف ہو گیا۔ اس کاوش کی داستان کو تاریخ کہتے ہیں جس کا بیشتر حصّہ اجتماعی انسان کے تحت الشعور اور جبلّتوں میں کھو گیا اور جو بچ رہا وہ چند ہزار سال کی باقی ماندہ تحریروں اور کتبوں میں محفوظ رہ گیا۔ اس کا ماحصل کیا ہے؟ عدیم النظیر تاریخ سلطنتِ روما کا زوال، کہ مصنّف گبن کے الفاظ میں "انسانیت کی تاریخ حماقتوں اور جرائم کے دفتر کے سوا کچھ نہیں"۔

عہدِ حاضر بھی اسی قدیم روایت کے مطابق اپنی تاریخ لکھ رہا ہے۔ مذہبوں اور نظریوں کی کشمکش، رنگ و نسل کے تنازعے، طبقاتی جدل اور قومی و لسانی تعصّبات کے نرغے میں انسان اس طرح مبتلا ہے کہ تہذیب کا ملمّع ڈھل گیا۔ اور آدمی بساطِ ہستی پر اسی

طرح اوندھا پڑا ہے۔ جہاں اس کے جدِّ امجد نے باغِ عدن یا پہاڑ کی کھوہ سے نکل کر خود کو پایا تھا۔

تاہم اس شکست و ریخت میں انسانیت کی تعمیر کے لیے دو ستون باقی ہیں۔ جمہوریت اور اشتراکیت۔ بڑی بڑی قربانیوں کے بعد ان کی تعمیر ہوئی ہے اور ان کی بقا پر مستقبل کا انحصار ہے۔ جمہوریت سے مراد حکومت پر جمہور کا اختیار اور اشتراکیت سے مراد اقتصادی وسائل پر جمہور کی حکمرانی ہے۔ ایک کے بغیر دوسرے کا تصوّر تشنہ ہے۔ ہر دو کا جواز فرد کی فلاح ہے۔ میرا ذہن جمہوریت پر سرمایہ داری کے تسلّط کو اسی طرح مسترد کرتا ہے جس طرح اشتراکیت پر کسی قسم کی ڈکٹیٹر شپ کو۔ ان میں کوئی بنیادی تضاد نہیں اور اگر کوئی تضاد نظر آتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ کارل مارکس کی پیش گوئی کے برعکس اشتراکیت ترقی یافتہ صنعتی ممالک میں قائم ہونے کی بجائے پس ماندہ زراعتی ممالک میں ظہور پذیر ہوئی۔ صنعتی ممالک میں ان لوگوں کی اکثریت ہوتی ہے جو جسمانی یا ذہنی اعتبار سے محنت کش ہیں، تو پھر وہاں ڈکٹیٹر شپ کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔

تاریخ، انسان کی ہمہ جہت جدّ و جہد کا تجزیہ ہے اور وقت کی سیاست اس کا جزو محض ہے۔ ساری عمر میں نے اسی انداز سے مطالعہ کیا ہے اور نہ یہ کہ میرے درس و تدریس میں شامل رہا ہے، بلکہ تا ایں دم میرے غور و فکر کا محور ہے۔ تاریخ کا شعور تحریکوں اور شخصیتوں کے داخلی محرکات کو ظاہر کرتا اور ذہن کو پیش بینی کی صلاحیت عطا کرتا ہے۔ واقعہ نگاری کی حیثیت تاریخ کے خام مواد سے زیادہ نہیں۔

لیکن تاریخ کے عمل میں کوئی منطق کارفرما ہے یا نہیں؟ کیا ارتقا کا عمل بقول ہیگل انسانیت کو قدم بہ قدم کسی "آئیڈیا" کی طرف لے جاتا ہے۔ یا بقول کارل مارکس، غیر طبقاتی ارضی جنّت کی طرف جہاں پہنچنے کے لیے انقلاب کے پل صراط سے گزر کر ڈکٹیٹر شپ کے برزخ میں رہنا ہوگا؟ اور یا تہذیبوں کا عروج و زوال، بقول ٹوائن بی، گردشِ مدام کا تماشا ہے؟ مذہبی تصوّرِ حیات کے مطابق یہ سب کچھ نہیں، بلکہ تاریخ خیر و شر کی مسلسل کش مکش کا ڈراما ہے، جس کا ڈراپ سین قیامت کی شکل میں ہویدا ہوگا۔ اور اس کے خطرے سے

زمین دوز جوہری دھماکے صورِ اسرافیل کی طرح دنیا کو آگاہ کر رہے ہیں۔

میں ازل اور ابد کے رازوں سے ناواقف، فقط عالمِ وجود کے عجائبات کا تماشائی ان سوالوں کا کیا جواب دے سکتا ہوں:۔

سُنی حکایتِ ہستی تو درمیاں سے سُنی
نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم

انسان کی سب سے بڑی ایجاد زبان ہے اور ادب اس کے تخلیقی اظہار سے عبارت ہے، خواہ وہ نظم میں ہو یا نثر میں۔ ادب سے مجھے بچپن سے شغف رہا ہے اور کئی زبانوں کی استعداد نے اس شوق کی تکمیل میں مدد کی ہے۔

زبان کی ترقی معاشرے کی ترقی سے وابستہ ہے۔ معاشرے کی ترقی کا تصوّر تنقید کے بغیر نہیں کیا جا سکتا۔ اور یہ کام نثر کا ہے۔ جب ہم کسی ملک کی پس ماندگی کا ذکر کرتے ہیں تو مراد صرف اس کی معاشیات نہیں۔ یہ بات دور تک پہنچتی ہے اور تجزیہ بتلاتا ہے کہ بنیادی طور پر قصور ذہنی پستی کا ہے اور اس کی اصل وجہ تنقید سے گریز ہے۔

مشرقی ذہن کو بالعموم اور اسلامی ذہن کو بالخصوص فقہا اور شاعری نے یوں نقصان پہنچایا کہ ایک نے تنقید کی صلاحیت کو، دوسرے نے اس کے اظہار کو مسدود کر دیا۔ شاعری کی لُغت محدود ہے کیونکہ یہ اصلاً عالمِ بیداری کی نہیں عالمِ خواب کی لُغت ہے۔ اس کا مقصد گفتگو نہیں سرگوشی ہے۔ جب تک جہانِ ایجاد قبائل اور زراعتی معاشرے تک محدود تھا اور شاعری کی نغمگی پر موسیقی کا دھوکا ہوتا تھا، شاعری، خدا، عورت اور فطرت کی رازدانی کا دعویٰ کر سکتی تھی۔ لیکن جب جدید علوم کا دور چند صدیوں پہلے شروع ہوا اور اس کے ساتھ صنعت و ابلاغ کا دور دورہ ہوا تو جہانِ معنیٰ میں ایسی وسعت ہوئی کہ شاعری کا دامن سمٹ کر رہ گیا۔ اس حد تک کہ بیسویں صدی کے وسط سے لے کر اب تک دنیا کی کسی زبان میں کوئی بڑا شاعر نہیں ہوا۔

یہ قول تخلیقی نثر پر اس حد تک عاید نہیں ہوتا کیونکہ تہذیب کی کال کوٹھریوں میں جو مُردے گڑے ہوئے ہیں اور جو اسیرِ پا بہ جولاں ہیں، ان کے بیان کا سلیقہ نثر ہی کو آتا ہے۔

اگر اس کا جلوہ ہم اردو میں کم دیکھتے ہیں تو اس کا بڑا سبب برِّصغیر کی تقسیم ہے جس نے اردو کو اس وقت تقسیم کیا جب نثر کے عروج کا وقت آیا تھا۔

سچ تو یہ ہے کہ جملہ فنون کے ساتھ یہ ادب کے انحطاط کا دور ہے۔ اس کے اسباب پر بہت کچھ سوچا اور لکھا گیا ہے۔ میرے خیال میں آرٹ کی بہتری، علم کی طرح ارتقا کی محتاج نہیں یعنی جس طرح علم وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتا جاتا ہے، اس طرح آرٹ میں ترقی نہیں ہوتی۔ ہومر نے تین ہزار سال، والمیکی نے دو ہزار اور فردوسی نے ہزار سال قبل ایپک نظم کو معراج پر پہنچا دیا، اور ان کا کوئی ثانی نہ ہوا۔ کالی داس نے ڈیڑھ ہزار سال پہلے فطرت کے حُسن کو جو دوام بخش دیا اور حافظ نے چھ سو سال قبل عشق کو جو مقام عطا کیا، اس کا جواب کون لائے گا۔ مائیکل اینجلو جیسا بت تراش اور ریمبراں جیسا مصوّر کب پیدا ہو گا۔ مدّعا یہ کہ آرٹ منجملہ شعر و ادب وقت کی قید کے پابند نہیں اور علوم کی منطقی ترقی کے اصولوں کا اطلاق ان پر نہیں ہوتا۔ یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ علم بحرِ بے کراں ہے جس کے کنارے نیوٹن جیسا بے ہمتا سائنس داں ششدر کھڑا رہ گیا تھا اور آرٹ ایک سلسلۂ کوہ ہے جس میں چھوٹی بڑی چوٹیاں ہوتی ہیں اور پھر یہ سلسلہ گھٹتے گھٹتے زمین سے آ لگتا ہے۔

دوسرا زاویۂ نگاہ یہ ہے کہ تخلیق کی صلاحیت معدوم نہیں ہوتی۔ البتہ اس کے اظہار کے اسلوب وقت کے ساتھ کم مایہ اور بے مایہ ہو جاتے ہیں۔ کلاسیکی روایت جب آرٹ میں اپنے کمالات کی انتہا کو پہنچ گئی اور اس میں اضافے کی گنجائش نہ رہی تو اس کی جگہ اثریت اور اشاریت نے لینے کی کوشش کی، اور ایک قلیل مدّت میں جب ان کی گرہ خالی ہونے کو آئی تو دائرہ اور خط، آواز اور سرگم، لفظ و معنی کا ربط ٹوٹنے لگا۔ اب ہم ایک بے صدا، بے رنگ اور بے معنی دور میں داخل ہو گئے۔

اس انتشار کے اسباب اور بھی ہیں۔ جب خدا انسان سے اور انسان خدا سے روٹھ گیا تو شاعری اس عظمت سے ہٹ گئی جہاں رومی نے اسے پہنچایا تھا۔ جب عورت بام سے اتر کر سرِ عام ہو گئی اور مغرب نے اسے بے نقاب ہی نہیں بلکہ بے لباس کر دیا، تو وہ راز و نیاز کہاں رہا، جس نے حُسن و عشق کا جادو جگایا تھا۔ بہ ایں ہمہ جب دورِ جدید کی روح فرسا

آمریت نے لوح و قلم پر مہریں لگا دیں تو فرد کی نوائے سوختہ کون سنائے گا اور کون سنے گا۔

یہ سچ ہے کہ رات کی خاموشی کو میں نہیں سن سکتا اور نہ اُفق کے پرے ماورا کو دیکھ سکتا ہوں۔ لذّت جو حاصلِ حیات ہے، مجھ سے الفاظ میں بیان نہیں ہوتی مگر انسانی زندگی کے ان مسائل پر میری نظر ہے جن کا ذکر اوپر آیا ہے۔

میری عملی زندگی کے تیس ۳۰ سال تعلیمی مشاغل میں صرف ہوئے۔ یہ سلسلہ ۱۹۴۲ء میں ایم۔اے۔او کالج (امرتسر) کی پروفیسری سے شروع ہو کر ۱۹۷۲ء میں ختم ہوا جب میں اقوام متحدہ کے ادارہ یونسکو کی ملازمت سے ریٹائر ہوا۔ اس دوران میں مجھے برطانوی حکومتِ ہند کے معاون مشیرِ تعلیم، حکومت پاکستان کے نائب مشیرِ تعلیم اور یونسکو کے نمایندے کی حیثیت سے حکومت صومالیہ اور حکومت ایران کے مشیرِ تعلیم کے فرائض انجام دینے پڑے۔ اس دوران کئی تعمیری خدمات انجام دینے کا موقع ملا۔

زبان کا کام حیوان کو حیوانِ ناطق بنانا اور تعلیم کا کام اسے انسان بنانا ہے۔ یہ احساس کہ جہالت نہ صرف فرد بلکہ معاشرے کے لیے عذاب ہے، نیا نہیں۔ البتہ یہ احساس بالکل نیا ہے کہ حکومت کا فرض ہے کہ ہر شہری کو مناسب تعلیم حاصل کرنے پر مجبور کرے اور اس کا انتظام کرے۔ ابتدائی جبری تعلیم کا قانون لگ بھگ سو ۱۰۰ سال پہلے بعض مغربی ممالک میں نافذ ہوا۔ اس کی ضرورت صنعتی انقلاب کے تقاضوں کے تحت پیش آئی۔ اس سے پہلے تعلیم کی طرف معاشرے کی توجہ کم ہوتی تھی۔ یہ اُمرا، علما اور شرفا کے شوق کی چیز تھی، بلکہ یہ کہنا بجا ہوگا کہ عوام پر ان کے ذہنی تسلّط کا وسیلہ تھا۔ ہندو سماج کے قانون ساز منو کا حکم تھا کہ جس شودر کے کان میں وید کی آواز پہنچے اس میں سیسہ پگھلا کر ڈال دیا جائے اور یونان و روما میں غلاموں کا مقدر دائمی جہالت تھی۔

اب دنیا کا ہر ملک تعلیم کے پیدائشی حق کو تسلیم کرتا ہے اور ہر حکومت اپنی بصیرت کے مطابق اس کا انتظام کرتی ہے۔ بہ الفاظ دیگر تعلیم کس قسم کی ہوگی، اس کے فیصلے کی نوعیت بنیادی اعتبار سے سیاسی ہوتی ہے۔ تعلیم کا پیمانہ نصاب ہے اور سارے نظام کا دار و مدار اس کے تعیّن پر ہے۔ معاشرے کی ترقی کے لیے سال بہ سال کتنے فارغ التحصیل آدمیوں کی ضرورت

ہے، نیز ان سے کس کردار کی توقع کی جاتی ہے۔ ہر سطح پر کتنا علم حاصل ہو سکتا ہے اور کس درجے پر خواندگی اور بنیادی تعلیم کی حد ختم ہوتی ہے۔ نصاب بناتے وقت ایسے امور زیرِ غور آتے ہیں۔ نصاب سے زیادہ اہمیت اُستاد کی ہے۔ لیکن مدرسے کی کارکردگی، خاندان اور ماحول کے تعاون کے بغیر بے سُود رہ جاتی ہے۔ چنانچہ ترقی پذیر ممالک کا ذکر نہیں جہاں نصاب سازی کا تجربہ کم، مناسب درسی کتابوں کا فقدان اور روشن ضمیر اُستادوں کی کمیابی کا رونا ہے۔ جن ترقی یافتہ ممالک میں ان وسائل کی کمی نہیں، وہاں کے تعلیمی نظام کو بھی بحران کا سامنا ہے۔ اس کے کئی اسباب ہیں۔ ایک تو بڑھتی ہوئی آبادی میں ہر فرد کے بڑھتے ہوئے ارمان اور پھر فرد اور معاشرے میں کش مکش۔ اُستاد اور والدین کے اختیار سے طالب علم کی بے رُخی۔ تحصیلِ زر کو تحصیلِ علم کا مقصدِ اولیٰ بنانے کی روش وغیرہ۔

تعلیم کسی نہ کسی زبان کے وسیلے سے دی جاتی ہے اور اس کی افادیت ذریعۂ تعلیم کے علمی و ادبی ذخیرے کے اعتبار سے بڑھتی اور گھٹتی ہے۔ اپنی بولی سب کو پیاری ہوتی ہے۔ لیکن اسے ذریعۂ تعلیم بناتے وقت فیصلہ جذبات کو نہیں عقل و شعور کو کرنا چاہیے۔ اگر افریقہ کے نو آزاد ملک بارہ پندرہ سال کی مدّت میں ترقی کے پہلے زینے پر آ کھڑے ہوئے تو اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے اپنی پس ماندہ قبائلی بولیوں کو نہیں بلکہ انگریزی اور فرانسیسی کو اپنی مرضی سے ذریعۂ تعلیم منتخب کیا۔

میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ دنیا کو زیادہ نقصان نیم خواندگی سے پہنچتا ہے۔ اگر نظامِ تعلیم شروع سے فرد کے ذہن کو معاشرے کی خدمت کے لیے آمادہ نہ کر سکا تو فرد اسی نفس پرستی میں مبتلا رہے گا جس کا تماشا ہر طرف دیکھتے ہیں۔ اس سلسلے میں اشتراکی ممالک کے علمی تجربوں سے بہت کچھ سیکھا جا سکتا ہے۔

اردو میں عین طالب علمی کے زمانے میں میری ادبی شہرت کا آغاز جس افسانے سے ہوا (زبانِ بے زبانی۔ مطبوعہ نگار ۱۹۳۳ء) اس کی ابتدا ان الفاظ سے ہوتی ہے۔

"میں برگد کا ایک عمر رسیدہ درخت ہوں۔ نہ جانے کتنی مدّت سے تن تنہا

اور خاموش کھڑا ہوں۔ برقرار اور بے قرار، بے زبان اور نغمہ زن۔
نہ جانے کتنی مرتبہ کڑکڑاتی سردیوں میں اپنی بے برگ شاخوں سے کُہر کی
چادر کو ہٹا کر میں نے فریاد کی ہے؛ نہ معلوم کتنی مرتبہ موسمِ گل میں عطر بیز نسیم
بہار نے میرے بے حس جسم میں سنسنی ڈال دی ہے۔ لیکن کچھ دنوں سے میرے
چہرے پر جھُرّیاں پڑ گئی ہیں۔ جسمانی تاثرات سے بھی بے پروا ہو گیا ہوں۔
سردیاں اور گرمیاں میرے لیے یکساں ہیں۔"

ستم ظریفی دیکھیے کہ نوجوانی میں پیری کی کہانی لکھنے بیٹھ گیا تھا اور اب قلم سے کہہ رہا ہوں کہ بیتے ہوئے دنوں کی داستان مرقوم کر۔ معلوم نہیں، میرا یہ روٹھا ہوا دوست کس حد تک میرا ساتھ دیتا ہے۔ وہ اٹکتا ہے تو میں دلاسا دیتا ہوں کہ میرے حافظے کا ساتھ دے۔ البتہ خود فیصلہ کر کہ کیا گفتنی اور کیا ناگفتنی ہے ؎

یادِ ماضی کے ابھی نقش بہت باقی ہیں
حافظہ دل کی طرح زود فراموش نہیں

—— ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری

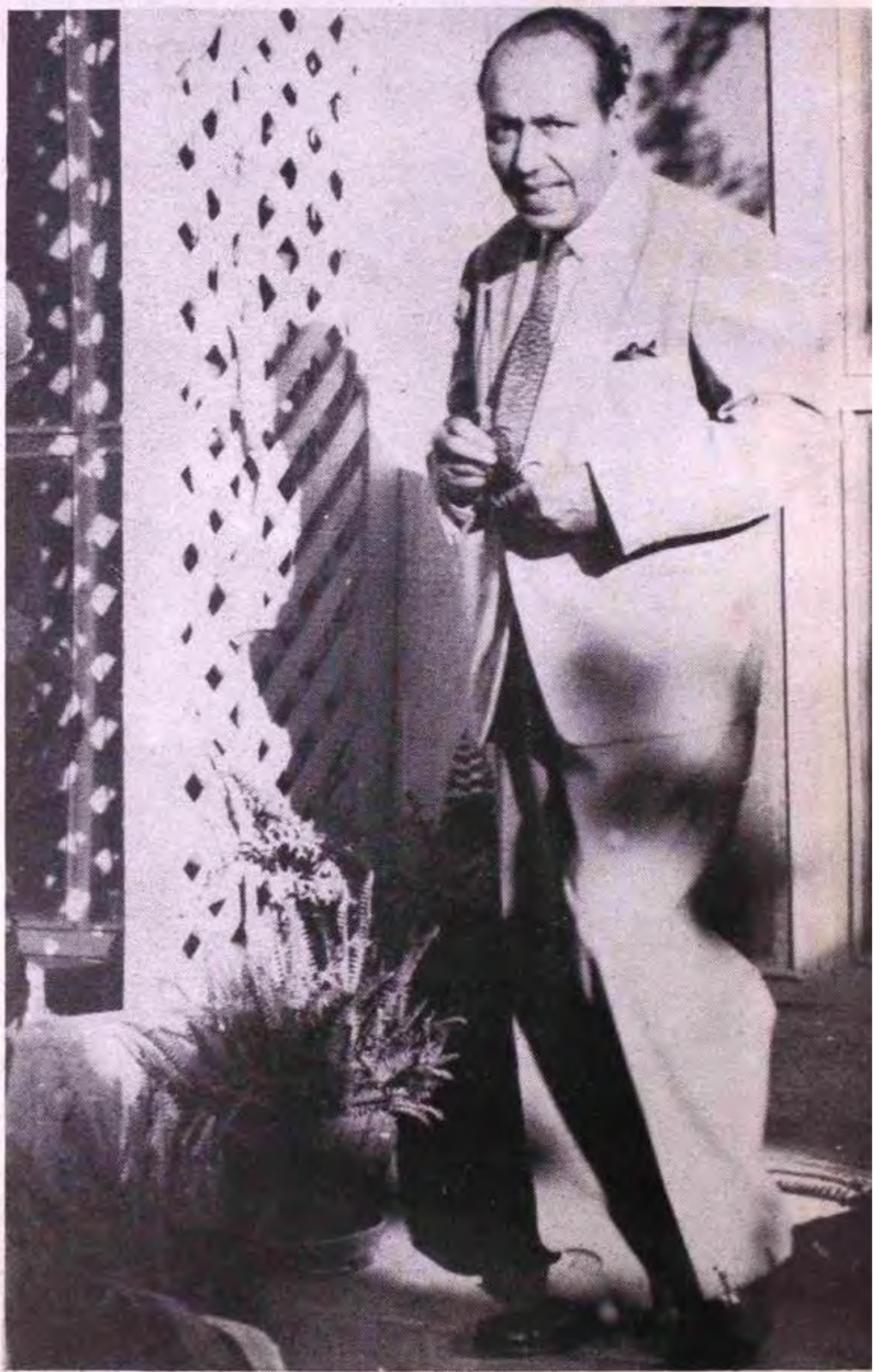

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری (فوٹو: ۱۹۶۲ء)

دوران طالب علمی کلکتے میں (فوٹو: ۱۹۳۰ء)

کلکتے میں بنگالی ہم جماعتوں کے ساتھ (فوٹو: ۱۹۳۴ء)

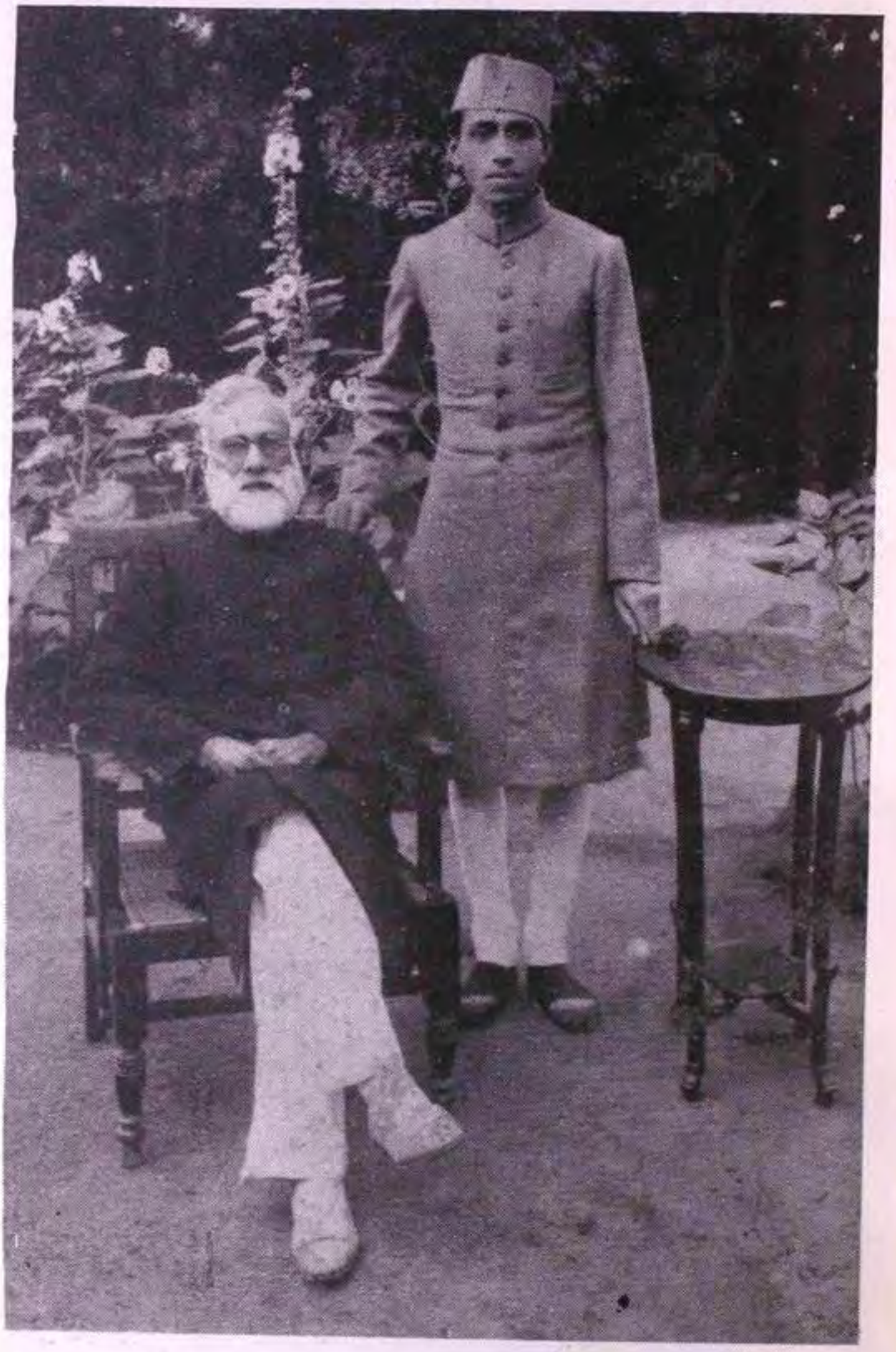

اختر حسین رائے پوری اور مولوی عبدالحق حیدرآباد دکن میں (فوٹو: ۱۹۳۶ء)

(درمیان میں) اختر حسین اپنی نانی کی گود میں بہ عمر تین سال۔ دائیں جانب والدہ اور بائیں جانب ماموں حبیب الدین احمد بیٹھے ہیں۔

(فوٹو: ۱۹۱۳ء)

ڈاکٹر اختر حسین اپنی اہلیہ حمیدہ بیگم اور نسرین زندوں کے ساتھ کراچی میں (فروری ۱۹۵۹ء)

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، ماہنامہ ساقی دہلی کے چند خاص قلمی معاونین کے ساتھ

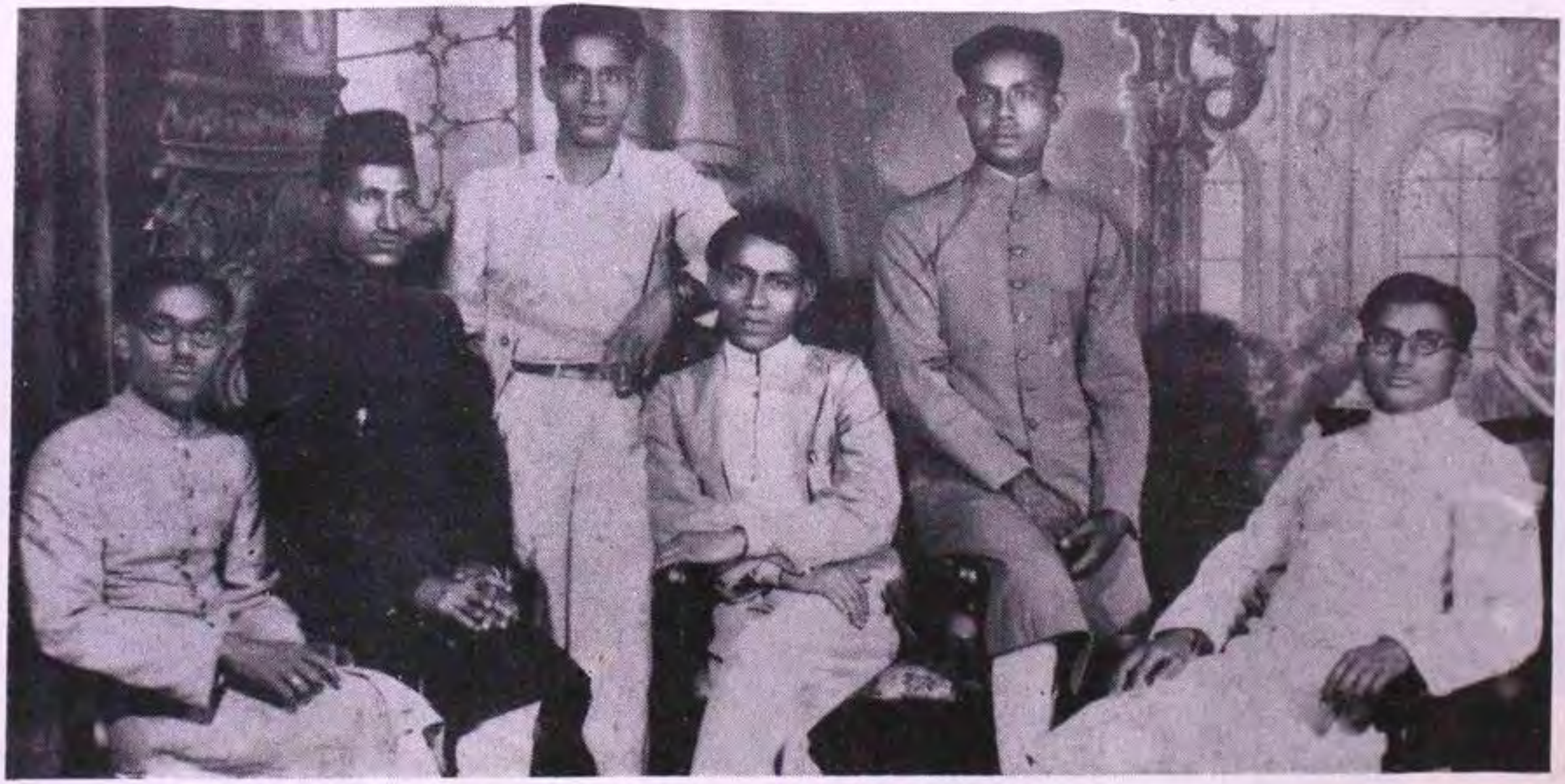

(دائیں سے) ممتاز حسین۔ انصار ناصری۔ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری۔ محمود مورخ۔ فضل حق قریشی اور شاہد احمد دہلوی (فوٹو: ۱۹۳۶ء)

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری بہ حیثیت صدر اسٹوڈنٹس یونین ایم۔ اے۔ او کالج امرتسر میں اراکین کے ساتھ (فروری ۱۹۴۴ء)

کراچی میں ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری اپنی اہلیہ
حمیدہ بیگم کے ساتھ (فوٹو: ۱۹۶۰ء)

مشہور ترک خاتون خالدہ ادیب خانم پیرس میں
جن کا ذکر "گردِ راہ" میں شامل ہے
(فوٹو: ۱۹۳۹ء)

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری مشہور فرانسیسی
مصنف ولی اراگاں کے ساتھ
(فوٹو: ۱۹۴۸ء)

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، حکومت پاکستان کے نمائندے کی حیثیت سے جنیوا کی بین الاقوامی تعلیمی کانفرنس کے مندوبین کے ساتھ (فوٹو: ۱۹۵۴ء)

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری چیئرمین سکریٹری ایڈوائزری بورڈ محکمۂ تعلیم حکومت پاکستان درمیان میں وزیر تعلیم و صحت فضل الرحمٰن بیٹھے ہیں۔ (فوٹو: ۱۹۵۹ء)

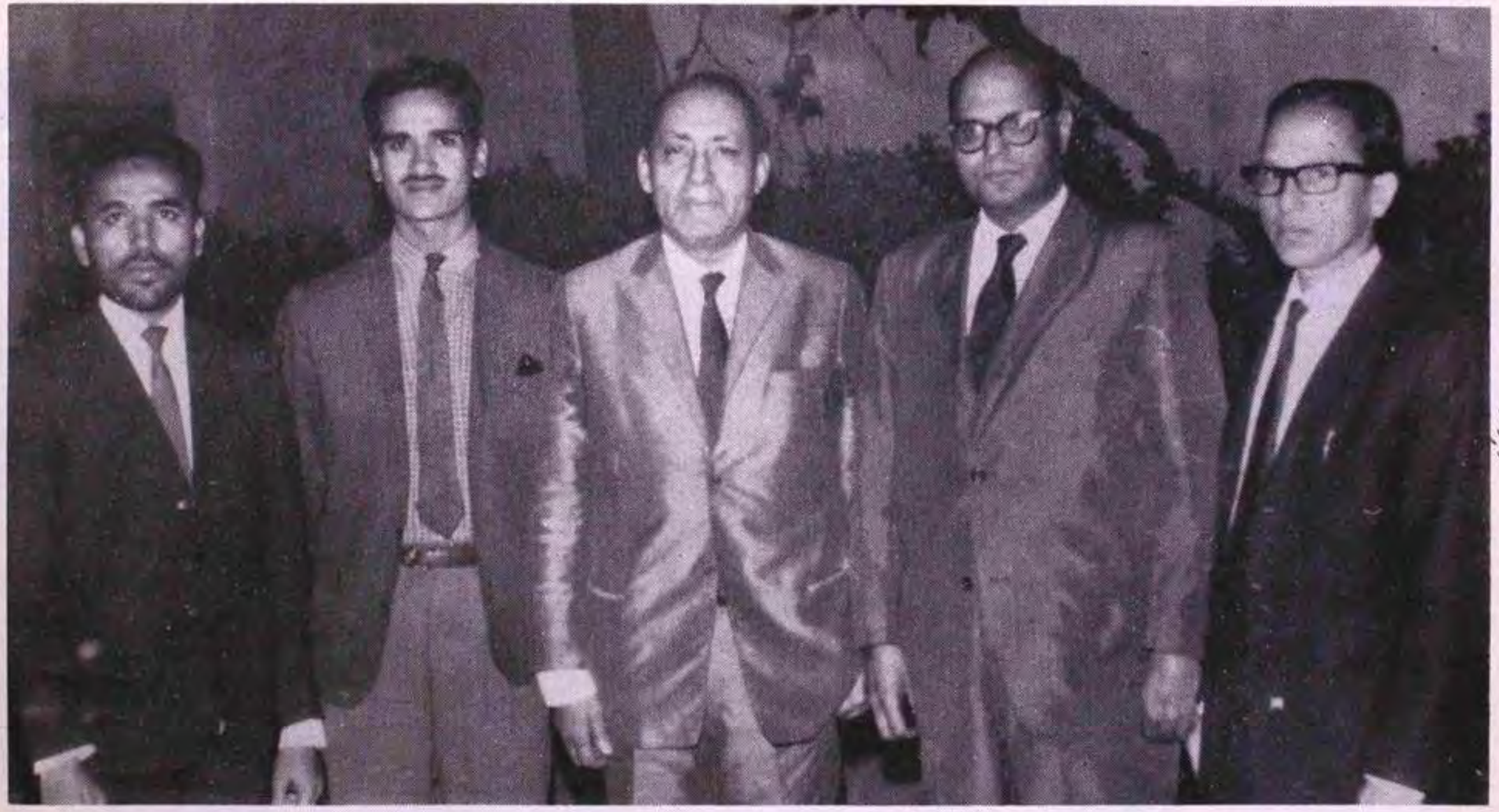

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری تہران میں (دائیں سے) ڈاکٹر کلیم سہسرامی، ن۔م۔ راشد اور فارسی کے دو اسکالروں کے ساتھ (فوٹو: ۱۹۶۷ء)

اصفہان کی ایک تقریب میں، ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، ملکہ فرح پہلوی، ایران کے وزیر تعلیم اور دیگر مہمانوں کے ساتھ (نومبر ۱۹۶۹ء)

سون مرگ۔ کشمیر میں۔ کوہ پیمائی کرتے ہوئے

(فوٹو: ۱۹۴۴ء)

یونیسکو سمینار منعقدہ مدراس کے موقع پر ایک

مشہور مندر کی سیڑھیوں پر سمینار کے شرکاء

کے ساتھ (فوٹو: ۱۹۵۹ء)

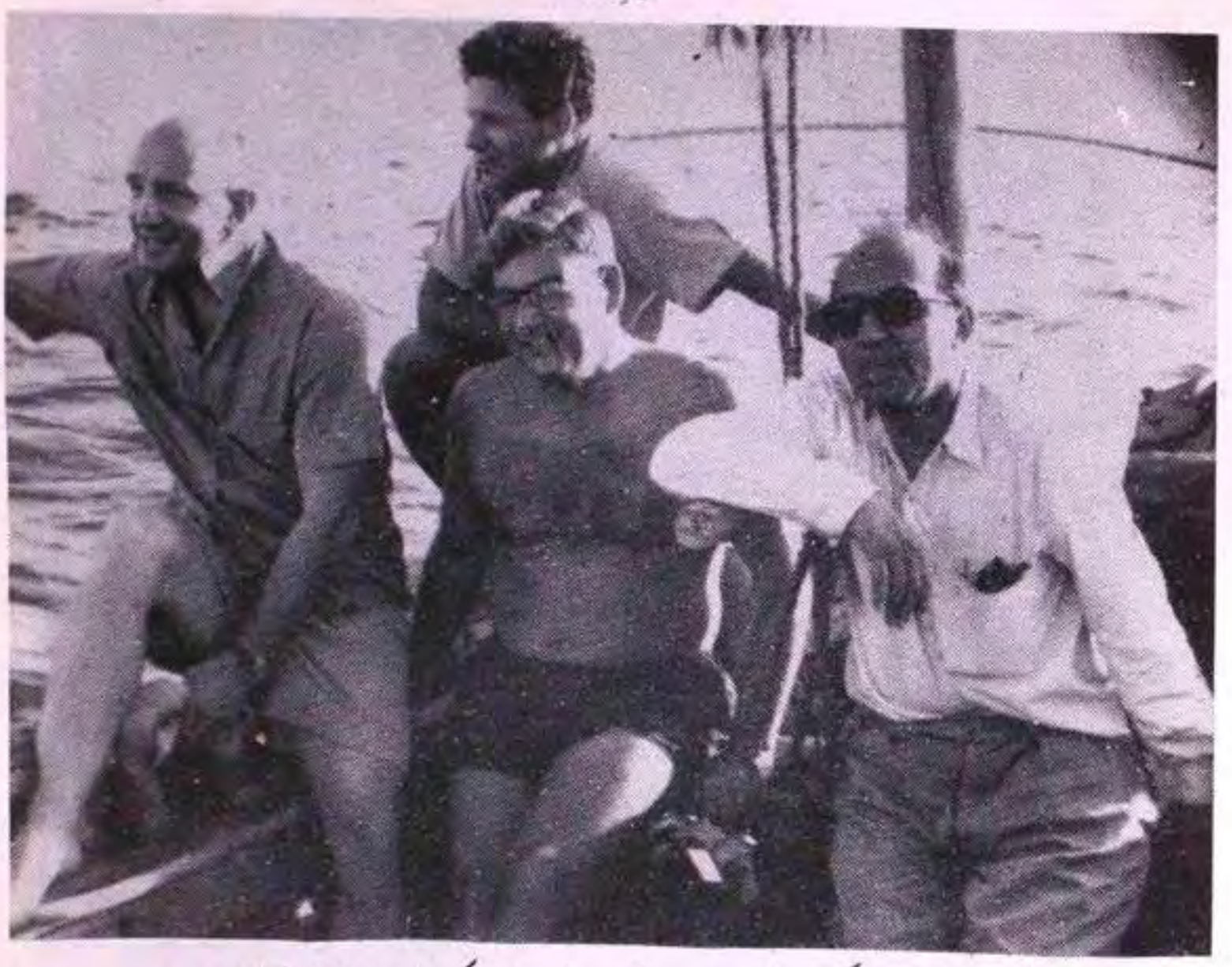

سومالیہ میں سمندر کی سیر کرتے ہوئے چند دوستوں کے ساتھ (فوٹو: ۱۹۶۶ء)

کینیا میں دو افریقی مسائی قبائلیوں کے ساتھ (فوٹو: ۱۹۶۶ء)

کراچی کی ایک تقریب میں (دائیں سے) ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری،
ابن انشا، شریف الحسن اور حکیم محمد سعید (فوٹو: ۱۹۷۳ء)

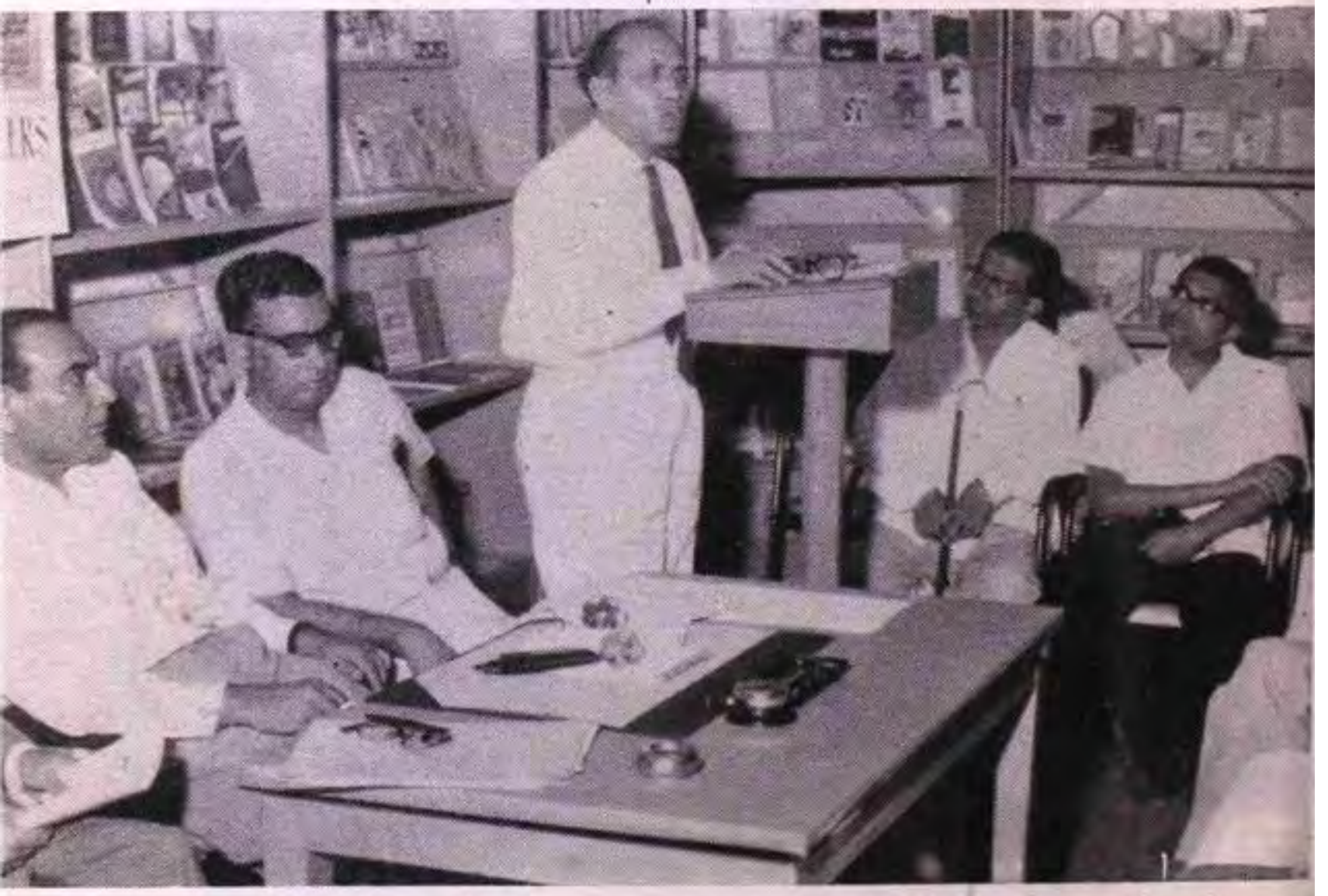

نیشنل بک کاؤنسل کی ایک تقریب میں ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کتابوں کے مسائل پر اظہار خیال کر رہے ہیں۔ دائیں طرف ابن انشا اور سراج الدین ظفر دیگر ممبروں کے ساتھ (فوٹو: ۱۹۶۴ء)

مختار زمن کی نئی کتاب "دیگر احوال یہ کہ" کی تقریب اجراء کے موقع پر (دائیں سے) ابوالفضل صدیقی۔ مجنوں گورکھپوری۔ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری۔ ڈاکٹر وحید قریشی۔ مختار زمن اور صہبا لکھنوی

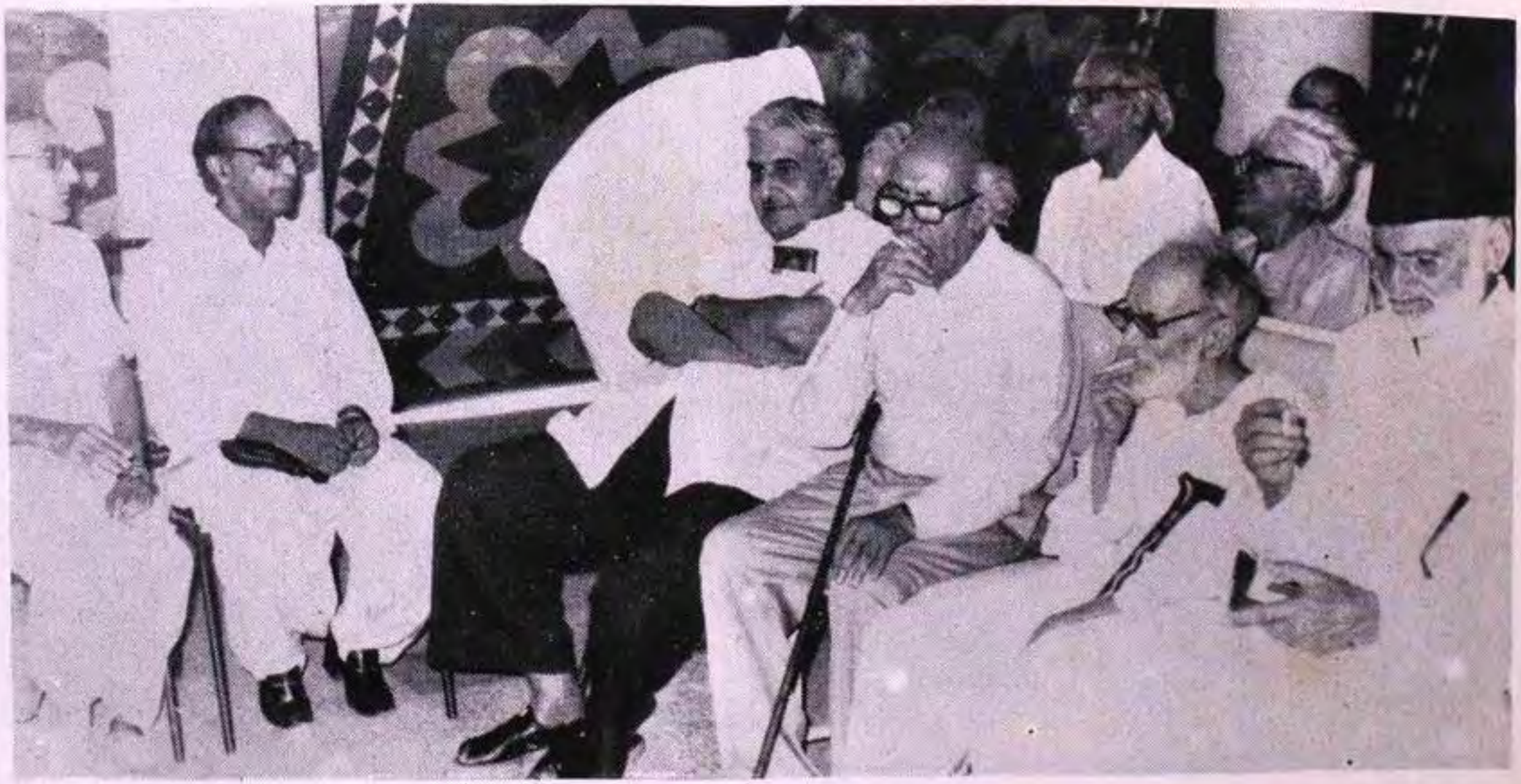

غنیمت ہے جو ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں

(فوٹو: ۱۹۸۳ء)

زندگی کے ابتدائی سال

۱

جب میں نے اپنے حافظے کے جادو گھر میں جھانکا تو مجھے زندگی کے اوّلین سال کچھ خنداں، کچھ گریاں اور کچھ حیران نظر آئے۔

میں ۱۲ر جون ۱۹۱۲ء کو رائے پور (صوبۂ متوسّط ہند) میں پیدا ہوا۔ اب تو اس شہر کی آبادی دو تین لاکھ تک پہنچ گئی ہے اور "بھلائی اسٹیل مل" کی قربت کی وجہ سے نہ صرف یہ صنعت و تجارت کا مرکز بن گیا بلکہ یہاں یونیورسٹی بھی قایم ہو گئی ہے۔ لیکن میرے بچپن میں یہ کیفیت نہ تھی۔ اس وقت آبادی زیادہ سے زیادہ چالیس ہزار تھی اور صنعت تو کجا شہر میں بجلی کا نام تک نہ تھا۔ مشکل سے پانچ دس موٹریں اور اتنے ہی ٹیلیفون ہوں گے۔ دو ہائی اسکول تھے جن میں ذریعۂ تعلیم انگریزی زبان تھی۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس زمانے میں ریڈیو اور ٹیلی ویژن کا نام بھی کسی نے نہ سنا تھا۔ آبادی کا بڑا حصّہ ہندوؤں پر مشتمل تھا جو ذات پات کے اعتبار سے الگ الگ محلّوں میں رہتے تھے۔ مسلمان آٹھ دس ہزار ہوں گے جو بیشتر شمالی ہند اور میسور یا مدراس سے ملازمت یا کاروبار کی تلاش میں یہاں آکر بس گئے تھے۔ یہ نسبتاً زیادہ خوش حال اور تعلیم یافتہ تھے

اور ان میں زمیندار بھی تھے۔ مسلمانوں کے طویل عہدِ حکومت کا رعب اب تک اس طرح باقی تھا کہ جب کوئی با اثر مسلمان بازار میں آنکلتا تو دُکان دار اس کی تعظیم کے لیے کھڑے ہو جاتے اور اسے جُھک جُھک سلام کرتے۔ گو دونوں فرقوں میں رواداری کا تعلّق تھا لیکن ان کی بود و باش میں بڑا فرق تھا اور چھوت چھات کی وجہ سے میل جول بھی برائے نام تھا۔ البتہ ایک دوسرے کے تہواروں میں وہ ذوق شوق سے حصّہ لیتے تھے۔ دیوالی میں کئی مسلمان گھروں میں چراغ جلتے تھے اور محرّم میں ہندو تعزیہ داری کی رسم نبھاتے تھے۔

میرے والد سیّد اکبر حسین کا تعلق پٹنہ کے ایک پُرانے خاندان سے تھا۔ وہ علی گڈھ کالج اور ٹامسن انجینئرنگ کالج کے فارغ التحصیل تھے۔ جب رائے پور کے پاس مہاندی میں نہر سازی شروع ہوئی تو وہ محکمۂ آبپاشی کے ایک اچھّے عہدے پر یہاں فائز ہوئے۔ پھر یہیں شادی کرلی۔ میری والدہ ممتاز النساء اس زمانے کے لحاظ سے اعلیٰ تعلیم یافتہ تھیں۔ پردے کی سختی کے باوجود انھیں انگریزی، اردو اور ہندی پر کامل عبور تھا اور ان کے مضامین تہذیبِ نسواں اور زیب النساء نامی رسالوں میں شائع ہوا کرتے تھے۔ افسوس کہ صرف ۲۶ سال کی عمر میں ان کا انتقال ہو گیا۔ اس وقت میری عمر محض تین سال تھی اور میرے بڑے بھائی مظفر حسین شمیم مجھ سے تین سال بڑے تھے۔ والدہ کی طرف سے ہم دونوں بھائیوں کو وراثت میں دو گاؤں اور شہر میں خاصی جائداد ملی جس کی آمدنی ہماری کفالت کے لیے کافی تھی۔ والد کی غیر حاضری سے فائدہ اٹھا کر رشتے داروں کی روایتی چیرہ دستی نے ہماری جائداد کو نقصان پہنچایا، تاہم وہ پوری نہیں تو آدھی رائے پور میں ہمارے دوران قیام تک باقی رہی۔

ہماری پرورش کی ذمّے داری وفادار آیا پیرن بی نے قبول کی جسے عرفِ عام میں بڑی بی[1] کہتے تھے۔ باہر کا کام ایک پرانے ملازم کے سپرد تھا جو بہشتی میاں کے لقب سے

---

[1] اس کا ذکر میرے افسانوں کے مجموعے "محبت اور نفرت" میں بچپن کے عنوان کے تحت آیا ہے۔

مشہور تھا۔ جب ننھیال کے رشتے داروں نے ہماری جائداد پر دست درازی کی تو والد نے ان سے تعلق ختم کر لیا اور ہم دونوں بھائیوں کو بھی ان سے دور رہنے کی تاکید کی۔ انجام کار اوائلِ زندگی میں ہم اس ماحول سے ناآشنا رہے جو خاندان سے منسوب ہوتا ہے۔ اس طرح ہم نے زندگی کو گھر کے اندر نہیں بلکہ گھر کے باہر پہچانا۔

میرا شعور چار سال کی عمر میں بیدار ہوا جب والد طویل رخصت پر پٹنہ گئے اور ہم دونوں بھائیوں کو ساتھ لے گئے۔ ہمارا آبائی مکان پٹنہ کے باہر بیگم پور اسٹیشن کے پاس تھا۔ یہ پرانی وضع کا دو منزلہ مکان ٹیلے پر بنا ہوا تھا اور اس کے بازو سے ایک ندی بہتی ہوئی دریائے گنگا سے جا ملتی تھی جو چند میل کے فاصلے پر ٹھاٹھیں مارتا تھا۔ ندی کی دوسری طرف آم کے باغوں کا سلسلہ دراز تھا جن میں کچھ ہمارے بھی تھے اور مکان کے سامنے دھان کے کھیت جن میں جگہ جگہ تاڑ کے پیڑ کھڑے ہوئے تھے۔ مکان میں ہماری دادی، ملازمہ کے ساتھ رہتی تھیں اور پورن نامی نوکر زمین و باغ کی دیکھ بھال پر مامور تھا۔ پچھواڑے ایک کشتی بندھی رہتی تھی اور ہم دادی کی آنکھ بچا کر دن میں ایک دو بار پورن کے ساتھ اس پر ندی کی سیر کے لیے ضرور نکل جاتے تھے۔ غرض یہ فضا بڑی دلکش تھی۔ اتنے میں برسات کا موسم اس طرح آیا کہ جل تھل ایک ہو گیا۔ لوگوں نے کہنا شروع کیا کہ گنگا میں سیلاب آنے والا ہے اور پاس پڑوس میں تیزی سے رسد اور ایندھن وغیرہ کی تلاش ہونے لگی۔ رات کو اوپر کے کمرے میں سوتے سوتے اندھیرے میں مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی مہیب جانور رینگتا ہوا میری طرف آ رہا ہے۔ صبح آنکھ کھول کر دریچے سے باہر جھانکا تو گنگا کا پانی ہر طرف پھیلا ہوا تھا۔ گویا ایک ناپیدا کنار ردائے آب نے زمین کو ڈھک لیا ہو، کیونکہ ہمارا مکان اونچائی پر تھا، پانی اس میں داخل نہ ہو سکا، البتہ کئی گھروں میں پانی در آتا ہوا گھس آیا۔ لگ بھگ دو مہینے زندگی کا طور یہ ہو گیا کہ ہر گھر کی شکل جزیرے کی سی ہو گئی اور آمد و رفت کے لیے سب نے اپنی اپنی کشتی کا سہارا لیا۔ حتیٰ کہ دکان داروں نے کشتیوں پر سامان سجایا اور دَر دَر جا کر اپنی اپنی بولی بولنے لگے۔ بچوں کے لیے اس سے زیادہ دلچسپ تماشا کیا ہو سکتا تھا، لیکن میرا دل دیوان خانے میں زیادہ لگتا تھا جہاں والد اپنے دوستوں کے ساتھ دن بھر یا تو

شطرنج کے کھیل میں مصروف ہوتے یا اوّل جنگِ عظیم کے واقعات پر بحث کرتے رہتے جو اس وقت (۱۹۱۷-۱۹۱۶ء) جاری تھی۔ صدرو نامی شاگرد پیشہ کبھی سیخوں پر کباب چڑھاتا، کبھی کٹھل کے بیج بھونتا اور کبھی سماوار سے پیالیوں میں چائے اُنڈیل کر اہلِ محفل کی نذر کرتا۔

تقریباً سال بھر بعد جب رائے پور واپسی ہوئی تو والد کو میری تعلیم کا خیال آیا۔ پرانی روایت کے مطابق مجھے پہلے مکتب میں داخل کیا گیا جس کے ناظم مولوی محمد یاسین تھے۔ جب بغدادی قاعدہ ذہن نشین ہو گیا تو قرآن مجید کا درس شروع ہوا۔ چند روز بعد میں نے مولوی صاحب سے کہا کہ عربی عبارت کے معنی بیان کرتے چلیں کیونکہ میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ اس پر مولوی یاسین کو طیش آ گیا اور کہنے لگے کہ خدا کا کلام بڑے بڑوں کی سمجھ میں نہیں آتا، تیری سمجھ میں کیا خاک آئے گا۔ اس جواب سے میری تشفّی نہ ہوئی۔ جب تک دماغ قائل نہ ہو جائے کسی دعوے کو قبول نہیں کرتا۔ یہ میری افتادِ طبع ہے۔ چنانچہ میں نے مکتب جانے سے انکار کر دیا اور شہر میں اس واقعے کا خوب چرچا ہوا۔ لوگوں نے کہا کہ اکبر حسین علی گڈھ میں پڑھ کر سرسیّد احمد کی پیروی میں نیچری خیال کے پیرو بن گئے ہیں اور ان کا لڑکا ابھی سے ان کے نقشِ قدم پر چل رہا ہے۔ میرے والد نے ان اعتراضوں کو یہ کہہ کر ٹال دیا کہ لڑکا جب بڑا ہو گا تو مذہب کی معلومات خود حاصل کرے گا اور ہُوا بھی یہی۔ اس واقعے کا اُن پر ایسا شدید اثر ہوا کہ اُردو نہیں بلکہ ہندی کے پرائمری اسکول میں داخل کر دیا۔ وجہ یہ بتلائی کہ جب ہندو اردو، فارسی پڑھنے سے دریغ نہیں کرتے تو مسلمانوں کو ہندی یا سنسکرت پڑھنے میں جھجک کیوں ہوتی ہے۔ اس فیصلے کے بعد اردو اور فارسی کی استعداد کسی درس گاہ میں نہیں بلکہ گھر میں اپنے بڑے بھائی کی توجہ سے حاصل کی۔

اس زمانے کا تعلیمی نظام اتنا پختہ تھا کہ تب کا پڑھا لکھا آج تک خوب یاد ہے۔ پرائمری اسکول پانچ درجوں پر مشتمل تھا اور پانچویں کلاس میں انگریزی کی ابتدا ہو جاتی تھی کیونکہ ہائی اسکول کی چھ کلاسوں میں جملہ تعلیم اسی زبان میں ہوتی تھی۔ جیسے ہی میں ہندی میں رواں ہوا، مطالعے کا شوق جنون کی طرح مجھ پر سوار ہوا اور میں کتابوں کی تلاش میں سرگرداں رہنے لگا۔ والد سرکاری دورے پر اکثر باہر رہتے تھے لہٰذا میں ان کے خالی کمرے پر قابض ہوا

اور ان کی الماری کی کتابوں کو الٹنے لگا۔ زیادہ تر اردو میں تھیں اور اس وقت میری دسترس سے باہر۔ گو ابھی میں انگریزی پڑھنے سے بھی قاصر تھا البتہ انگریزی کی موٹی موٹی کتابوں میں میرے لیے کچھ کشش تھی۔ اس وقت انھیں پڑھ تو نہ سکتا تھا لیکن ان کی تصویریں دیدہ زیب تھیں۔ خصوصاً اٹلس کے رنگ برنگے نقشے مجھے پسند تھے اور میں گھنٹوں ان کی ورق گردانی کرتے ہوئے طفلانہ تخیّل میں دنیا کی سیر کرتا تھا۔ اس وقت مجھے گمان بھی نہ ہو سکتا تھا کہ آگے چل کر زندگی کا بڑا حصّہ سیاحت میں گذرے گا۔ انگریزی ڈکشنری کی ناقابل فہم عبارت بھی جاذب توجہ تھی کیونکہ اس میں جابجا تصویریں چھپی ہوئی تھیں۔ جیب خرچ کے لیے جو کچھ ملتا ہندی کتابوں کی واحد دکان پر صرف ہو جاتا۔ اس کا مالک ایک لوہار تھا، جس نے معلوم نہیں کیوں مختلف اوزاروں کے ساتھ کتابوں کا انبار لگا رکھا تھا۔ یہ سب سستے کاغذ پر چھپی ہوئی قصّے کہانیوں، غزلوں، گیتوں، ناٹک اور نوٹنکیوں پر مشتمل تھیں۔ زیادہ نہیں دو تین سال کی مدّت میں اس سارے مواد کو میرا دماغ چاٹ گیا اور لوہار نے حیرت سے شاباش دیتے ہوئے کہا کہ تمھارے لیے اب میرے پاس کچھ نہیں رہا۔ تمھارے مطالعے کا شوق شہر میں صرف پرانی بستی کے مندر کی لائبریری میں پورا ہو سکتا ہے۔ شام کے وقت مندر کا پجاری ہر روز اسے کھولتا ہے، اس معاملے میں وہی تمھاری مدد کر سکتا ہے۔ لوہار کے مشورے پر فوراً عمل کیا۔ شوق کا یہ عالم تھا کہ تن تنہا شام کے اندھیرے میں اس مندر کی طرف چل پڑا۔ شہر کے آخری سرے پر ایک تالاب کے کنارے اور اس سنسان جھاڑی کے قریب جہاں ایک ٹوٹے ہوئے قلعے کے آثار پوشیدہ تھے، یہ مندر چراغوں کی روشنی میں جھلملا رہا تھا اور اس کے اندر دیویوں کی مورتیں پھولوں کے ہار پہنے اپنی پتھرائی آنکھوں سے مجھے گھور رہی تھیں۔ پھر بھی میں ہمّت باندھ کر احاطے کی اس عمارت میں داخل ہو گیا جس پر لائبریری کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ میں نے کتابوں کا اتنا بڑا ذخیرہ کبھی نہ دیکھا تھا جو کئی الماریوں میں سلیقے سے سجی ہوئی مجھے قریب آنے کا اشارہ کر رہی تھیں۔ پجاری کو میں ایک نظر میں پہچان گیا کیونکہ وہ ماتھے پر تلک لگائے کرسی پر بیٹھا بڑے سے رجسٹر میں کچھ لکھ رہا تھا۔ جب میں اس کے پاس جا کر کھڑا ہوا تو اس نے سوالیہ انداز میں مجھے دیکھا۔

میرے مطالعے کے شوق کی اُس نے یہ کہہ کر ہمّت افزائی کی کہ آج تک اتنا کم عمر بچّہ یہاں نہ آیا تھا اور پھر جب اس نے میرے مرحوم نانا کا نام سنا جو اپنے زمانے کے مشہور وکیل تھے تو بولا "یہ شوق اسے وراثت میں ملا ہے"۔ غرض پجاری نے مجھے لائبریری سے بیک وقت ایک کتاب گھر لے جانے کی اجازت دے دی اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں مالا مال ہو گیا۔ اسکول کے بعد میں ہم جولیوں کے ساتھ بہت کم کھیلتا یا تو انھیں اپنے مطالعے کا حاصل کنویں کی جگت پر بیٹھ کر ایسے دل نشین طریقے سے سناتا کہ وہ دم بخود رہ جاتے، تا آنکہ ان کے بڑھے بوڑھے تلاش میں نہ نکل آتے اور میں پھر نئی کتاب کی فکر میں تیز قدم اسی لائبریری کی طرف چل پڑتا۔ ظاہر ہے کہ عموماً ان کتابوں کا تعلّق جاسوسی، عیّاری، طلسم وغیرہ سے ہوتا تھا لیکن کچھ کا تعلّق تاریخ سے بھی تھا اور ایسی ہی کتابیں مجھے بطورِ خاص مرغوب بھی تھیں۔ اُنھیں دنوں نپولین بوناپارٹ کی سوانح عمری پڑھنے میں آئی اور اس کے عزم اور حوصلے کا اثر ایسا ہوا کہ میں اسے بارہا دہراتا گیا اور پھر بھی دل نہ بھرا۔ سچ تو یہ ہے کہ اس وقت تک ہندی زبان کے ادب کا دائرہ محدود تھا اور سنجیدہ ذوق کے لیے اس میں مواد کم تھا۔

اتنے میں ایک ایسا واقعہ ہوا جس نے میرے مطالعے کی راہ موڑ دی۔ میری عمر بارہ سال ہو گی جب میں ہائی اسکول کی ساتویں جماعت میں تھا۔ اسکول میں ایک اچھّی خاصی لائبریری تھی جس میں انگریزی اور ہندی کے علاوہ اردو کتابیں بھی موجود تھیں۔ جن طلبہ کو کتب بینی کا شوق ہوتا وہ باری باری فرصت کے وقت اس کے انتظام میں استاد کا ہاتھ بٹاتے۔ جب میری باری آئی تو اتفاق سے اردو کتابوں کا پارسل موصول ہوا اور استاد نے جو ایک ہندو بنگالی تھا، یہ سوچ کر کہ میں انھیں پڑھ سکوں گا، ارشاد کیا کہ ان کے نام اردو کتابوں کے رجسٹر میں درج کر دو۔ یہ سُن کر میں سہم گیا، کیونکہ بغدادی قاعدہ چھوڑنے کے بعد میں اردو سے یکسر بے خبر ہو گیا تھا۔ پارسل سے پندرہ یا بیس کتابیں نکلیں جن کی طباعت و کتابت خوب روشن تھی۔ اور ہر ورق پر نظر جمائی تو بلا دقّت میں ان کے عنوان پڑھ گیا۔ جو خوشی ہوئی وہ الفاظ میں بیان نہیں ہو سکتی۔ رجسٹر پر نام چڑھا کر انھیں میں

گھر لے آیا اور بستہ فرش پر پھینک کر انھیں پڑھنے بیٹھ گیا۔ ان کی عبارت اتنی صاف تھی کہ بلا دقّت میں انھیں پڑھتا چلا گیا اور سرخوشی کا یہ عالم تھا جیسے کوئی مہم جیت لی ہو۔ میرے بھائی بھی حیران ہوئے اور کہنے لگے کہ اردو تمہیں آتی ہے اور اب اس کی طرف توجہ دو۔ وقت کے ساتھ اردو سے میرا شوق بڑھتا گیا کیونکہ اس کے ادب کا دائرہ ہندی سے زیادہ وسیع تھا۔ میٹرک تک پہنچتے پہنچتے ہندی پر میری گرفت اتنی مضبوط ہوگئی تھی کہ رسائل میں میرے مضمون شائع ہونے لگے۔ ۱۹۲۸ء میں میرا پہلا افسانہ جس کا تعلق سراج الدولہ سے تھا اور جو "پراجت" (شکست خوردہ) کے عنوان سے لکھنؤ کے معروف ہندی رسالہ "مادھوری" میں شائع ہوا۔ منشی نول کشور کے انتقال کے بعد ان کے ایک جانشین نے یہ رسالہ شائع کیا تھا اور اسی نے پہلی مرتبہ پریم چند سے ہندی کا تعارف کروایا۔ اب اردو پر بھی اتنا عبور ہو چکا تھا کہ سالانہ امتحان میں اپنے ہم نشین طلبہ کو اردو کا پرچہ حل کرانے کے الزام میں پکڑا گیا مگر صفائی سے چھوٹ گیا، کیونکہ میں خود ہندی اور سنسکرت کا طالب علم تھا۔ ہمارے ہائی اسکول میں انگریزی کا معیار بلند تھا۔ ہیڈ ماسٹر ایک اینگلو انڈین مسٹر ٹمبے کیمبرج کے فارغ التحصیل تھے۔ اسکول کی تعلیم گیارھویں درجے پر ختم ہوتی تھی اور آخری تین جماعتوں میں انگریزی کا درس ان کی نگرانی میں ہوتا تھا۔ شکسپیئر کے دو ڈرامے نصاب میں شامل تھے جن میں سے ایک کو بعد ازاں کلکتہ کے کالج کے نصاب میں شامل پایا۔ اب درس میں قومی اور کلاسیکی زبانوں کی حیثیت ثانوی رہ گئی اور زیادہ توجہ انگریزی پر مرکوز ہوگئی۔ اس طرح میں انگریزی کی طرف مائل ہوا اور جیسے جیسے انکشاف ہوتا گیا کہ نہ صرف اس کا اپنا ادب بے پایاں ہے بلکہ یہ زبان اپنے دامن میں تمام دنیائے علم و ادب کو سمیٹے ہوئے ہے، میں اس کا گرویدہ ہوتا گیا۔ غرض یہ کہ ۱۹۲۸ء میں بہ عمر سولہ سال جب میں میٹرک کے امتحان سے امتیاز کے ساتھ فارغ ہوا تو انگریزی، ہندی اور اردو پر مجھے خاصا عبور حاصل ہو چکا تھا۔

جب اوّل جنگ عظیم ختم ہوئی اور ۱۹۱۹ء میں صلح کا اعلان ہوا تو سارے ہندوستان میں برطانیہ کی فتح کا جشن منایا گیا۔ سرکار کے وفاداروں پر انعام و اکرام کی بارش ہوئی۔

جیل سے قیدی رہا ہوئے اور شہر شہر چراغاں ہوا۔ ہر اسکول کے بچے قطار باندھے میدان میں جمع ہوئے اور ان میں مٹھائی تقسیم کی گئی۔ ایک ہوائی جہاز شہر پر گردش کرنے لگا اور کیونکہ پہلے کسی نے یہ تماشا نہ دیکھا تھا، زن و مرد سب گھر سے نکل کر آسمان کو تاکنے لگے۔ بڑھے بوڑھوں نے کہا "یہ وہی اُڑن کھٹولا ہے جس کا ذکر داستانوں میں آیا ہے۔ وہ یہ باور کرنے کے لیے تیار نہ تھے کہ کوئی چیز نئی ہے یا اس زمانے کی ایجاد ہے بلکہ ان کا اصرار تھا کہ زمانۂ قدیم آج سے زیادہ ترقی یافتہ اور مہذّب تھا اور جملہ علوم سے آگاہ ہو چکا تھا۔ شہر کے انگریز ڈپٹی کمشنر کے چوکیدار کو یہ یقین نہ تھا کہ صاحب کے کمرے میں نصب ٹیلیفون محض ایک آلۂ سماعت ہے جس میں بذریعہ تار دوسری جگہ سے آواز آتی ہے، بلکہ اس کا اصرار تھا کہ صاحب نشے کے عالم میں کمرے میں بیٹھا خود اپنے سے باتیں کیا کرتا ہے۔

ذہنی پسماندگی کی اس تاریکی میں کسی کو گمان بھی نہ ہو سکتا تھا کہ سیاسی بیداری کی لہر اس تیزی سے اٹھے گی کہ برطانوی حکومت کی بنیاد ہل جائے گی لیکن ایک طرف گاندھی جی کی قیادت میں کانگریس نے آزادی کے حصول کے لیے ترکِ موالات کی تحریک شروع کی اور دوسری طرف علی برادران کی سرکردگی میں مسلمان خلافت کے تحفّظ کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ دیکھتے دیکھتے یہ دونوں تحریکیں گھل مل گئیں اور کچھ وقت کے لیے ہندو اور مسلمان اس طرح متحد ہو گئے جس کی نظیر پھر دیکھنے میں نہ آئی۔ ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک جدھر دیکھو لوگ جھنڈے اٹھائے جلسے جلوس کی طرف چل پڑے۔ اخباروں، رسالوں پمفلٹوں اور پوسٹروں کا ایک طومار قومیت کے راگ الاپنے لگا اور تقریر بازوں اور تُک بندوں نے وہ قیامت برپا کی کہ انگریز کے اوسان خطا ہو گئے۔ بائیکاٹ نامی ایک نیا لفظ لغت میں داخل ہو گیا۔ بدیسی مال کے ساتھ دفتروں اور تعلیم گاہوں کا بائیکاٹ بھی عام ہو گیا۔ ایسا ہنگامہ برپا ہوا کہ ہمارا خوابیدہ شہر بھی چونک پڑا۔ قومی خدمت گار قسم کے لوگ ریلوے اسٹیشن کا طواف کرنے لگے تاکہ آتی جاتی ٹرین میں کسی لیڈر کے درشن ہو جائیں۔ عورتوں نے پرانے چرخوں کی صفائی کی اور گاندھی جی کے ارشاد کی تعمیل میں ان پر سُوت کاتنے لگیں۔ راہ گیر چھڑی کی بجائے تکلی ہاتھوں میں لیے پھرنے لگے اور محفلوں میں غزلوں

کی بجائے قومی ترانوں کی صدا گونجنے لگی۔ میں بھی طلبہ کے اس گروہ میں شامل ہوگیا جو باقاعدہ فجر کی نماز ادا کر کے جسمانی ورزش کے کرتب دکھاتا۔ آئے دن کانگریس یا خلافت کمیٹی کے جھنڈے تلے گول بازار میں سرِشام جو جلسہ ہوتا میں اس میں تقریر کرنے کھڑا ہو جاتا کیونکہ پردہ نشین عورتوں کے جلسے میں کوئی مرد نہ جا سکتا تھا۔ مجھے اس خدمت پر مامور کیا گیا کہ میں وہاں سوراج اور خلافت کے پیغام سناؤں اور چندہ وصول کروں۔ اس دوران شہر میں چھوٹے بڑے لیڈر بھی وارد ہوتے تھے اور ان کی بڑی خاطر مدارات ہوتی تھی۔ حسبِ مرتبہ ان میں کوئی ہاتھی پر بیٹھا ہوتا، کوئی رتھ میں اور کوئی بیل گاڑی میں۔ ایسے موقعوں پر ہمارے گلے جے کار کرتے کرتے بیٹھ جاتے تھے۔ ہر جگہ کی طرح ہمارے شہر میں بھی سرگرم کارکنوں کو پولیس گرفتار کر کے جیل پہنچا دیتی اور ان پر پھولوں کی ایسی بارش ہوتی تھی گویا شادی رچانے جا رہے ہیں۔ اس کم عمری میں مجھے سیاست کا ایسا لپکا پڑا جو دیر تک باقی رہا۔

سرکاری ملازمت کے باوجود میرے والد کو سیاست سے دلچسپی تھی۔ وہ "الہلال" اور "کامریڈ" کے خریدار تھے اور قومی خیال کا کوئی نہ کوئی روزنامہ ان کے پاس باقاعدگی سے آتا تھا۔ ان کا کیمپ شہر سے تیس چالیس میل دور مہاندی کے کنارے تھا جہاں سے وہ ہفتے میں ایک بار گھر آتے تھے اور گھنٹوں ان اخباروں کو پڑھ کر شام کو اپنے دوستوں سے بحث میں مصروف ہو جاتے۔ ہمارے خاندان میں انگریز سے نفرت کی روایت پرانی تھی۔ میرے جدِ امجد جنرل میر مدن، پلاسی کے میدانِ کارزار میں ۱۷۵۷ء میں شہید ہوئے تھے۔ میرے دادا سید شجاعت حسین، جو ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے زمانے میں نوجوان تھے، جان کے خوف سے چند سال روپوش رہے اور جب ان کی مرضی کے خلاف دونوں بیٹوں نے انگریزی تعلیم کی طرف رخ موڑا تو انھیں کبھی معاف نہ کیا۔ لہٰذا یہ امر قابلِ فہم ہے کہ ملازمت کی پابندی کے باوجود عملی نہیں تو ذہنی طور پر میرے والد قومی سیاست سے وابستہ تھے۔ اس کی اطلاع حکام تک پہنچتی رہی۔ چنانچہ جب ۱۹۲۱ء میں ناگپور میں کانگریس کا جلسہ ہوا تو میرے والد چپکے سے اس میں شرکت کے لیے چل پڑے۔ مخبروں نے یہ اطلاع حکامِ بالا

کو پہنچائی تو میرے والد سے جواب طلب کیا گیا۔ اس معاملے نے طول کھینچا اور ایسی بدمزگی کا باعث ہوا کہ والد کی ترقّی روک دی گئی۔ اس پر بطورِ احتجاج انھوں نے کچھ عرصے بعد قبل از وقت پنشن لے لی۔ اس کے بعد جو گُل کھلا اس کا ذکر آگے آئے گا۔

چند سال تک ملک اس طوفان میں مبتلا رہا۔ لاکھوں آدمی جیل گئے اور سینکڑوں نے جامِ شہادت پیا۔ لیکن محض جذبے اور جوش پر کوئی سیاسی تحریک دیر تک نہیں چل سکتی۔ جب ترکوں نے از خود خلافت کو خیرباد کہہ دیا تو ہندوستانی مسلمان اُسے کیسے بچا سکتے تھے۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ گاندھی جی کے عدمِ تشدّد کے فلسفے پر قوم کا ہر فرد عمل کرے۔ چنانچہ جب حکومت کے جبر و ظلم سے تنگ آکر "چورا چوری" نامی بستی میں عوام نے پولیس کی ایک چوکی پر حملہ کیا تو گاندھی جی نے یک بیک ساری تحریک روک دی۔ اس طرح سیاسی ہزیمت اور انتشار کا دور شروع ہوا جس نے نہ صرف ہندو مسلم اتحّاد کو ختم کر دیا بلکہ کچھ مدّت کے لیے کانگریس کے شیرازے کو بھی درہم برہم کر دیا۔

تاہم اس میں شک نہیں کہ اس تحریک کا اثر دُور رس ہوا اور صدیوں کے سوئے ہوئے سماج میں نئی جان پڑ گئی۔ تحریر و تقریر میں کہا جانے لگا کہ حقوق صرف زمینداروں کے نہیں بلکہ کسانوں کے بھی ہوتے ہیں۔ ہمارے صوبے میں جو بے شمار اچھوت اونچی ذات والوں کے قدموں تلے پڑے ہوئے تھے، اب اپنی نجات کا راستہ تلاش کرنے لگے۔ یہ بھی سننے میں آیا کہ بمبئی اور کلکتہ جیسے بڑے شہروں میں کارخانوں کے مزدور ہڑتال کر رہے ہیں۔ یہ عجیب خبر گشت لگانے لگی کہ روس میں مزدوروں نے اپنی حکومت قایم کر لی ہے۔ شہر کے تعلیم یافتہ نوجوان، پنڈتوں اور مولویوں پر نکتہ چینی کرنے لگے۔ قومی زبانوں کے ادب میں بھی اب اظہار کے نئے نئے عنوان قایم ہونے لگے۔ غرض یہ کہ وہ پرانی قدریں جو اٹل اور امٹ سمجھی جاتی تھیں رفتہ رفتہ مسمار ہونے لگیں۔ اس موقع پر میری نظر سے برٹرینڈ رسل اور انگرسول کی تحریریں گزریں جن میں خدا کے وجود سے انکار کیا گیا تھا۔ جب میں نے ان کا ذکر اپنے والد سے کیا تو انھوں نے سمجھایا کہ یہ وہ نکات ہیں جن کا جواب عقلی دلائل نہیں دے سکتے۔ اصل مسئلہ انسانیت کو راہِ راست پر لانے کا ہے اور اصل علم اسی راہِ راست کی تلاش ہے۔

اب میری عمر چودہ پندرہ سال ہونے کو آئی تھی۔ غیر شعوری طور پر ایسا لگتا تھا کہ یہ ماحول میرے شبہات کا جواب نہیں دے سکتا۔ سرِ شام آنگن میں چارپائی پر لیٹ کر میں گھنٹوں آسمان کو تاکتا، اور خود سے پوچھتا، یہ کائنات کب اور کیسے پیدا ہوئی اور زندگی کا مقصد کیا ہے؟۔ اس وقت مجھے معلوم نہ تھا کہ روزِ ازل سے ان سوالوں نے انسان کو للکارا ہے اور شاید ابد تک وہ ان کا جواب نہ دے سکے۔ یہ ضرور ہے کہ انسان اگر چاہے تو زندگی کو بامقصد بنا سکتا ہے۔

شہر میں کوئی سینما یا ناٹک گھر نہ تھا البتہ وقفے وقفے سے کوئی گشتی منڈلی آجاتی اور پنڈال میں تماشے کا انتظام کرتی۔ کبھی مار دھاڑ یا ہنسی مذاق کے امریکی فلم بھی دیکھنے میں آتے اور ان کے لیے یہ اہتمام ہوتا تھا کہ قصہ گو اسٹیج کے پاس بیٹھ کر بآواز بلند نمک مرچ لگا کر فلم کی کہانی سناتا جاتا تھا۔ ابھی ٹاکی فلموں کا دور شروع نہیں ہوا تھا۔ اسی زمانے میں "عالم آرا" نامی ہندوستانی فلم بنا اور ایسا مقبول ہوا کہ جسے دیکھنے کے لیے سارا شہر اُلٹ پڑا۔ جیسے جیسے فلم کا شوق بڑھتا گیا، شہروں سے پرانی دلچسپیاں ختم ہوتی گئیں۔ ورنہ ہنوز لوگوں کو مرغ بازی اور تیتروں کی پالی کا شوق تھا اور کبوتروں کے چھتّے جا بجا نظر آتے تھے۔ ہر محلّے میں ایک نہ ایک اکھاڑا تھا اور ہر لڑکے کے لیے لازم تھا کہ وہاں زیادہ نہیں تو کچھ وقت ضرور گزارے۔ خوش باشوں کا جمگھٹ چائے خانوں یا حلوائی کی دکانوں پر لگتا، لیکن رنگین مزاج پان والیوں کی دکان پر اڈّہ جماتے اور پان کی گلوری یا بیڑی کے کش کے ساتھ ایران، توران کے قلابے ملایا کرتے تھے۔ انھیں میں ایک جگہ شہباز خان داستان گو قصّہ لے کر بیٹھ جاتے اور داستان امیر حمزہ کا لامتناہی سلسلہ اس زور و شور سے شروع کرتے کہ راہ چلتے کھڑے کے کھڑے رہ جاتے۔ میں بھی کبھی اُدھر جا نکلتا اور عمرو عیّار کے کرتبوں پر سب کے ساتھ قہقہے لگاتا۔

ہولی اور دیوالی ہندوؤں کے تہواروں کی طرح محرّم اور ماہِ رمضان بڑی دھوم سے منائے جاتے تھے۔ رمضان کی خاص خاص تاریخوں کو رات گئے مسلمان نوجوان گیس لیمپ اٹھائے سحری کے گیت گاتے گشت لگاتے تھے اور ہر شام کو افطار کے وقت مسجدوں

میں بڑی رونق ہوتی تھی۔ محرّم دکن کی روایت کے مطابق منایا جاتا تھا۔ مسلمانوں کے ساتھ ہندو بھی تعزیے اُٹھاتے اور ان جلوسوں میں جوق جوق شامل ہوتے تھے جو "سواری" کے نام سے رات کو مشعلوں کے ہجوم میں رواں ہوتے تھے۔ کوئی مجاور وجد کے عالم میں ریشم و کمخواب میں لپٹی ہوئی ایک بے چہرہ شبیہ کو لیے اس الاؤ کی طرف چل پڑتا تھا جو شہر کے باہر میدان میں سرِ شام روشن کر دیا جاتا تھا۔ مجاور دہکتی ہوئی آگ پر اس طرح چل پڑتا کہ جیسے ٹھنڈی سڑک پر گامزن ہو اور تماشائی فرطِ جوش میں "حسین حسین" کا نعرہ بلند کرنے لگتے۔ محرّم کے موقعے پر کئی منچلے لنگوٹ باندھ کر شیر کا روپ دھارتے یعنی جسم پر شیر کے نقش و نگار بنا کر ڈھول کی تال پر جنگی رقص کرنے لگتے تھے۔ غرض کہ دس دن ماتم کے ساتھ میلوں اور تماشوں کی ایسی رونق رہتی تھی جس کا تصوّر بھی اب ممکن نہیں۔ ہولی کی بات ہی نرالی تھی۔ جب ہندو مرد و زن پچکاری سے رنگ پھینکتے، گلال ملتے، گلی کوچوں میں نکل آتے تو سنجیدہ مسلمان گھروں میں چھپ جاتے۔ لیکن مجھ جیسے کم عمر بلا تکلّف اس دل لگی میں شریک ہو جاتے اور جب شام ہو جاتی تو سب لوگ نہا دھو کر چوراہے پر جمع ہو جاتے جہاں ہندو دکان دار مجرے اور دعوتِ عام کا انتظام کرتے تھے۔ بھنگ کے نشے کی مستی، ہولی کی نرت اور گیت کے لطف کو دوبالا کر دیتی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ عہدِ جدید کی مصنوعی دلچسپیوں کی بہ نسبت وہ پُرانے مشاغل شاید کہیں زیادہ معصوم اور دل رُبا تھے۔

میں مڈل کا اور میرے بھائی میٹرک کے طالب علم تھے جب شہر میں پہلا مشاعرہ منعقد ہوا۔ اسے مسلمانوں کے فکری رجحان کا کرشمہ سمجھیے کہ یک بیک کئی شاعر اُبھر آئے ہیں جن میں میرے بھائی بھی تھے۔ اُنھوں نے پہلی غزل لکھی اور شمیم تخلّص اختیار کیا۔ اس کے بعد شاعری کے شوق نے انھیں ایسا گھیرا کہ اسکول کی کتابیں بالائے طاق رکھ عروض و بیان اور ردیف و قافیہ کی دنیا میں کھو گئے۔ جب دیکھو یا تو کسی دیوان کے مطالعے میں غرق ہیں یا فکرِ سخن میں محو ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ امتحان میں فیل ہو گئے اور والد نے انھیں پڑھنے کے لیے اپنے کسی دوست کے پاس کلکتہ بھیج دیا۔

اوپر ان اسباب کا ذکر آچکا ہے جنھوں نے والد کو قبل از وقت ملازمت سے ریٹائر ہونے کے لیے آمادہ کیا۔ میں کتابوں اور خیالوں کی دنیا میں ایسا کھویا ہوا تھا کہ اس واقعے کی اہمیت سے بے خبر رہا۔ گھر کے حالات میں کوئی فرق نہ آیا۔ البتہ بھائی کی کمی محسوس ہوتی رہی اور والد مہینوں کے لیے میری سوتیلی ماں کے پاس پٹنہ چلے جاتے جو دادی کے ساتھ ہمارے آبائی مکان میں رہتی تھیں۔ دیر میں جاکر مجھے معلوم ہوا کہ والد نے پنشن کی رقم کا بڑا حصّہ اپنی جمع پونجی کے ساتھ روئی کے ایک جنگل کے ٹھیکے پر لگا دیا تھا۔ وہ خود انتہائی سادہ مزاج اور تجارت کے اونچ نیچ سے قطعاً ناواقف تھے اور بے سوچے سمجھے ہر کس و ناکس پر اعتبار کر لیتے تھے اس کا خمیازہ ان کے ساتھ ہمیں بھی اٹھانا پڑا۔ جس طرح پٹنہ کی جائداد انھوں نے کسی مختار کے سپرد کر رکھی تھی، ہمارے گاؤں کا انتظام بھی ایک مختار کے حوالے کر دیا۔ اب یہی طریقۂ کار روئی کے جنگل کے لیے اختیار کیا اور تین سال تک پے در پے ایسا نقصان اٹھایا کہ گرہ میں کچھ نہ رہا۔ جب شمیم صاحب کلکتہ جا چکے تو والد نے کہا کہ تم نے اب تک اپنا گاؤں "پرسٹی" نہیں دیکھا ہے۔ ایسی جائداد سے اس وقت فائدہ حاصل ہوتا ہے جب وہاں خود رہا جائے۔ لیکن مجبوراً یہ نہ ہو سکا۔ جو چند سو روپیہ آمدنی آتی ہے وہ تمھیں لوگوں پر خرچ ہو جاتی ہے۔ بہر صورت سالانہ مالیانے کی وصولی کا وقت آپہنچا ہے اور کیونکہ آیندہ انتظام تمھیں کو سنبھالنا ہے لہٰذا ملازم کے ساتھ وہاں جاؤ۔ بادل نخواستہ میں بہشتی میاں کے ساتھ بیل گاڑی پر گاؤں کی طرف چل پڑا جو شہر سے کوئی پچیس میل دور تھا۔

صبح ہم ایک قصبے میں پہنچے جہاں والد کا شناسا عبداللہ نامی شخص رہتا تھا جو ہمارے گاؤں کے ساتھ اور بھی دو چار موضعوں کی مختاری کے فرائض انجام دیتا تھا۔ اس نے میری بڑی آؤ بھگت کی اور کہا کہ جب تک رعایا کو اطلاع نہ ہو زمیندار کو گاؤں ہرگز نہ جانا چاہیے۔ چنانچہ اس نے اُس طرف ہرکارے دوڑائے اور سہ پہر کو مجھے لے کر چل پڑا۔ درختوں کے جھرمٹ کے پاس رک کر اس نے ہاتھوں کے اشارے سے کہا کہ یہاں سے آپ کی سرحد شروع ہوتی ہے۔ حدِ نظر پر جھونپڑیوں کی قطاریں تھیں اور ہر طرف کھیت لہلہا رہے تھے۔ ان سے ہٹ کر پانی کا ایک تالاب تھا جس کے پاس ایک چھوٹا مندر کسی مورت کو اپنی آغوش میں

چھپائے ہوئے تھا۔ وہیں مفلوک الحال کسانوں کا غول ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ ان کا مکھیا منگل ہماری طرف بڑھا تو عبداللہ مختار نے تحکمانہ انداز میں کہا "یہ ہیں تمھارے مالک"، یہ سنتے ہی وہ میرے پاؤں پر جھک پڑا۔ مگر میں نے فوراً اسے اوپر اٹھایا۔ تاہم میرا یہ انکسار کسانوں کو روایتی جذبۂ عقیدت کے اظہار سے باز نہ رکھ سکا جو میرے سامنے زمین پر جھک گئے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس وقت ان کی بے کسی سے زیادہ مجھے اپنی حیثیت پر دل میں شرم آئی۔ اتنے میں مکھیا منگل نے ایک تقریر شروع کی جس کا مفہوم یہ تھا کہ میری والدہ کے انتقال کے بعد رعایا کی حالت یتیم کی سی ہو گئی تھی اور اب انھیں مجھے دیکھ کر اطمینان ہوا کہ ان کا نگہبان اب اس قابل ہو گیا ہے کہ ان کے دکھ سکھ کو سمجھ سکے۔ پھر چوپال سے جا کر حساب کے مطابق اس نے مالیانے کی رقم میرے سپرد کی اور کسان مقامی بولی میں اپنا حال سنانے لگے۔

ہماری وہ اقامت گاہ جہاں پہلے نانی یا والدہ کبھی کبھی آ کر ٹھہرتی تھیں، اب بے توجہی کی وجہ سے شکستہ ہو چکی تھی۔ کسانوں نے وعدہ کیا کہ وہ اس کی مرمت جلد کر دیں گے تاکہ میں وہاں آ کر ٹھہر سکوں۔

انسانوں کے دکھ سکھ کے اسباب پر غور کرنے کا شعور مجھے کلکتہ پہنچ کر ہوا، اور اس کے ساتھ اپنے کسانوں سے میری ہمدردی بڑھتی گئی۔ جب انھیں اور مختار کو اس کا اندازہ ہوا تو وہ سرکاری خزانے میں مالیانہ جمع کرانے میں حیص بیص کرنے لگے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ علی گڈھ کے قیام میں دو بار مالیانہ مجھے اپنی جیب سے بھرنا پڑا۔ اسے غفلت یا بے عملی کہیے کہ یہ جائداد دردِ سر ہو کر رہ گئی۔

سب سے عزیز میرا ہم جماعت بسنت کمار تھا۔ بچپن میں جب وہ یتیم ہو گیا تو اس کے نانا نے پرورش کا ذمہ لیا۔ وہ بنگال سے آ کر یہاں وکالت کرنے لگے تھے۔ بڑے بڑے نکتہ ور جن مسائل کو حل نہ کر سکے اپنی خام خیالی میں ہم دونوں انھیں سلجھانے میں خاصا وقت ضائع کرتے تھے۔ اتنے میں میٹرک کا امتحان ختم ہوا اور نتیجے کا انتظار ہونے لگا۔ میرے دوست نے سمجھایا کہ شہر کے شمال میں ڈیڑھ سو میل دور امرکنٹک نامی پہاڑ ہے

جہاں سے دریائے نربدا نکلتا ہے اور آٹھ سو میل کی مسافت طے کرتا ہوا بحیرۂ عرب سے جا ملتا ہے۔ اس علاقے میں ہر طرف گھنے جنگل ہیں جہاں جا بجا سادھوؤں نے آشرم بنا رکھے ہیں۔ ان میں سے بعض برگزیدہ اور نکتہ دان بھی ہیں۔ شہر کی بجائے چھٹی کے دو مہینے جنگل میں کیوں نہ گزاریں۔ اگر ہوا راس آئی تو وہیں رہ جائیں گے، ورنہ واپس آجائیں گے۔ یہ مشورہ میرے دل کو اتنا بھایا کہ ہم دونوں بغیر کسی کو اطلاع دیے فوراً ریل پر بیٹھ اس سمت روانہ ہو گئے۔ ہم نے سُن رکھا تھا چمپانامی اسٹیشن کے بعد جنگل کا سلسلہ شروع ہوتا ہے اور سادھوؤں کے حالات وہاں معلوم ہو جائیں گے۔ چنانچہ اسٹیشن کے پاس ایک سرائے میں اپنے سفری بیگ رکھ کر شام کے وقت ہم ایک حلوائی کی دکان پر جا بیٹھے۔ حدِّ نظر تک اونچے اونچے درخت قطار در قطار کھڑے ہوئے تھے اور کہر کے باوجود پہاڑ کی بلندیوں پر آنکھیں ٹک جاتی تھیں۔ حُسنِ فطرت کا جو احساس دل میں پیدا ہوا وہ عمر بھر باقی رہا۔ ہماری گفتگو سے حلوائی سمجھا کہ اوروں کی طرح ہم بھی اس مقدس دریائے نربدا کی زیارت کو آئے ہیں تو اُس نے تفصیل سے اس راستے کی نشان دہی کی اور باتوں باتوں میں بتایا کہ یہاں سے آٹھ میل دور فلاں چشمے کے کنارے "سوامی پربھو" کا ڈیرا ہے۔ مدّتوں سے چند چیلوں کے ساتھ گیان دھیان میں مگن ہے اور اس کے کرشمہ و کرامات کی بڑی شہرت ہے۔ یہ مژدہ سنتے ہی ہم دونوں دوسرے دن اُس جانب چل پڑے اور بہ دقّت تمام دو تنا ور پیپل کے درختوں کے بیچ میں اس کٹیا کو دریافت کر لیا جہاں بوڑھا سادھو آسن جمائے فکرِ الٰہی میں محو تھا۔ اسے سلام کر کے جب ہم تھکے ہارے گھاس پر بیٹھ گئے تو وہ سفید ریش پر ہاتھ پھیر پھیر کر غور سے ہمارا معائنہ کرتا رہا اور پھر بولا "اگر تم نربدا دیوی کا درشن کرنا چاہتے ہو تو دو دن کا سفر باقی ہے۔ جی چاہے تو رات کو یہیں ٹھہر جاؤ۔" ہم نے جواب دیا کہ "ہم تو آپ کے درشن کے لیے آئے ہیں۔ فی الحال آگے جانے کا ارادہ نہیں ہے۔" اُس سے ہم نے اپنی ذہنی کیفیت بیان کی اور سادھو کو یقین آگیا کہ ہم علم کے طالب ہیں۔ اُس نے آشرم میں رہنے کی اجازت دے دی۔

سادھو کی صحبت سے کچھ حاصل کیا یا نہ کیا جنگل میں جو چند ہفتے گزرے ان کی یاد اب تک باقی ہے۔ چٹائی پر کمبل اوڑھ کر لیٹنے کا یہ پہلا تجربہ تھا۔ رات کے سناٹے میں جھینگروں کی لامتناہی جھنکار اور جھرنے کی مسلسل گنگناہٹ کے بیچ میں وحشی جانوروں کی چیخ پکار سے ایسی کیفیت پیدا ہوتی تھی کہ تھکن کے باوجود نیند آنکھوں سے غائب ہو جاتی تھی کہ ہم بے بلائے مہمان تھے اور زیادہ وقت جنگل کی سیر میں گزار دیتے تھے، تاہم ہمیں پیپل کے پتّے پر کھانے کو کچھ نہ کچھ مل جاتا۔ اور سادھو کی حکمت اور نصیحت سے بھی فیض یاب ہوتے۔ ایک دن اُس نے سمجھایا کہ انسانی زندگی کے چار دور ہوتے ہیں۔ پہلا علم کی جستجو کا زمانہ جس سے تم گزر رہے ہو۔ پھر آدمی شادی بیاہ کے جنجال میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ اس ذمے داری سے عہدہ برآ ہونے کے لیے عمر کا بڑا حصّہ کام کاج اور دنیا داری میں بسر کرتا ہے۔ بالآخر وہ وقت آتا ہے جب بچّے بڑے ہو جاتے ہیں اور نہ اس کو دنیا کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ دنیا کو اس کی۔ اگر وہ دانش مند ہے تو وہ سب کو خیرباد کہہ کر جنگل کا رُخ کرتا ہے اور باقی وقت حقیقت کی تلاش میں صرف کرتا ہے۔ میں نے پوچھا۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ اصل علم دنیا میں رہ کر نہیں بلکہ دنیا سے علیحدگی اختیار کرنے کے بعد حاصل ہوتا ہے۔ جب سادھو نے اس امر کی تصدیق کی تو میں نے کہا اس علم کا کیا حاصل جو فرد کی ذات تک محدود رہ جائے اور دنیا اس سے سود مند نہ ہو سکے۔ سادھو نے جواب دیا ابھی تم حصول علم کی پہلی منزل میں ہو اور تم اس قابل نہیں کہ دنیا کو کچھ دے سکو۔ جب تمھارے پاس دنیا کو کچھ دینے کے لیے ہو تو خود فیصلہ کر لینا کہ اپنے پاس کیا رکھنا چاہتے ہو اور دوسروں کو کیا دینا چاہتے ہو۔ اس قول کا اصل مفہوم دیر میں سمجھ میں آیا۔

مہینے بھر بعد جب چودھویں کا چاند نکلا تو چیلوں نے کہا کہ کل ریلوے اسٹیشن کے پاس میلہ لگے گا جہاں دور دور سے دکان دار اور تماشائی آئیں گے۔ ہم سب کو وہاں چل کر اپنے آشرم کے لیے چندہ جمع کرنا ہے۔ غرض دوسرے دن ان کے ساتھ میں نے اور بسنت کمار نے جوگیا کپڑے پہنے اور صبح سویرے اُس طرف کا رخ کیا۔ دراصل اس چھوٹی سی بستی میں جان پڑ گئی تھی۔ سینکڑوں شامیانوں اور خیموں میں ہندو جاتریوں اور تماشائیوں کے

لیے ہر طرح کا سامان لگا ہوا تھا۔ ہم آٹھ دس نوجوان جوگی ہاتھوں میں کشکول لیے اپنے سردارِ قافلہ کے پیچھے بھجن گاتے ہوئے پولیس چوکی تک پہنچے تھے کہ کسی نے پکار کر کہا۔ "یہی وہ دو لڑکے معلوم ہوتے ہیں جو رائے پور سے غائب ہو گئے اور جن کا اشتہار ہر طرف تقسیم ہوا ہے"۔ یہ سنتے ہی ہمارے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی اور راہِ فرار ملی بھی نہ تھی کہ دو پولیس والوں نے ہمارے بازو تھام لیے۔ کسی فائل سے فوٹو نکال کر ہمیں شناخت کیا اور ہمارے ہر احتجاج کو یہ کہہ کر رد کر دیا کہ ہم ابھی نابالغ ہیں اور ہمیں اپنے بزرگوں کی مرضی کے خلاف کچھ کرنے کا حق نہیں ہے۔ غرض یہ کہ "پا بدستِ دگرے دست بدست دگرے" جب جوگیوں کی شکل بنائے پولیس کی حراست میں گھر واپس پہنچے تو شہر کے گھر گھر میں دیر تک اس واردات کا چرچا رہا۔ اس طرح میری ادبی زندگی اور حقیقت کی تلاش کا آغاز ہوا۔ اس کے بعد بھی کئی موقعے آئے جب میں نے روشن ضمیر افراد کو جنگلوں اور خانقاہوں کی تنہائی میں ان پیچیدہ مسائل میں سرگرداں پایا جن پر خالقِ حقیقی نے اسرار کی تہ در تہ نقاب ڈال رکھی ہے جس کی پردہ کشائی اب تک کوئی نہیں کر سکا۔

صوبے میں پہلی یونیورسٹی اسی سال قایم ہوئی تھی اور میٹرک کا امتحان اسی کی نگرانی میں ہوا تھا۔ نتیجہ نکلا تو حسبِ توقع میرا نام فرسٹ ڈویژن میں آیا۔ مجھے اس کا انتظار تھا کیونکہ میں دل میں کالج کی تعلیم کے لیے کلکتہ جانے کا منصوبہ بنا چکا تھا۔ شمیم صاحب پہلے سے ہی وہاں جا چکے تھے۔ اور جب انھیں والد کی مالی مشکلات کا علم ہوا تو اخبار نویسی کی طرف مائل ہوئے اور روزنامہ "عصرِ جدید" میں کام سے لگ گئے۔

میرے لیے وہ دن سخت آزمایش کا تھا جب امتحان کے نتیجے کی خوش خبری سنانے کے لیے والد کی خدمت میں حاضر ہوا۔ مہینوں سے وہ تن تنہا اور خاموش اپنے کمرے میں بیٹھے رہتے تھے۔ میں ایسا نادان اور ناتجربے کار تھا کہ نہ ان کی پریشانی کا احساس تھا اور نہ اس کی وجہ معلوم تھی۔ جب میں نے انھیں اپنے پاس ہونے کی اطلاع دی تو مسکرا کر یک بیک چپ ہو گئے۔ پھر تردّد کے آثار ان کے چہرے پر نمایاں ہوئے اور پوچھا

"اب کیا کرو گے؟" اس سوال پر مجھے تعجّب ہوا اور عرض کیا کہ ابھی تو میں تعلیم کے پہلے زینے سے گزرا ہوں، علم کی تلاش میں مجھے باہر جانا ہے۔ والد نے افسوس کے لہجے میں کہا۔ "میری بھی یہی آرزو ہے کہ تم زیادہ سے زیادہ علم حاصل کرو لیکن میں فی الحال اس قابل نہیں کہ تمھاری مدد کر سکوں۔ البتہ تمھاری والدہ نے جو جائداد تم دونوں بھائیوں کے لیے چھوڑی ہے اگر اس کا انتظام سنبھال سکو تو ہر معاملہ آسان ہو جائے گا۔ میں اب تک صرف اس کی حفاظت کر سکا۔ لیکن اس میں توسیع و ترقی میرے بس کی بات نہیں۔ یہ امر یقینی ہے کہ میں اس شہر میں زیادہ دیر نہ ٹھہروں گا۔ تمھارے جانے کے بعد یہاں کسی سے میرا کوئی تعلق باقی نہ رہے گا۔ مظفر شاعر مزاج ہے اور ان مسائل سے اُسے کوئی دلچسپی نہیں۔ اب تمھارا فرض ہے کہ اس امانت کو سنبھالو اور مجھے اس ذمّے داری سے سبکدوش کر دو۔"

میں بھونچکا سا ان کی شکل دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔ جائداد کا انتظام یا پیسے کی کمی کا مفہوم اب تک میری سمجھ سے دور تھا لہٰذا میں نے جواب دیا کہ آپ یہ ذمّے داری اسی عبداللہ مختار کے سپرد رہنے دیں اور مجھے اجازت دیں کہ کلکتہ میں قسمت آزمائی کروں۔ والد نے دو سو روپے دے کر مجھ سے کہا کہ فی الحال اس سے کام چلاؤ، خدا نے چاہا تو آیندہ تمھاری مدد کی کوئی صورت نکل آئے گی۔ دوسرے ہی دن میں ریل سے کلکتہ روانہ ہو گیا۔

یہ ۲۶ جون ۱۹۲۸ء کی بات ہے۔ میرے والد خود جائداد عبداللہ مختار کے سپرد کر کے راہیٔ عظیم آباد ہوئے۔ مختار نے یتیموں کا مال سمجھ کر ہماری جائداد کو اس طرح بگاڑا کہ یہ ہمارے لیے وبال جان بن گئی اور ۱۹۳۷ء میں میں نے یورپ جانے کا تہیّہ کیا تو یہ اونے پونے بک گئی۔ اس واقعے کا نفسیاتی اثر یہ ہوا کہ والد کی طرف سے جو تھوڑی سی آبائی جائداد پٹنہ میں رہ گئی تھی اس کا کوئی کلیم ہم نے پاکستان میں داخل نہیں کیا۔

کلکتہ کی یادیں

(۲)

کلکتہ میں ذکریا اسٹریٹ سے ایک چھوٹی سی سڑک نکلتی ہے جس کا نام نواب بدرالدین اسٹریٹ ہے۔ اس کے ایک چہار منزلہ مکان کے تیسرے طبق میں کرائے کے تین کمروں میں ایک دوسرے سے متّصل تین دوست قیام کرتے تھے۔ مظفر حسین شمیم۔ چراغ حسن حسرت اور سلیم اللہ فہمی۔ میں نے اپنا بستر بھائی کے کمرے میں فرش پر لگا دیا اور جب اس میں سے تکیہ برآمد نہ ہوا تو ایک موٹی سی لغت تولیے میں لپیٹ سرہانے رکھ کر خیال میں محو ہو گیا۔

مجھے اندازہ بھی نہ ہوا کہ زندگی میں کوئی نیا موڑ آ گیا ہے۔ فکرِ معاش کا نام بھی کبھی نہ سُنا تھا اور ماضی اس قدر قریب تھا کہ میں اسے دماغ سے نہیں بلکہ ہاتھ سے چھُو سکتا تھا۔ اس میں مہر و محبّت کے نقوش بہت کم تھے۔ البتّہ رہ رہ کر بڑی بی کا خیال آتا تھا جس کے لیے میں رہنے کی جگہ، خبر گیری کے لیے ملازمہ اور گزر اوقات کے لیے مختار کو ہدایت دے آیا تھا۔ کبھی کبھی چند پیارے دوستوں کے قہقہے، مندروں کی گھنٹیوں اور چرواہوں کی بانسری کی تانوں کے ساتھ حافظے میں گونج کر یہ باور کرنے پر مجبور کرتے تھے کہ تیری دنیا ہمیشہ کے لیے بدل گئی۔

اتنے میں شام ہونے کو آئی اور یکے بعد دیگرے وہ تینوں بزرگ رہائش گاہ پر لوٹ

آئے بلکہ اپنے ساتھ دو اور کولے آئے جن میں سے ایک کو میں جانتا تھا۔ یہ محفوظ الحق اور نجیب اشرف ندوی تھے، جو تاریخ میں کلکتہ یونیورسٹی سے ایم۔اے کی ڈگری لے کر اپنے اُستاد سرجادوناتھ سرکار کے ساتھ تحقیق میں مصروف تھے۔ بعد میں دونوں پروفیسر ہوئے اور نام پیدا کیا۔ نجیب اشرف کے والد ڈاکٹر مبین اشرف رائے پور میں پریکٹس کرتے تھے اور میرے چچا ڈاکٹر اصغر حسین کے ہم جماعت تھے۔ اس تعلق سے نجیب اشرف ہم دونوں بھائیوں کو عزیز رکھتے تھے۔ ان کے چھوٹے بھائی علی اشرف کی شادی مولانا سلیمان ندوی کی صاحبزادی سے ہوئی تھی۔ مولانا ایک دو بار رائے پور آچکے تھے اور میں بعد میں جب کبھی ان سے علی گڑھ اور کراچی میں ملا تو ان کی شفقت سے سرفراز ہوا۔

یہ میرے لیے فالِ نیک تھی کہ پہلے ہی دن علم و ادب کے ایسے شائق مل گئے۔ سب نے برادرِ خُرد سمجھا اور شروع میں میری رہبری کی۔ اسی نسبت سے کسی نے فرمایش کی کہ اختر میاں چلئے کا ایک دَور ہو جائے۔ پھر چل کر رنگون ریسٹوران میں کھانا کھائیں گے۔ یہ سُن کر میں گھبرایا اور صفائی سے کہہ گیا کہ میں نے تو آج تک چلئے نہیں بنائی۔ اس پر سب بے اختیار ہنس پڑے اور فہمی صاحب نے بتلایا کہ اِسٹوو کس طرح جلایا جاتا ہے۔ کیتلی میں پانی کب جوش پر آتا ہے اور چلئے دانی میں فی کس چلئے کی پتّی کس حساب سے ڈالی جاتی ہے۔

ذِکریا اسٹریٹ کے رنگون ریسٹوران کی وہی حیثیت تھی جو کسی زمانے میں لاہور کے عرب ہوٹل یا بمبئی کے کافی ہاؤس کی۔ اس کا مالک ایک ایرانی تھا اور یہاں دن بھر اردو اور فارسی کے ادیبوں اور شاعروں کا جمگھٹ رہتا تھا۔ اسی سڑک پر امجدیہ ہوٹل تھا جس کے بالاخانے پر خلافت کمیٹی کا دفتر اس امر کی شہادت دے رہا تھا کہ مسلمانانِ ہند ہنوز نسیان کی اسی علّت میں مبتلا ہیں، جس کا مظاہرہ تیرھویں صدی سے ہوتا چلا آیا تھا جب ہلاکو کے ہاتھوں خلافتِ عبّاسیہ کا چراغ گُل ہو جانے کے تیس سال بعد تک دہلی کی مسجدوں میں معتصم باللہ کا خطبہ پڑھا جاتا رہا۔ کمیٹی کے صدر اس زمانے میں حسین شہید سہروردی تھے۔ اس کے دفتر نیز امجدیہ ہوٹل میں سیاسی گپ شپ کا بازار گرم رہتا تھا۔ آگے چل کر جب مجھے خالی وقت کاٹنا منظور ہوتا تو رنگون ریسٹوران کا رُخ کرتا جہاں ان ایرانی نوجوانوں کی صحبت مجھے پسند تھی جو اپنے

ملک کی ناکام انقلابی جدوجہد کے خوں چکاں واقعات سنایا کرتے تھے۔ وہیں بیٹھ کر مجھے ایران کی تہذیب اور شاعری سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے دَور سے لے کر تا ایں دم کلکتہ میں غیر ملکی تاجروں کے ساتھ ایرانی بھی خاصی تعداد میں رہتے آئے تھے اور ان میں سے کئی میں علم و ادب کا اچھّا ذوق تھا۔ سب سے مقتدر ہستی موئیدالاسلام جلال الدین کی تھی جو جمال الدین افغانی کے رفیق اور حبل المتین کے مدیر کی حیثیت سے دنیائے اسلام میں روشناس تھے۔ گو وہ نابینا تھے لیکن ان کی ذہنی و سیاسی بصیرت کا سب احترام کرتے تھے۔

ثقہ قسم کے مسلمان دانشور مسلم انسٹیٹیوٹ میں جمع ہوتے تھے۔ وہاں میں نے مولانا وحشت، صلاح الدین خدابخش اور نواب نصیر حسین خیال کی باتیں کبھی کبھی سنیں۔ البتہ مولانا آزاد حسب معمول کہیں آتے جاتے نہ تھے ماسوا عید کی نماز کے موقع پر۔ وہ سال میں دو بار چورنگی کے میدان میں نماز پڑھاتے تھے۔ آغا حشر کاشمیری بھی مختار بیگم کے سوا کسی کے گھر نہ جاتے تھے۔ وقت کے ساتھ جیسے تیسے مجھ میں خود اعتمادی پیدا ہوتی گئی، میں ان بزرگوں سے علم کی جستجو میں بے دریغ ملتا رہا۔

رنگون ریسٹوران کی فضا میں ایک ناقابلِ فراموش کشش تھی اور گاہے گاہے ایسے نادرِ روزگار نظر آتے تھے جن کا ثانی پھر نہ ملا۔ مجھے ہمایوں مرزا خوب یاد ہیں جو مٹیا برج میں رہتے تھے اور واجد علی شاہ کا زمانہ دیکھ چکے تھے۔ ان کے والد آخری تاج دارِ اودھ کے ساتھ لکھنؤ سے یہاں آپڑے تھے۔ ہمایوں مرزا اب پیر سال ہو چکے تھے۔ لیکن انھیں خاندانی نجابت سے زیادہ اس فریب پر یقین تھا کہ کوہ قاف کی پریاں ان پر عاشق ہیں۔ افیون کی ترنگ میں وہ لکھنؤ کے دربار اور مٹیا برج کے پرانے مکانوں کے ایسے ہوش ربا قصّے سناتے کہ کیا ایرانی اور کیا تورانی، کیا گاہک اور کیا ملازم، دم بخود سنتے اور آفریں آفریں کی صدا بلند کرتے۔ سنا ہے کہ جب اوّل جنگ عظیم سے پہلے مولانا محمد علی کلکتہ سے کامریڈ نکالتے اور حسن امام وہاں وکالت کرتے تھے تو ہمایوں مرزا اُن کے زمرۂ احباب میں اس شرط پر شامل ہوئے کہ سب مل کر انھیں ہزار روپے ماہانہ وظیفہ دیں گے تاکہ وہ اپنی وضع نبھا سکیں۔ البتّہ اگر انھوں نے کوئی غلط بات کہی تو جرمانہ ادا کرنا ہوگا۔ غرض مہینے بھر کے جرمانے کی اوسط نو سو روپے بیٹھتی تھی جس کے بعد انھیں سو روپیہ باقاعدگی سے ادا ہو جاتا تھا۔ لکھنؤ کے دبستانِ شاعری کے وہ مدّاح

تھے اور اس رنگ میں خوب کہتے تھے۔ افسوس کہ ان باتوں کا شوق مجھے دیر سے ہوا، ورنہ ہمایوں مرزا اور مٹیا برج کی خاک بسر تہذیب پر اس وقت خاصا مواد موجود تھا۔ مرزا صاحب کا فقط ایک شعر یاد رہ گیا ؎

باغ میں چل کے سنیں لوہ ترنگ بلبل کے
ضربِ منقار سے بجتے ہیں کٹورے گُل کے

اب تو مٹیا برج صنعتی محلّہ بن گیا۔ مگر اس وقت بھی اس اجڑے دیار میں پرانے لکھنؤ کی ذرا سی جھلک باقی تھی یہاں وہاں شکستہ مکانوں میں خانماں خراب امیر زادے چھوٹے موٹے وثیقوں پہ گزر اوقات کرتے تھے۔ یہیں میں نے شہزادہ جواں بخت کے پوتے مرزا بیدار بخت کو ڈھونڈ نکالا اور بہادر شاہ ظفر کے ایّامِ اسیری پر "تیموریہ گھرانے کی آخری جھلک" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا جس کا ہندوستان کی کئی زبانوں میں ترجمہ ہوا۔ یہ ۱۹۳۱ء کی بات ہے۔

مولانا آزاد کے مریدوں میں چند دانشور بھی تھے جن میں مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی، عبداللہ مصری اور اسحاق امرت سری قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے خیالات کی تائید میں انھوں نے پہلے ہفتہ وار "پیام" اور بعد میں روزنامۂ ہند نکالا۔ ان صاحبوں سے مجھے نیاز حاصل تھا بلکہ اسحاق امرت سری سے تو اب بھی کراچی میں ملنا ہوتا ہے اور پرانی صحبتوں کا ذکر آتا ہے۔ میں جب کلکتہ پہنچا تو "الہلال" دوبارہ نکال کر بند ہو چکا تھا۔ اس کے ادارۂ تحریر سے عبدالرزاق ملیح آبادی اور نجیب اشرف ندوی وابستہ رہ چکے تھے۔ رسالہ "آفتاب" دو سال چراغ حسن حسرت کی ادارت میں آب و تاب سے نکلا اور پھر غروب ہو گیا۔ لے دے کر مولانا شایق احمد عثمانی کا روزنامہ "عصرِ جدید" ہمیشہ کی طرح اردو کا نام لیوا رہ گیا تھا اور حسرت و شمیم دونوں اس کے معاون تھے۔

چراغ حسن حسرت اور مظفر حسین شمیم کی اخبار نویسی نے ان کی شاعری اور شاعری سے دلچسپی نے اخبار نویسی کو نقصان پہنچایا۔ شروع سے اردو اخباروں کو ادبی چٹخارے کی جو

عادت پڑ گئی ہے، اگر غور کیجیے تو اس سے ممکن ہے کہ ان کی مقبولیت میں اضافہ ہوا ہو لیکن معیار پر بُرا اثر پڑا۔ مولانا آزاد، قاضی عبدالغفّار اور مولانا ظفر علی خاں جیسے انشا پردازوں تک کو اس قسم کی اخبار نویسی نے نقصان پہنچایا۔ کیونکہ واقعات کا تجزیہ جذبات سے نہیں کیا جا سکتا۔

حسرت صاحب کی آزاد منشی، شوخیٔ طبع اور طنز و مزاح کی استادی کا سب نے اقرار کیا ہے۔ میں نے کلکتہ سے کراچی تک انھیں ایک ہی رنگ میں دیکھا۔ ان کا مقولہ تھا کہ ماحول بُرا ہو تو لاحول پڑھو۔ اور اس کا مظاہرہ یوں کرتے کہ جب کوئی بُری خبر آتی تو سگریٹ کا گہرا کش کھینچ کر چٹکی سے اس کی راکھ جھاڑ دیتے، گویا دامن سے غم جھٹک دیا ہو۔ اردو اور فارسی ادب پر ان کی نظر گہری تھی البتہ ان کا ذوق رومانیت اور لذت پرستی سے زیادہ نہ بڑھ سکا۔ ان کے کمرے میں کانن ڈائل، میری کوریلی اور رائیڈر ہیگرڈ کے ناولوں کے انبار لگے تھے، جنھیں سال بھر بعد مولانا ظفر علی خاں کی طلب پر لاہور جاتے وقت وہ مجھے بخش گئے۔

کلکتہ اس وقت ہندوستان کا سیاسی اور تہذیبی مرکز تھا۔ اس کا شعور مجھے ذرا دیر سے ہوا۔ البتّہ یہ فوراً سمجھ میں آگیا کہ وہ عروس البلاد ہے۔ ہر روز میں ٹرام میں بیٹھ کر کبھی ہُگلی کے کنارے جاتا اور گھنٹوں دریا کی زندگی کا نظارہ کرتا، کبھی علی پور کے چڑیا گھر میں چرند و پرند کی کلیلوں سے خوش ہوتا یا پھر وکٹوریا میموریل میوزیم اور آرٹ گیلری میں بیٹھ کر انسان کی کاریگری کے نمونوں پر حیرت کرتا۔

اٹھارھویں صدی میں جب کلکتہ ایسٹ انڈیا کمپنی کا دارالحکومت قرار پایا تو پہلے بنگالی امیدواروں اور بعد ازاں مارواڑی سوداگروں نے اسے اپنی آماجگاہ بنایا۔ یہی نہیں بلکہ غیر ملکی تاجر، جن میں انگریزوں کے علاوہ ایرانی اور ارمنی وغیرہ بھی شامل تھے، یہاں بڑی تعداد میں جمع ہو گئے۔ ٹیپو سلطان کی اولاد اور واجد علی شاہ کے وسیلے سے یہاں علم و تہذیب کی پرورش ہونے لگی اور رئیسوں نے اپنی تہذیب کی سرپرستی قبول کی۔ اس طرح یہ شہر بیسویں صدی کے آغاز میں مغربی اور مشرقی تہذیبوں کا بے مثال سنگم بن گیا۔ نہ صرف یہ بنگالی زبان کی نشر و اشاعت کا سب سے بڑا مرکز تھا بلکہ انگریزی، ہندی اور اُردو کی مطبوعات کا بھی اہم گہوارہ تھا۔

ان تماشوں اور ناولوں میں مَیں ایسا محو ہوا کہ ہفتوں سُدھ بُدھ نہ رہی اور نہ بھائی نے حقیقتِ حال پر گفتگو کرنا مناسب سمجھا۔ مگر ایک دن نجیب اشرف ندوی نے کہا کہ مطالعہ میں انتخاب سے کام لینا چاہیے، یہ نہیں کہ جو کتاب ہاتھ لگی پڑھنا شروع کر دیا۔ میں تمھیں امپیریل لائبریری کے ریڈنگ روم لے چلتا ہوں اور اس کے ناظم سے ملا دیتا ہوں، تم انگریزی بے تکلّفی سے سمجھ لیتے ہو۔ بس اس کی نگرانی میں صحیح قسم کی کتابیں ڈھونڈو اور علم کے راستے پر لگو۔

اب یہ ہندوستان کی نیشنل لائبریری اور کوئی ۱۵ لاکھ کتابوں کا مخزن ہے۔ میرے زمانے میں اس میں تین لاکھ کتابیں تھیں اور یہ اس وقت بھی ملک کی سب سے بڑی لائبریری تھی۔ اس کتب خانے کے انکشاف نے میری ذہنی سطح کو یک سر بدل دیا۔ اور سالہا سال وہاں روز حاضری دینے کے لیے میں نے ہر طرح کے جتن کیے۔ اس کے ناظم علی خلیفہ اسد اللہ نے میری بڑی حوصلہ افزائی کی۔ اگر اُن کی توجہ نہ ہوتی تو طالب علم کی حیثیت سے کئی بالانشین عالموں تک میری رسائی ممکن نہ تھی۔

چند مہینے میں نے ایسی بے فکری سے گزار دیے گویا کلکتہ سیر و تفریح اور کتب بینی کے لیے آیا ہوں۔ اتنے میں ایک دن بھائی نے سمجھایا کہ میری طرح تمھیں بھی روزی کمانے کا طریقہ سوچنا ہوگا۔ یہ نہ سمجھو کہ والد سے کوئی مدد ملے گی اور یا عبداللہ مختار کچھ بھیجے گا۔ کلکتہ سے ہندی کے کئی رسالے اور اخبار نکلتے ہیں، اُن سے رابطہ پیدا کرو۔ پہلے بھی ہندی میں چند مضمون شائع کر چکے ہو۔ اس کی مشق بڑھاؤ۔ ان سے کچھ معاوضہ مل جائے گا اور کیا عجب کہ آگے چل کر ان میں کوئی ملازم رکھ لے۔ اگر ایسا ہو گیا تو اگلے سال کسی کالج میں داخلہ لے سکو گے۔

بھائی کی آمدنی قلیل تھی اور والد نے جو روپے دیے تھے وہ کب تک چلتے۔ چنانچہ میں نے ہندی رسالوں اور اخباروں کے دفتروں کا گشت شروع کر دیا۔ ہندی سے مسلمانوں کی دُوری کا یہ حال تھا کہ پُرانے وقتوں کے چند شاعروں کے بعد دورِ جدید میں اس کی نثر کو تو کسی نے منھ نہ لگایا تھا۔ چنانچہ جب میں اپنے مطبوعہ مضامین کے تراشے اور غیر مطبوعہ مضامین کے مُسودے لے کر پہنچا تو سب نے میری آؤ بھگت کی۔ ذہن رسا اور قلم رواں تھا۔ مہینے میں بے تکان چند

مضمون گھسیٹ کر یہاں وہاں چھپوا دیتا تاکہ نام چل نکلے۔

ہندی کا سب سے مقبول روزنامہ "وشوامتر" اور سب سے مقتدر ماہنامہ "وشال بھارت" کلکتہ سے شائع ہوتے تھے۔ یہ رسالہ رام انند چٹرجی کی ملکیت تھی جو انگریزی ماہنامہ "ماڈرن ریویو" اور بنگالی رسالہ "پرواسی" کے ایڈیٹر کی حیثیت سے بڑی شہرت کے مالک تھے۔ مدّتوں تینوں زبانوں میں ان رسالوں کا سکّہ چلتا رہا اور ان کی صوری و معنوی خوبیوں کی دُھوم رہی۔ "وشال بھارت" کے مدیر پنڈت بنارسی داس چترویدی ہندو مسلم اتحاد کے مخلص حامی اور کہنہ مشق صحافی تھے۔ اور سرکلر روڈ کی ایک عمارت میں ان رسالوں کے دفتر تھے اور اسی کے پچھلے حصّے میں پنڈت چترویدی رہتے تھے۔ منشی پریم چند اور پنڈت سندر لال کلکتہ میں انھیں کے یہاں ٹھہرتے تھے۔ ان بزرگوں سے جو تعلق قائم ہوا ہمیشہ باقی رہا اور اس کی یاد مجھے اب تک عزیز ہے۔ ہندی میں پنڈت سندر لال نے الہ آباد سے "وشوانی" نامی ماہنامہ نکالا اور جب ۱۹۴۲ء کی سیاسی تحریک میں وہ اسیر زنداں ہوئے تو تین سال تک امرت سر کے کالج کی ملازمت کے دوران میں اس کی اعزازی ادارت کے فرائض انجام دیتا رہا۔ حکومت کے عتاب اور مالی مشکلات کے باوجود اس اخلاقی فرض کو میں نے جس محنت سے ادا کیا، وہ میری زندگی کا روشن باب ہے۔

اس ادارے سے تعارف نے میرے لیے علم و دانش کا ایک نیا راستہ نکالا۔ ٹیگور کی نگارشات کی اشاعت کا اہتمام یہیں سے ہوتا تھا اور GREATER INDIA SOCIETY کی مطبوعات بھی یہیں سے چھپتی تھیں۔ چوٹی کے بنگالی ادیبوں کا مجمع وہاں رہتا تھا جس میں شاید ہی کوئی مسلمان ہو۔ البتہ جسیم الدین اور غلام مصطفےٰ کوی کی نظمیں "پرواسی" میں نظر آجاتی تھیں۔ یہ قاضی نذرالاسلام کی شہرت کے عروج کا زمانہ تھا لیکن وہ اس گروہ میں مقبول نہ تھے۔

اوپر جس سوسائٹی کا نام آیا وہ اس مقصد سے قائم کی گئی تھی کہ قدیم ہند کے دائرۂ اثر کی تحقیق کرے۔ چنانچہ اس نے اپنی مطبوعات میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ زمانۂ قدیم میں ہندو تہذیب کا دامن بحرِ ہند کے اطراف میں پھیلا ہوا تھا۔ اس تصوّر کا اثر پنڈت نہرو نے

شدّ و مد سے قبول کیا۔ جو ان کی کتاب ڈسکوری آف انڈیا میں ظاہر ہوا ہے اور آزادی کے بعد حکومت ہند کی خارجہ پالیسی کا بنیادی اصول یہی تصوّر قرار پایا۔ میں نے اس موضوع پر اپنے ایک مضمون میں جو کراچی کے انگریزی رسالے ٹیمپو (TEMPO) میں دی کانسپٹ آف گریٹر انڈیا (THE CONCEPT OF GREATER INDIA) کے نام سے شائع ہوا تھا، مفصّل بحث کی ہے۔

پنڈت چترویدی جیسے روشن ضمیر اور روادار آدمی مجھے دنیا میں کم ملے۔ وہ خود انارکزم کے نظریے کے قائل تھے اور کروپاٹکن و بیکنن کی تعلیم کی تبلیغ میں سرگرم رہتے تھے۔ بایں ہمہ ہر بے انصافی کے خلاف قلم اٹھانے میں انھیں باک نہ ہوتا تھا۔ اور قومی اتحاد کے داعی تو تھے ہی۔ ان کی انسانی اور اخلاقی قدروں نے مجھ پر ایسا اثر کیا کہ اکثر ان کی طرف جانے لگا۔ چند ملاقاتوں کے بعد انھوں نے کہا، تم ہندی اچھی لکھتے ہو، لیکن اپنی زبان کو سنسکرت سے دور اور اردو سے قریب رکھو۔ پھر یہ کہ خواہ مخواہ مضمون نگاری نہ کرو۔ جب تم مطالعے اور مشاہدے سے خود کچھ حاصل کر کے لکھو گے تو بات بنے گی۔ ذرا سی توجہ سے تم بنگالی سیکھ سکتے ہو۔ اس سے تمھیں فائدہ ہوگا، کیونکہ ہندوستانی زبانوں میں اس کا ادب سب سے آگے ہے۔

یہ نصیحت میں نے گرہ سے ایسی باندھی کہ تقریباً دو سال تک یک سوئی سے پڑھتا اور گرد و پیش کو دیکھتا رہا۔ قلم کو بے کار زحمت نہ دی۔ بعد میں "وشال بھارت" میں میں نے "تیموریہ گھرانے کی آخری جھلک"۔ "عظمت اللہ خاں کی شاعری"۔ "برنارڈ شا کے ڈراموں میں انگریز کی کردار نگاری"۔ "آسکر وائلڈ کا سوشلزم" وغیرہ لکھے۔ جن کی ہندی دانوں میں تعریف ہوئی۔ آگے چل کر میرا شمار صاحب طرز نثر نگاروں میں ہونے لگا۔ چنانچہ پنڈت بنارسی داس کی کسی کتاب میں میری ذات اور اسلوب پر ایک مضمون شامل ہے۔

نومبر کے مہینے میں انھوں نے مجھے بتایا کہ روزنامہ "وشوامتر" میں جونیئر سب ایڈیٹر کی جگہ خالی ہے۔ اس کے مالک بابو مول چند اگروال کا رعب ہندوستان کی اخباری دنیا پر چھایا ہوا تھا۔ ان کے روزنامے کے تین ایڈیشن کلکتہ، کانپور اور بمبئی سے نکلتے تھے اور ان پر ہفتہ وار

اور ماہانہ ایڈیشن مستزاد تھے۔ بعد میں انھوں نے انگریزی روزنامہ "ایڈوانس" خرید لیا تھا اور زمانۂ جنگ میں ان کی حیثیت کروڑپتی کی تھی۔ وہ کانگریس کی پالیسی کے طرف دار اور مارواڑی سرمایہ دار طبقے کے ترجمان تھے۔ اخبار کی تجارت کو ان سے بہتر سمجھنے والے کم تھے۔ ان کی ذکاوت اور انتظامی صلاحیت کے سب قائل تھے۔ ہیریسن روڈ کی ایک بڑی کوٹھی میں نیچے چھاپہ خانہ، دوسری منزل پر انتظامی، تیسری پر ادارتی دفاتر اور بالائی منزل پر ان کی قیام گاہ تھی۔ گھر اور دفتر ایک جگہ ہونے کی وجہ سے ہمہ وقت ہر معاملہ اور ہر ملازم پر ان کی نظر رہتی تھی۔

ایک دن ہمت باندھ کر میں ان کے دفتر پہنچا اور چپراسی کے ہاتھ اپنے نام کا پرچہ گزارا۔ جب اندر سے طلبی ہوئی تو ایک بھاری بھرکم آدمی کو روبرو پایا جس نے خندہ پیشانی سے سامنے کی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور کہا کہ آپ کا ذکر میں نے سنا ہے۔ لیکن یہ نہ سوچا تھا کہ آپ اتنے کم عمر ہوں گے۔

جب میں نے عرضِ مدعا کیا تو بابو مول چند چونک پڑے۔ ہندی کیا کسی ہندو اخبار کے شعبۂ ادارت سے کسی مسلمان کا تعلق انہونی بات تھی۔ پھر میں کون اور میری بساط کیا؟ پہلے تو انھوں نے میرا حال پوچھا اور پھر سوال کیا کہ کیا تم انگریزی سے ہندی میں قلم برداشتہ ترجمہ کر سکتے ہو۔ جب میں نے اعتماد سے ہامی بھر لی تو انھوں نے صبح کے انگریزی اخباروں کی تین چار بیرونی اور ملکی خبروں پر نشان لگا کر کہا کہ کونے کی میز پر بیٹھ کر ترجمہ کر ڈالو۔ یہ امتحان میرے لیے آسان تھا اور میں اس سے ذرا دیر میں عہدہ برا ہو گیا۔ میرا خط اتنا پختہ اور صاف تھا اور عبارت اتنی صحیح تھی کہ بابو مول چند کبھی میری شکل دیکھتے اور کبھی اس کاغذ کا معائنہ کرتے۔ پھر انھوں نے کوئی اداریہ میرے سپرد کیا اور کہا اگر ڈکشنری کی ضرورت ہو تو وہاں سے اٹھا لیجیے۔ مجھے اس کی ضرورت پیش نہ آئی اور اداریہ کو بھی بلا دقت منتقل کر دیا۔ اب بابو مول چند کو میری صلاحیت پر شبہ نہ رہا اور انھوں نے مجھ سے فیصلے کے لیے مہلت مانگی۔

بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ یہ فیصلہ اخبار کے ایڈیٹر پنڈت مایا سیوک پاٹھک کی مرضی کے خلاف بابو مول چند نے کیا۔ پاٹھک سخت قسم کے آریہ سماجی تھے، اور مجھے گوارا کرنے میں انھیں دیر لگی۔ پھر یہ بھی سوچنے کی بات ہے کہ جب فرقہ پرستی کو ہوا دینے میں اخباروں کا کھلا ہوا ہاتھ تھا تو

ایک فرقے کا آدمی دوسرے کے اخبار میں کس طرح سما سکتا تھا۔ ۱۹۳۵ء کی بات ہے جب میں نے علی گڑھ میں سنا کہ دہلی کے روزنامہ ہندوستان ٹائمز کو ایک ایسے سب ایڈیٹر کی ضرورت ہے جو ہندی اور اردو پریس کا جائزہ روزانہ کالم میں پیش کر سکے۔ میرے دو تین مضمون اس میں شائع ہو چکے تھے، اور اس کے مینجنگ ایڈیٹر دیوداس گاندھی، مہاتما گاندھی کے فرزند مجھے جانتے تھے۔ جب ڈاکٹر ذاکر حسین نے میری عرضی انھیں دی تو وہ بہت خوش ہوئے اور اقرار کیا کہ مجھ سے بہتر آدمی اس اسامی کے لیے انھیں نہیں ملے گا۔ لیکن اخبار کے مالک سیٹھ برلا نے یہ کہہ کر مجھے مسترد کر دیا کہ کسی مسلمان کی وابستگی انھیں پسند نہیں: ؎

زاہدِ تنگ نظر نے مجھے کافر جانا
اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلماں ہوں میں

چنانچہ خلافِ توقع مجھے اطلاع ملی کہ یکم دسمبر سے میرا تقرر عمل میں آئے گا اور کچھ نہیں تو سب سے کم عمر اخبار نویس کا امتیاز تو مجھے حاصل ہو گیا۔

مجھ پر دو آدمیوں کا خاص احسان ہے۔ بابو مول چند نے مجھے کام اور مولوی عبدالحق نے زندگی میں باضابطگی کا درس دیا۔

ایک ہفتہ تک مجھے طباعت اور پروف پڑھنے کے موٹے موٹے اصول بتلائے گئے۔ پھر ہفتہ بھر اخبار کے پچھلے سال کے فائل کی ورق گردانی کرتا رہا اور ایک رجسٹر سے اصطلاحات کو ذہن نشین کرتا گیا۔ کیونکہ تا ایں دم ہندی میں ان کی کوئی لغت نہ تھی۔ کبھی کبھی خاص خبروں کی سرخی بنانے کی مشق بھی مجھ سے کرائی جاتی تھی۔

اتنے میں کلکتہ میں کانگریس کے سالانہ اجلاس کی تاریخ آ پہنچی جس میں نہرو رپورٹ پیش ہونے والی تھی۔ اس کے ساتھ ہندوستان کی مختلف سیاسی جماعتوں کا کنونشن بھی ہونے والا تھا۔ لبرل فیڈریشن، مسلم لیگ وغیرہ کے سالانہ اجتماع بھی انھیں دنوں ہونے تھے۔ بابو مول چند کو میری تربیت منظور تھی، لہٰذا انھوں نے ایک پریس کارڈ مجھے دیا اور کھادی کے کرتے پر اپنے اخبار کا تعارفی فیتہ چسپاں کر کے ہدایت کی کہ اب دو ہفتے تم روز ان جلسوں میں شرکت کرو اور ہر روز صبح دفتر آ کر مجھے یا ایڈیٹر کو زبانی رپورٹ دیا کرو تاکہ اندازہ ہو کہ تم نے کیا دیکھا اور کیا سنا؟

اس طرح میری سیاسی تعلیم کا آغاز ہوا۔

سیاسی اعتبار سے ہندوستان میں یہ بڑے ذہنی انتشار کا دور تھا۔ اوّل جنگِ عظیم کے بعد گاندھی اور علی برادران کی رہبری میں کانگریس اور خلافت کانفرنس کے جھنڈے تلے سارے ہندو مسلمان جمع ہو گئے تھے۔ بچّے بچّے کی زبان پر قومی آزادی اور قومی اتحّاد کے نعرے تھے۔ برطانوی حکومت سے ترکِ موالات اور خلافت کے تحفظ کی تحریکوں نے چند سال میں ایسا زور باندھا کہ استعمار کی چولیں ڈھیلی پڑ گئیں۔ زندگی کے ہر شعبے کی طرح ادب پر بھی اس کا گہرا اثر پڑا۔ لیکن جب اتاترک نے ترکی میں خلافت کو ختم کیا اور عوام کو بے قابو ہوتے دیکھ کر گاندھی جی نے یک بیک ترکِ موالات کی تحریک کا دم گھونٹ دیا تو پہلے ہزیمت و انتشار اور بعد میں ہندو مسلم نفاق کا لاوا پھوٹ بڑا۔ آریہ سماج اور ہندو مہا سبھا نے شُدّھی اور سنگھٹن کا ذکر چھیڑا تو مسلمانوں نے تبلیغ اور تنظیم کی صدا بلند کی۔ جگہ جگہ مسجدوں کے آگے باجے بجنے اور سر پھوٹنے لگے۔ کہیں گاؤکشی پر تلواریں چلنے لگیں۔ وہی صحافی و شاعر جو ابھی اتحّاد کی تلقین کر رہے تھے، اب عوام کو عداوت پر اُبھارنے لگے۔ مسلمانوں کی سیاست خلافت کمیٹی کے مجاوروں کے ہاتھ آ گئی اور مسلم لیگ میں ایسی کھنڈت پڑی کہ ایک کے رہنما جناح صاحب اور دوسرے کے سرغنہ انگریزوں کے مدّاح میاں محمد شفیع قرار پائے۔ گاندھی نے کانگریس سے روٹھ کر احمد آباد کے آشرم میں خلوت نشینی اختیار کر لی۔ اس پر بنگال کے مشہور لیڈر سی۔ آر۔ داس اور پنڈت موتی لال نہرو کا قبضہ ہو گیا جنھوں نے کونسلوں میں شرکت اور آئینی اصلاحات کا مطالبہ کیا۔ پنڈت سندر لال نے بطورِ احتجاج کانگریس کے جنرل سکریٹری کے عہدے سے استعفیٰ دے دیا۔ اور سی۔ آر۔ داس کے ناگہانی انتقال کی وجہ سے پنڈت موتی لال نہرو کانگریس کے کرتا دھرتا بن بیٹھے۔

برطانیہ کے لیے فضا ایسی سازگار ہوئی کہ اس نے ۱۹۳۷ء میں سر جان سائمن کی سرکردگی میں ایک کمیشن قایم کیا جس کا مقصد یہ معلوم کرنا تھا کہ ہندوستان مزید کتنی خود مختاری کا مستحق ہے۔ کیونکہ اس کے ارکان میں ملکی عناصر شامل نہ تھے، سب نے اس کا بائیکاٹ کیا۔ اس موقع پر رائے پور میں جو احتجاج منایا گیا، اس میں شرکت کی پاداش میں میرے اسکول کے اینگلو انڈین ہیڈ ماسٹر

مسٹر ٹامپے نے میری خوب گوشمالی کی۔ جب سائمن کمیشن اپنے دورے کے بعد انگلستان لوٹ کر سفارشات مرتب کرنے لگا تو کانگریس نے اپنے آئینی مطالبات مرتب کرنے کا تہیہ کر لیا اور اس غرض سے پنڈت موتی لال نہرو کی صدارت میں ایک کمیٹی مقرر کی۔ اس کے سکریٹری شعیب قریشی تھے۔ کلکتہ میں کانگریس نیز کل پارٹی کنونشن میں اسی رپورٹ پر غور ہونا تھا۔

اب تک دو قومی نظریہ سامنے نہ آیا تھا اور سیاسی بحث ہندو اکثریت اور مسلم اقلیت کے دائرے میں ہو رہی تھی۔ افسوس کہ مسلمانوں سے اپنے سوشل اور تہذیبی تعلقات کے باوجود پنڈت موتی لال نہرو نے کسی سیاسی رواداری کا ثبوت نہ دیا اور مسلم مندوبین کے معقول مطالبات کو مسترد کر دیا۔ کنونشن کے اجلاس میں جس کی صدارت ان کے ہم نوا ڈاکٹر انصاری کر رہے تھے، یہی رویّہ اختیار کیا گیا۔ بس وہیں مولانا محمد علی، شعیب قریشی وغیرہ نے کانگریس سے اپنی علیحدگی کا اعلان کر دیا۔ اس موقع پر مولانا محمد علی نے جو ولولہ انگیز تقریر کی تھی، وہ انھیں کا حصّہ تھا کیونکہ انگریزی میں اُن سے، اور اردو میں مولانا آزاد سے بہتر مقرّر پھر سننے میں نہیں آیا۔

یہ بھی تاریخ کی ستم ظریفی ہے کہ پنڈت موتی لال نہرو نے ہندو مسلم آئینی مصالحت کے جس امکان کو شدید صدمہ پہنچایا تھا وہ ان کے فرزند جواہر لال نہرو نے ہمیشہ کے لیے یوں ختم کر دیا کہ انھوں نے ۱۹۴۶ء میں برطانوی کابینہ مشن کے مصالحتی فارمولا کو رد کر کے تقسیم کی راہ ہموار کر دی۔ یہ ایک تلخ حقیقت ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

میرا ناپختہ ذہن ان آئینی نکتوں کو سمجھنے سے قاصر تھا۔ مجھ پر جو دیرپا اثر رہ گیا وہ سُبھاش چندر بوس کی شخصیت کا تھا، جو اپنی جواں سالی کے باوجود سیاسی افق پر چھا گیا۔ جب کانگریس کے اجلاس میں نہرو رپورٹ منظوری کے لیے پیش ہوئی تو اس کی تمہید میں کہا گیا تھا کہ نصب العین برطانوی سلطنت میں ڈومینین کی حیثیت کا حصول ہے۔ سُبھاش چندر بوس نے اس میں ترمیم کی کہ نصب العین مکمّل آزادی ہے اور اپنی تقریر میں برطانوی استبداد اور مظالم کا ایسا قلع قمع کیا کہ سب انگشت بدنداں رہ گئے اور مولانا محمد علی نے فرطِ جوش میں ان کی پیشانی چوم لی۔ جواہر لال نہرو نے مصلحت شناسی سے کام لیا اور غیر جانب داری

اختیار کرلی۔ جب رائے شماری کا وقت آیا تو وہ گنتی کے کام پر مقرّر کیے گئے۔ اس کا یا پلٹ پر سرِعام ان کی بڑی رسوائی ہوئی اور صدر جلسہ (ان کے والد ماجد) سے انھیں گلہ کرتے سنا کہ بعض لوگ انھیں بُرا بھلا کہہ رہے ہیں۔ بہرصورت نہرو رپورٹ منظور ہوگئی اور کانگریس دائیں بائیں حصّوں میں بٹ گئی۔ آگے چل کر جواہر لال نہرو کے تذبذب کی وجہ سے سبھاش چندر بوس کے اخراج کے ساتھ گاندھی اور پٹیل کا رجعت پرور تسلّط اس پر مضبوط ہوگیا۔ سی۔ آر داس، سُبھاش چندر بوس اور راج گوپال اچاریہ تین ایسے وسیع النظر لیڈر تھے جو مسلمانوں سے مصالحت کی راہ نکال سکتے تھے۔ لیکن سی۔ آر۔ داس کی اچانک موت اور باقی دونوں کی کانگریس سے بے تعلّقی کے بعد اس کی کوئی صورت نہ رہی۔

البرٹ ہال میں جناح صاحب کی صدارت میں مسلم لیگ کا جلسہ ہوا۔ اس وقت لیگ عوامی جماعت نہ تھی اور میاں محمد شفیع کی شورہ پشتی کی وجہ سے یہ اور بھی کمزور ہوگئی تھی۔ اس کے سکریٹری کے فرائض ڈاکٹر سیف الدین کچلو انجام دے رہے تھے۔ امرت سر کے دورانِ قیام مجھے اکثر ان سے ملنے کا اتفاق ہوتا رہا اور ان کے خلوص نے مجھ پر گہرا اثر چھوڑا۔ وہ دوبارہ کانگریس میں شامل ہوچکے تھے۔ لیکن تنظیم و مسلم لیگ سے ان کی وابستگی کو پنڈت نہرو نے معاف نہ کیا اور تقسیم کے بعد میں نے انھیں دہلی میں بیماری اور عُسرت کے دن کاٹتے دیکھا۔ اس کے باوجود ڈاکٹر کچلو کی عالی ظرفی کا یہ حال تھا کہ جب انھیں روس سے لینن امن انعام کا ایک لاکھ روپیہ ملا تو یہ پوری رقم انھوں نے کارِ خیر میں تقسیم کردی۔

یوں تو کلکتہ پر سیاست کا سرسام طاری رہتا تھا، لیکن ان دنوں تو اس نے ایک قسم کے مالی خولیا کی شکل اختیار کرلی تھی۔ ہر کس و ناکس کوئی جھنڈا اٹھائے جلسہ جلوس رچا رہا تھا اور فضا نعروں کے شور سے لرز رہی تھی۔ جوش و خروش کا یہ حال تھا کہ میں نے چراغ حسن حسرت کو ایک دن سڑک پر للکارتے ہوئے سُنا ؎

وہ سامنے ہے حرّیت کا راستہ بڑھے چلو، بڑھے چلو

اپنی بڑی بڑی سُرخ آنکھوں سے اوپر کسی شے کو گھورتے اور انگلی سے اس طرف اشارا کرتے ہوئے وہ اس زور سے یہ بول الاپ رہے تھے کہ ایک لمحے کے لیے مجھے مغالطہ ہوا کہ حریت نامی کوئی

عورت منڈیر پر بیٹھی ہوئی ہے۔ لیکن حرّیت کا صحیح مفہوم مجھے دوسرے دن معلوم ہوا جب میں ٹہلتے ہوئے البرٹ ہال کی طرف جا نکلا۔ اب وہاں مزدور کسان پارٹی کا جلسہ ہو رہا تھا۔ اس وقت تک کمیونزم کا ذکر بھی جرم تھا، اس کی پارٹی کی تنظیم کا سوال ہی کیا تھا۔ انقلاب کے بعد کئی ہندوستانی نوجوان سوویت روس چلے گئے اور ان میں سے کچھ اس کا پیغام سُنانے کے لیے لوٹ آئے۔ ان میں سے چار یعنی ڈانگے، نمبکر، مظفر احمد اور شوکت عثمانی کو پارٹی بنانے کی سازش کے الزام میں کانپور میں ۱۹۲۴ء میں تین تین سال قید کی سزا ملی تھی۔ جیل سے رہا ہو کر اپنے ہم خیالوں کے ساتھ انھوں نے مزدور کسان پارٹی بنائی اور اس کا جلسہ کلکتہ میں کیا۔ اشتراکیت کی جیسی تفسیر میں نے یہاں سنی، اس نے مجھے فکر و مطالعہ کے ایک نئے راستے پر ڈال دیا۔ اسی موقع پر میرا تعارف سیّد جمال بخاری سے ہوا جو مدّتوں سے لاڑکانہ میں گوشہ نشینی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ پچھلے سال میری علالت کی خبر سن کر جب عیادت کو آئے تو یہ دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی کہ عمر کی آٹھویں دہائی میں بھی ان کی آنکھوں میں وہی پرانی چمک اور آواز میں وہی کڑک باقی ہے۔ اپنے ساتھیوں سمیت سیّد جمال بخاری نے حرّیت کا جو ترانہ الاپا وہ کچھ اس قسم کا تھا:

نقّارے پر ڈنکا لگا، تو کُدال اپنی اُٹھا
شروع ہو گئی ہے حرّیت کی جنگ تو تلوار اپنی سنبھال

میں نے غور کیا کہ یہ حسرت صاحب والی حرّیت نہیں تھی، بلکہ اس کا تعلق کُدال اور تلوار جیسے آہنی حربوں سے تھا۔

اب میں دفتر میں ہر روز صبح سے شام تک حاضری دینے لگا۔ ٹیلکس کا رواج ابھی نہیں ہوا تھا۔ خبر رساں ایجنسی کے ہرکارے وقفے وقفے سے تازہ انگریزی خبروں کے لفافے لے کر آتے رہتے تھے۔ اور سینئر سب ایڈیٹر ان میں سے چُن چُن کر کاغذ مجھے دیتا رہتا اور میں بڑی پھرتی سے ان کا ترجمہ کرتا اور پھر پُروفوں کے بنڈل دیکھ ڈالتا۔ بلا مبالغہ میرے کام کی رفتار اتنی تیز اور صحیح تھی کہ چند مہینوں میں سارا عملہ دنگ رہ گیا اور پنڈت پاٹھک بھی میری تعریف کرنے لگے۔ پھر تو

خبروں کا انتخاب اور ان کی سرخی کا تعین اور صفحہ کی ترتیب بھی بلا تامّل میرے سپرد کر دی گئی۔ گرمی کی تعطیل کے بعد جب داخلے شروع ہوئے تو میں نے ودّیا ساگر کالج میں نام لکھوا لیا کہ وہ دفتر سے بہت قریب تھا۔ گو کہ لوگ رات کی شفٹ سے گریز کرتے تھے لیکن امپیریل لائبریری کی خاطر میں نے اسے ترجیح دی۔ میرا معمول یہ ہو گیا کہ آٹھ بجے رات سے صبح ڈھائی تین بجے تک دفتر میں کام کرتا، وہاں سے آدھ میل چل کر گھر لوٹتا اور سو رہتا۔ دن کے دس گیارہ بجے تیار ہو کر پڑوس میں رنگون ریستوراں جا بیٹھتا۔ کچھ کھا پی کر ٹرام پر بیٹھ کر دوپہر تک لائبریری جا پہنچتا اور چار بجے شام تک باقاعدگی سے پڑھتا اور نوٹ تیار کرتا۔ وہاں سے سیر کرتا ہوا کالج آتا اور وقت گزار کر دفتر کی راہ لیتا۔ کالج میں حاضری اور خانہ پُری کے لیے جاتا تھا کیونکہ کلاس میں بیٹھ کر نہ وہاں اور نہ علی گڑھ میں میں نے کچھ سیکھا۔ ذہنی اعتبار سے کلاس سے میں ہمیشہ آگے رہا اور اگر کسی دانش گاہ سے کچھ حاصل کیا تو وہ بعض اُستادوں کی محبّت کا فیض تھا اور اس سے زیادہ کچھ نہیں۔

اگلے سال حسرت صاحب لاہور چلے گئے۔ سلیم اللہ فہمی بنگال سول سروس میں لے لیے گئے اور نجیب اشرف ندوی کا تقرر تاریخ کے پروفیسر کی حیثیت سے بمبئی کے اندھیری کالج میں ہو گیا۔ اگلے برس شمیم صاحب بھی روزنامہ انقلاب کی دعوت پر لاہور چلتے بنے، اور میں تن تنہا رہ گیا۔ لیکن میرا وقت ایسی مصروفیت میں گزرتا رہا اور خیال و فکر کی اتنی وادیاں نظر آئیں کہ مجھے کوئی غم نہ ہوا۔ میری بے نیازی کا یہ حال تھا کہ دو ڈھائی سال تک بازار سے تکیہ خریدنے کا بھی ہوش نہ رہا، تا وقتیکہ سامان باندھتے وقت میرے سرہانے سے بھائی نے وہ لغت نہ کھینچ لی جو میرے دردِ سر کا باعث بنی ہوئی تھی۔ شاید اسی کا اثر تھا کہ بعد میں مختلف موقعوں پر لُغت نویسی سے مجھے واسطہ پڑا۔

۱۹۲۹ء میں کمیونسٹ خیال کے متعدد افراد کو گرفتار کر کے حکومت نے وہ حماقت کی جو "میرٹھ سازش" کے نام سے مشہور ہے۔ یہ مقدمہ سالہا سال تک چلتا رہا اور ملزموں نے اپنی صفائی میں جو بیان دیے ان کی تفصیل اخباروں میں چھپتی رہی اور ملک میں پہلی بار اشتراکیت کا پرچار ہوا۔ ملکی زبانوں میں تو نہیں، البتہ انگریزی میں اشتراکی ادب چوری چھپے دستیاب ہونے لگا۔

اس قسم کا ادب بیرونِ ملک سے خفیہ طریقوں سے درآمد کیا جاتا تھا اور کچھ یہاں بھی چھپنے لگا۔ اس طرح میرا مطالعہ جو برٹرینڈ رسل، برنارڈ شا وغیرہ کی حد تک پہنچ چکا تھا، اُس نئی سمت میں مائل ہو گیا۔

مجھے محسوس ہوا کہ فرقہ وارانہ مسئلہ اتنا سطحی نہ تھا جتنا میں بچپن سے سمجھتا آیا تھا۔ اس کی جڑیں ہزار سالہ تاریخ کی تہ میں پیوست تھیں اور اس میں اختلاف و اتحاد کے کئی پہلو تھے۔ لیکن برطانوی حکومت نے اختلاف کو اتنا پرچایا اور اپنے طفیلی تودو لیتے طبقے میں اقتدار کی ہوس کو یوں تیز کیا کہ ہندو اور مسلمان ان مشترکہ قدروں کو مسمار کرنے لگے جن کی پرورش صدیوں میں ہوئی تھی۔ اس کی بڑی ذمہ داری ہندو سماج پر تھی جو اکثریت پر مشتمل تھا اور ساتھ ہی ایک ایسی دیوار میں بند تھا جس کے اندر پڑوسی جھانک بھی نہ سکتے تھے۔ شادی بیاہ تو دور کی بات ہے۔ ساتھ کھانا یا رہنا بھی چھوا چھوت اور ذات پات کی پابندیوں کی وجہ سے ناممکن تھا۔ اِن اُمور کے باوجود اس زمانے کا تقاضہ یہی تھا کہ قومی آزادی کی خاطر قومی اتحاد کو برقرار رکھا جائے۔

اس تصویر کا ایک نیا رخ نظر آیا۔ بظاہر یہی گمان ہوتا تھا کہ اختلاف کی اصل وجہ مذہبی، تہذیبی اور لسانی ہے۔ لیکن میں نے غور کیا کہ ایک اور بنیادی اختلاف معاشرے میں ہے جس کی نوعیت اقتصادی ہے۔ جب میں آسمان بوس کوٹھیوں کے مکینوں کا مقابلہ فٹ پاتھ اور جھونپڑیوں میں سسکتے ہوئے آدمیوں سے کرتا تو یہ لگتا کہ ان میں بُعد المشرقین ہے۔ اشتراکی نقطۂ نظر سے یہ مقابلہ مالکوں اور غلاموں کا تھا۔ لیکن بعد میں مجھے البرت کامو (نوبل انعام یافتہ فرانسیسی ناول نگار) کی تشریح میں زیادہ صحت نظر آئی کہ انسان تین گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ مالک۔ غلام اور باغی۔

میں نے فیصلہ کیا کہ اپنے قلم کو انسانی قدروں کی خدمت کے لیے وقف کر دوں گا۔

۱۹۳۱ء میں گاندھی جی پھر عملی سیاست کے میدان میں کود پڑے۔ ان کی ہدایت پر کانگریس نے سول نافرمانی کی تحریک شروع کر دی تاکہ برطانیہ کو آئینی مراعات کے لیے مجبور کیا جائے۔ انجام کار لندن میں راؤنڈ ٹیبل کانفرنس ہوئی، اور ۱۹۳۵ء میں پارلیمنٹ

نے وہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ منظور کیا جس کے تحت ۱۹۴۷ء کی آزادی بلکہ اس کے بعد تک حکومت کا کاروبار چلتا رہا۔

گاندھی کی پیروی میں لاکھوں آدمی جیل چلے گئے اور قومی اخباروں کی گرم گفتاری کو دبانے کے لیے حکومت نے ایک آرڈیننس جاری کر دیا۔ احتجاج کے طور پر انھوں نے غیر معینہ مدّت کے لیے اشاعت موقوف کر دی۔ چنانچہ بابو مُول چند اگروال نے سارے عملے کے ساتھ مجھے بھی دو ماہ کی تنخواہ کا چیک دے کر رخصت کر دیا۔

اب جو دلچسپ واقعہ پیش آیا اُس کا ذکر کرتا چلوں۔ دوپہر کے وقت میں ہیریسن روڈ کے الہ آباد بنک چیک بھنانے پہنچا اور ڈیڑھ سو روپے کے نوٹ ایک پرانے لفافے میں کُرتے کی جیب میں رکھ کر سڑک پر چل پڑا۔ اتنے میں کسی نے مجھے دھکا دیا اور جب تک میں سنبھلوں، جیب سے وہ لفافہ غائب تھا اور جیب کترا تیزی سے پاس کی تنگ گلی میں بھاگ رہا تھا۔ میں چور چور پکارتا اس کے پیچھے لپکا۔ لیکن وہ آنکھوں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ کئی راہ گیر جمع ہو گئے اور نصیحت کرنے لگے کہ کیسے نادان ہو کیا تمھیں نہیں معلوم کہ بنکوں کے باہر گرہ کٹ تاک میں کھڑے رہتے ہیں۔ کرتے کی جیب میں کھلے عام روپے رکھنے کا یہی نتیجہ ہوتا ہے۔

ذرا دیر میں مَیں بیکار اور قلاش ہو گیا اور سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کروں، اسی فکر میں چلتا گیا کہ چت پور روڈ کے موڑ پر پھلوں کی دوکان نظر آئی جس میں سیّد بزرگ شاہ جلوہ گر تھے۔ یہ بزرگ صوبۂ سرحد کے رہنے والے تھے اور در پردہ جرائم پیشہ گروہوں کے روحانی پیشوا تھے۔ لیکن بظاہر سیاسی و اخباری کارکنوں کے ہمدرد مشہور تھے۔ ان سے میری صاحب سلامت تھی۔ جب میں نے اس حادثے کی تفصیل سُنائی تو وہ ہنسے اور کہا، فکر نہ کیجیے گرہ کٹوں کا چودھری پنّا سردار میرا ملاقاتی ہے۔ شام کو میں آپ کو اُس کے پاس لے چلوں گا۔ انشاءاللہ رقم برآمد ہو جائے گی۔ چنانچہ شام کو میں رکشا پر شاہ صاحب کے ساتھ مچھوا بازار گیا۔ سڑک سے پیدل پُر پیچ گلیوں میں ہوتے ہوئے کسی پُراسرار گھر تک پہنچے۔ چوکیدار سے شاہ صاحب نے کچھ سرگوشی کی تو وہ اندر سے کسی کو بلا لایا۔ بڑی تعظیم سے ہمیں وہ اندر لے گیا۔ جہاں ایک

رعب دار شخص لنگی باندھے پگڑی اوڑھے مسند پر بیٹھا چند حواریوں سے باتیں کر رہا تھا۔ بڑھ کر اس نے شاہ صاحب کو سلام کیا اور آہستہ آہستہ اُن سے باتیں کرتا رہا۔ مجھ سے مخاطب ہو کر پوچھا کہ کس وقت اور کس جگہ یہ واقعہ پیش آیا اور کیا اس شخص کی شکل آپ کو یاد ہے۔ تفصیل سناتے وقت مجھے اتنا یاد آیا کہ چور کے گل مچھے تھے۔ پنّا سردار نے کسی کو حکم دیا کہ دیکھو وہ کون تھا اور ڈیوٹی سے لوٹ آیا یا نہیں، اور خزانچی جی کے پاس جو کمائی جمع کی ہے اُس میں وہ لفافہ ہے یا نہیں؟ میں حق حیران یہ تماشہ دیکھتا اور اس گفتگو کو سُن رہا تھا کہ ایک کوتاہ قد، سیاہ فام جسے خزانچی سمجھنا چاہیے میری گم شدہ متاع ہاتھوں میں لیے آیا۔۔۔۔۔ اور لفافہ پنّا سردار کے آگے رکھ گیا جس نے شاہ صاحب کے توسّط سے لوٹاتے ہوئے مجھ سے کہا۔

"بابو جی، رقم گن لیجیے۔ یہ نہ سوچیے کہ پنّا سردار کے آدمی دھوکا فریب کرتے ہیں۔" میں خوشی کے مارے نہال ہو گیا اور پنّا سردار کے چیلوں کے ہاتھ کی صفائی اور ایمان داری کی کھلے دل سے تعریف کی۔ واپسی پر شاہ صاحب نے ان لوگوں کی تنظیم کی ایسی کیفیت سنائی کہ میں دنگ رہ گیا۔ جب میں نے اُن کا ہزار ہزار شکریہ ادا کیا تو وہ بولے کہ آیندہ احتیاط کرنا اور ان باتوں کا ذکر نہ کرنا۔

میرے ایک شناسا میرزا حاتم بیگ دہلی کے جوہری مدّتوں سے کلکتہ میں کاروبار کرتے تھے۔ جب انھیں میری بیکاری کا علم ہوا تو ازراہِ ہمدردی کہنے لگے کہ میرے ساتھ کام کرو تو دلدّر دور ہو جائیں گے۔ میں انگریزی نہیں جانتا۔ اس لیے انگریز جوہریوں کی دوکانوں میں مال نہیں لے جاتا۔ اگر تم جواہرات کے بارے میں موٹی موٹی باتیں سیکھ لو اور میرے ساتھ ان دوکانوں تک چلا کرو تو خاصی یافت ہو جائے گی۔ چنانچہ کچھ وقت میں نے میرزا حاتم بیگ کے ساتھ جوہر شناسی میں گزارا اور کھوٹے کھرے کی جو پہچان ہو گئی، وہ اب تک نہیں بھولا۔

اتنے میں اخبار کے دفتر سے اطلاع آئی کہ حکومت نے پریس آرڈیننس منسوخ کر دیا، اور اس کی اشاعت شروع ہونے والی ہے۔ لہٰذا فوراً کام پر واپس آجاؤ۔ بس ہیرے جواہرات کے کاروبار کو چھوڑ کر میں از سرِ نو قلم اور کاغذ کے دھندے سے لگ گیا۔

اوپر مٹیا برج کے ذکر میں میرزا بیدار بخت کا نام آیا جو شہزادہ جواں بخت کے پوتے تھے اور جن سے ملنے کے بعد انھیں دنوں میں نے "تیموریہ گھرانہ کی آخری جھلک" کے عنوان سے ہندی میں ایک مضمون لکھا جس کا بڑا چرچا ہوا۔ اب تک میں نے اردو میں کچھ نہ لکھا تھا، لیکن دوستوں کے تقاضے نے اسے اردو میں منتقل کرنے کا خیال دلایا اور مسودہ اشاعت کے لیے دہلی کے ہفتہ وار "ریاست" کو روانہ کر دیا۔ مضمون چھپنے کے بعد یک بیک سردار دیوان سنگھ مفتوں نے ازراہِ قدردانی مجھے ڈیڑھ سو روپے تنخواہ پر معاون مدیر کی جگہ پیش کی۔ ایک تو تنخواہ دوگنی اور پھر سیاحت کا شوق۔ میں بے جھجک دہلی چل پڑا۔ البتہ اخبار سے استعفیٰ نہ دیا۔ ایک مہینے کی بے تنخواہ چھٹی لی تاکہ بات نہ بنے تو لوٹ سکوں۔ اس زمانے میں ریاست کا بڑا نام تھا اور اس میں کیا شک ہے کہ اردو اخبار نویسی کی تاریخ میں دیوان سنگھ مفتوں کو ہمیشہ عزت سے یاد کیا جائے گا۔ ان کے نائب سردار علی صابری صاحب نہایت خلیق اور شریف آدمی تھے۔ مگر دفتر کے ماحول کو نبھانے کے لیے جس تدبّر اور تحمّل کی ضرورت تھی وہ مجھ میں کہاں سے آتا۔ بنا بریں کہ انتظام درہم برہم اور حسابِ دوستاں دردِ دل کا معاملہ تھا۔ چنانچہ دہلی کے آثارِ قدیمہ کی سیر کر کے بے نیل و مرام کلکتہ لوٹ آیا اور پھر اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔ بابو مول چند اگروال نے ہنس کر کہا "تم طبعاً سیماب صفت ہو، زندگی بھر یہاں سے وہاں پھرتے رہو گے۔ مگر میرے ادارے میں تمھاری جگہ برقرار رہے گی۔"

ایک دن باتوں باتوں میں کالج کے ایک دوست سے معلوم ہوا کہ اس کے گھر قاضی نذرالاسلام کا آنا جانا ہے۔ مجھ میں زبان دانی کی فطری صلاحیت ہے، اور بنگالی پر اتنا عبور ہو چکا تھا کہ بلا دقّت اس کے ادب سے استفادہ کر سکتا تھا۔ جب قاضی نذرالاسلام کو دیکھا تو ان کی شخصیت میں بڑی کشش پائی اور جی چاہا کہ ان کی شاعری کا تعارف اردو میں ہو جائے۔ ۱۹۳۱ء سے لے کر ۱۹۳۶ء تک ان کی منتخب نظموں کے تراجم نگار، ساقی، اردو وغیرہ میں شایع ہوتے رہے جو "پیامِ شباب" میں یک جا کتابی صورت میں متعدد بار چھپ چکے ہیں۔ ان ترجموں نے اس دور کی اردو شاعری کو جس طرح براہِ راست متاثر کیا وہ کھلی

ہوئی حقیقت ہے، اور اس کی شہادت جوشؔ سے لے کر مجازؔ و مخدومؔ تک ملے گی۔

اس طرح میں اردو سے قریب آتا گیا اور علی گڑھ و حیدر آباد کے قیام نے اس تعلق کو زیادہ استوار کر دیا۔ گو کہ ہندی سے میرا ناتا کسی نہ کسی عنوان سے تقسیم ملک تک باقی رہا۔

میری ادبی خدمات کا اصل محور اردو کو ہی سمجھنا چاہیے۔

سول نافرمانی کی تحریک کی صدائے بازگشت ابھی فضا میں گونج رہی تھی اور میرٹھ سے اشتراکیت کے بگل کی آواز آ رہی تھی کہ بھگت سنگھ اور ان کے رفیقوں پر دہشت پسندی کے الزام میں لاہور میں مقدمہ قایم ہوا۔ چرخہ، کدال اور بمباری کی گرج نے مل جل کر مجھے ایسا مسحور کیا کہ میں جوش کے عالم میں کبھی ڈھاکہ ہاؤس میں کسان مزدور پارٹی کے دفتر کے طواف کرتا، کبھی کالج اسکوائر کے چائے خانوں میں بنگالی ساتھیوں سے دہشت پسندی پر بحث کرتا اور پھر "وشوامتر" کی خبروں پر لرزہ خیز سُرخیاں جڑ دیتا۔ میرے فرشتوں کو بھی خبر نہ تھی کہ بھگت سنگھ کا ایک مفرور رفیق کندن لال، نام بدل کر مے میرے ساتھ کام کرنے لگا ہے۔ بابو مول چند درپردہ ایسے لوگوں کی مدد کیا کرتے تھے۔ چند مہینے کام کر کے وہ دفعتاً غائب ہو گیا اور مجھ پر اپنی متانت، کم سخنی اور قوم پرستی کا اثر چھوڑ گیا۔ بعد میں دہلی کے اطراف میں وہ گرفتار ہوا تو کلکتہ میں تفتیش شروع ہوئی۔ میں اپنی گرم گفتاری اور میل جول میں بداحتیاطی کی وجہ سے پولیس کی نظر میں چڑھ چکا تھا، خواہ مخواہ اس کی ملامت کا ہدف بنا۔ اس وقت بنگال آرڈیننس کے تحت مشتبہ سیاسی کارکنوں کی دھر پکڑ شروع ہو چکی تھی۔ میرے بہی خواہوں کے علاوہ بابو مول چند نے بھی مشورہ دیا کہ کچھ عرصے کے لیے کلکتہ سے چلے جاؤ۔

یہ ستمبر ۱۹۳۲ء کی بات ہے جب میں بی۔ اے کے پہلے زینے پر پہنچ چکا تھا۔ بادل ناخواستہ وہاں سے چل پڑا، اور علی گڑھ یونیورسٹی میں داخل ہو گیا۔ بابو مول چند میرے ایسے مہربان تھے کہ ان کے ہفتہ وار اخبار میں باقاعدہ مضمون لکھ کر چالیس روپیہ مہینہ حاصل کرتا جو تعلیمی اخراجات کے لیے کافی تھا اور ہر سال گرمی کی چھٹیوں میں تین مہینے کلکتہ جا کر کام کرتا۔ البتہ میرا تعلق ہفتہ وار اور ماہنامہ سے ہوتا تھا۔

میں علی گڑھ آنے کو تو آ گیا۔ لیکن کلکتہ کو کبھی نہ بھول سکا۔ مجھ بے یار و مددگار طالب علم کو اس نے جو کچھ دیا اس کا حساب میرے لیے مشکل تھا۔ میری عملی اور علمی زندگی کی بنیاد صحیح خطوط پر رکھی گئی تھی۔ مگر یہ پیش گوئی کون کر سکتا تھا کہ اس پر در و دیوار کا انداز کیا ہوگا؟

علم و ادب کی سمتیں

(۳)

میں جس ماحول کا عادی تھا۔ علی گڑھ کی فضا اس سے بالکل مختلف تھی۔ ہوسٹل کی پابندی تو عذابِ جان تھی ہی، سوہانِ روح وہ جمود کی کیفیت تھی جو اس دانش گاہ پر طاری تھی۔ قابل اساتذہ اور ذہین طلبہ کی کمی نہ تھی۔ لیکن ان کی صلاحیت خود اطمینانی کے خول میں اس طرح دب گئی تھی کہ کسی قابلِ ذکر علمی، ثقافتی یا ادبی سرگرمی کا نام سننے میں نہ آتا تھا۔ کھیل کود، سالانہ مشاعرہ اور یونین کے انتخابات پر سب کی توجہ مرکوز رہتی تھی — اور خوش باشی، ظاہر داری و طرّاری کو تہذیب کا جوہر سمجھا جانے لگا تھا۔

ہندوستان کے مسلم اکابر نے دو بار ذہنی بیداری کی مشعل روشن کی تھی۔ ایک تو شہنشاہ اکبر کے زمانے میں مذہبی رواداری کی تحریک جو دینِ الٰہی کہلائی اور دوسری سر سیّد احمد خاں کی کوشش کہ معتزلہ کی روش پر اسلام کی عقلی تفسیر کی جائے۔ دونوں کا بنیادی مقصد یہی تھا کہ مذہب کی دائمی قدروں اور وقت کے تقاضوں کو ہم آہنگ کیا جائے۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ سر سیّد اپنی کوشش میں یک سر ناکام رہے۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ علی گڑھ یونیورسٹی میں اس کا اثر مفقود ہو چکا تھا۔ تعلیم کا مقصد ڈگری کے سہارے سرکاری ملازمت کے حصول

سے زیادہ نہ رہا تھا۔

حُسنِ اتفاق سے آفتاب ہوسٹل میں چند آزاد فکر نو وارد یک جا ہو گئے جو اس صورتِ حال کے خوگر نہ تھے، اور ہم نے داخلہ کے فوراً بعد "پیام" کے نام سے ایک ہفتہ وار اخبار نکال ڈالا۔ کلکتہ کا "پیام" بند ہو چکا تھا، اس لیے یہ نام تجویز کرتے ہوئے مجھے تکلّف نہ ہوا۔ مجلسِ ادارت میں حیات اللہ انصاری، سبطِ حسن، التفات ملیح آبادی اور راقم الحروف شامل تھے۔ پرچہ جلد ہی بند ہو گیا لیکن اس نے وہی کام کیا جو بند پانی میں پتھر گرنے سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد علی گڑھ میں بیداری کا جو دور شروع ہوا وہ برابر جاری رہا، گو وہ فکر و عمل کی مختلف اور متضاد راہوں سے گزرتا رہا۔ نوجوانی کے جوش میں ہم نے کیا کچھ لکھا یہ تو یاد نہیں۔ مگر یہ سچ ہے کہ ہم نے کسی مخصوص سیاسی یا فکری نظریے کی تبلیغ کا بیڑا نہیں اٹھایا تھا۔ ہم صرف یہ چاہتے تھے کہ یونیورسٹی میں آزاد خیالی اور خود تنقیدی کی ضرورت محسوس کی جائے اور اس لحاظ سے ہمارا مقصد پورا ہو گیا۔ اس سرگرمی کی پاداش میں ہمیں دشنام ملا تو تعجب کا مقام نہیں ع

دشنامِ یار طبعِ حزیں پر گراں نہیں

مگر حقیقت یہ ہے کہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر سر راس مسعود نے بڑی فراخ دلی کا ثبوت دیا اور ہم سے کسی معاملے میں باز پرس نہ کی۔ شاید وہ دل میں محسوس کرتے تھے کہ آزادیٔ رائے کے بغیر کوئی دانش گاہ تحقیق اور تنقید کی راہ پر گامزن نہیں ہو سکتی۔

میرے حلقۂ احباب میں اسرار الحق مجاز بھی شامل تھے اور ان سے، علی گڑھ پہنچنے کے فوراً بعد جو یارانہ شروع ہوا وہ آخر تک باقی رہا۔

مجاز کی شاعری اور بادہ نوشی کا آغاز

جب مجاز نے اپنا تعارف مولانا احسن مارہروی کے شاگرد کی حیثیت سے کرایا اور دو تین فرسودہ سی غزلیں سنائیں تو میں نے بلا تکلّف اپنی بیزاری کا اظہار کیا۔ میں نے زبان و بیان پر نکتہ چینی کی بے جا کوشش نہیں کی بلکہ یہ کہا کہ اگر شاعر میں انسانی مسائل کو سمجھنے

سمجھانے کا سلیقہ نہیں تو اسے انسانوں کو مخاطب کرنے کا حق نہیں۔ اس زمانے کے لحاظ سے یہ لہجہ نیا تھا۔ مجاز اس تقریر کو سن کر بہت چونکے اور ان کی حیران کن آنکھوں میں فکر و فہم کی جو کیفیت ظاہر ہوئی، وہ اب تک مجھے یاد ہے۔ پھر وہ مجھ سے ملنے اکثر آفتاب ہوسٹل آنے لگے۔

ہم دونوں شام کو ٹہلنے کے لیے کبھی پرانے قلعے اور کبھی ریلوے اسٹیشن کی طرف نکل جاتے تھے۔ اور میں انھیں اپنے مبلغ علم سے (جو مختصر ہونے کے باوجود ان کے لیے قابلِ توجہ تھا) آگاہ کرتا رہتا تھا۔ اس گفت و شنید کو سال بھر کا عرصہ گذر چکا اور اب مجاز نے پرانے انداز کی غزل سرائی ترک کر دی۔ میں سمجھ رہا تھا کہ ان کی تخلیقی صلاحیت ایک نیا راستہ تلاش کر رہی ہے۔ میرا تخلیقی شعور بھی اسی زمانے میں اردو ادب کی طرف مائل ہو گیا تھا۔ اور میرا پہلا افسانہ "زبانِ بے زبانی" کے نام سے رسالہ "نگار" میں شائع ہو کر اہلِ نظر کی تحسین حاصل کر چکا تھا۔

ایک بار دونوں وقت ملے جب ہم اسٹیشن پہنچے، تو ریل گاڑی کے تیسرے درجے کے ایک ڈبے کے آگے ٹھٹک کر رہ گئے۔ اس میں ایک نوخیز گوجر حسینہ گلے میں چاندی کا کنٹھا اور کان میں پیتل کا بالا ڈالے۔ پھٹے حالوں اس آن بان سے فروکش تھی کہ تماشبین محوِ حیرت اور خوانچہ والے دم بخود تھے۔ ریل چلتے وقت اس نے نگاہِ غلط انداز سے ہمیں خدا حافظ کہا اور ہم اس پر درود و سلام بھیجتے ہوئے واپس چل پڑے۔ میں نے کہا کہ مجاز اسے کہتے ہیں گدڑی کا لعل تم اس پر ایک نظم لکھ ڈالو۔ وہ کہنے لگے کہ میں نے اب تک نظم نہیں لکھی، لیکن کوشش کروں گا۔

چند ہفتے بعد انھوں نے مجھے "رات اور ریل" کا مسودہ دکھایا جو اس نظارے کا مظہر تو نہیں لیکن اس سے متاثر ضرور تھا۔ صحیح معنوں میں مجاز کی شاعری کا آغاز اس طرح ہوا۔

انھیں دنوں ساغر نظامی سے علی گڑھ میں کہیں ملاقات ہو گئی۔ میرٹھ سے اکثر ان کا آنا ہوتا تھا اور اگر وہ یونیورسٹی کی طرف آتے تو مجھے بھی ڈھونڈھ نکالتے تھے۔

۱۹۳۳ء کی بات ہے۔ گرمی کے موسم میں چاند کی چودھویں شام تھی۔ ہوسٹل کے احاطے میں مجاز اور علی اطہر کے ساتھ میں چہل قدمی کر رہا تھا کہ پھاٹک پر یکہ آ کر رکا اور

اس میں سے ساغر نظامی برآمد ہوئے۔ میں نے مجاز اور اطہر کا تعارف کرایا، تو کہنے لگے کہ میں نے آپ لوگوں کی ضیافت کا انتظام کیا ہے۔ کباب، پراٹھا، مُرغ، غرض کہ بہت سامان ہے۔ چلیے قلعے کی طرف جشن منائیں۔ اس اذن پر ہم سب نے لبیک کہا اور یکّہ پر سوار قلعے کی طرف چل پڑے۔ جہاں گوشۂ خلوت ملا، وہیں آسن جما دیا۔ ساغر کے توشہ دان میں بھانت بھانت کا کھاجا تو تھا ہی، ایک طرف برف کی سِل میں بیئر کی بوتلیں بھی لگی ہوئی تھیں۔

اس سے قبل میں چند بار بیئر پی چکا تھا، گو اس کا مزا نہ پہلے پسند آیا، نہ بعد میں ع

مزا بھی تلخ ہے اور بو بھی خوش گوار نہیں

لیکن مجاز اس کے رمز سے قطعاً ناواقف تھے۔ اب جو چاندنی چھٹکی اور ساغر کے ساتھ وہ بھی لہک لہک کر شعر گانے لگے تو بیئر کا دور شروع ہوا۔ بیئر میں نشہ برائے نام ہوتا ہے۔ یوں وقت اور مزاج کی بات ہے۔ چنانچہ جب آدھی رات کو چلنے کے لیے کھڑے ہوئے تو میاں مجاز پر مستی کا غلبہ ہو چکا تھا۔ سہارا دے کر ہم نے انھیں یکّہ پر لادا اور ہماری تاکید کے باوجود وہ ببانگِ دہل اپنا کلام الاپتے رہے۔ اتنے میں آفتاب ہوسٹل آگیا اور ساغر صاحب چلتے بنے۔ صلاح ٹھہری کہ مجاز رات کو علی اطہر کے کمرے میں سو جائیں کیونکہ وہ اس قابل نہیں رہے تھے کہ اس وقت اپنے گھر والوں کو منہ دکھلائیں۔

یہ رات خوف و ہراس میں کٹی، کیونکہ اگر ہالیان ہوسٹل کو بھنک بھی ملتی تو ہم سب نکال دیے جاتے۔ خدا خدا کر کے دوسرے دن مجاز صحیح و سلامت گھر پہنچے۔ اس کے بعد مجاز نے شراب کو اور شراب نے مجاز کو جس طرح بدنام کیا، وہ سب کو معلوم ہے۔ پہلے جام کے ساتھ ان کے ہاتھوں میں لرزش اور پاؤں میں جو لغزش آئی وہ آخر وقت تک باقی رہی۔

مجاز نے "رات اور ریل" سے بہتر نظمیں لکھیں لیکن ان کے فن کے خد و خال اس میں نمایاں ہو چکے ہیں۔ آہنگ و ترنّم کی وہ کھنک موجود ہے جس نے ان کے کلام کو قبولِ عام بخشا۔ گو جوشؔ ملیح آبادی کی صحبت بعد میں انھیں میسّر ہوئی۔ لیکن ان کی نظم "جنگل کی

شہزادی"، کا اثر" رات اور ریل" پر عیاں ہے۔ بعد میں ذاتی قربت کے باوجود مجاز کی شخصیت اور شاعری پر جوش کا ویسا گہرا اثر نہیں ہوا جیسا کہ باور کیا جاتا ہے۔ بقول ان کے ملیح آباد، لکھنؤ کا کچھ نہ بگاڑ سکا۔

مجاز کا ملنا جلنا اختر شیرانی سے زیادہ تو نہ تھا لیکن جو لوگ میری طرح ان دونوں کو جانتے تھے، وہ شہادت دیں گے کہ فقط ان کی شاعری نہیں، بلکہ شخصیت میں بھی حیرت ناک مماثلت تھی۔ ہم عصر شاعروں کی برادری میں ان دونوں سے زیادہ معصوم و محروم دیکھنے میں نہ آئے۔ دونوں کسی اصلی یا خیالی معشوق کی تلاش میں جام بکف سرگرداں رہے۔ اور جب جوانی کا نشہ اترا تو جامِ سفال ان کے ہاتھوں سے گر کر چور چور ہو گیا۔ البتہ اس جامِ شکستہ کی صدائے بازگشت اردو شاعری میں دیر تک گونجتی رہے گی۔

چند ممتاز شخصیتیں

علی گڑھ کے دورانِ قیام میں جن استادوں کی شخصیت کا مجھ پر دیرپا اثر ہوا وہ پروفیسر محمد حبیب اور پروفیسر رشید احمد صدیقی تھے۔ ایک نے مجھے تاریخ اور دوسرے نے کلاسیکی اردو ادب کا صحیح ذوق عطا کیا اور دونوں نے میری شوریدہ سری کی ایسے حسنِ سلوک سے اصلاح کی کہ مجھے خبر بھی نہ ہوئی۔

پروفیسر حبیب اس نسل کے نمائندہ تھے، جس نے مشرقی اور مغربی تہذیبوں کی بہترین صفات کو سمویا تھا۔ اس سنگم کا تال میل میں نے سر عبدالقادر، ڈاکٹر سید حسین، ڈاکٹر کچلو، ڈاکٹر تاراچند وغیرہ میں بعد میں دیکھا۔ وضع داری اور رواداری اس کے خاص عنصر تھے اور روشن دماغی، نیز اختلاف رائے کی آزادی کی اس میں گنجایش تھی۔ مورخ کی توجہ عہدِ مغلیہ سے پہلے کی دہلی کی سلطنت کی طرف مبذول کرنے کا سہرا حبیب صاحب کے سر بندھتا ہے۔ انھیں کے ایما پر علی گڑھ یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ نے اس فراموش شدہ دور پر تحقیق کا جو باقاعدہ کام شروع کیا وہ سلسلہ تا ایں دم جاری ہے۔ عہدِ وسطیٰ پر DAWSON AND ELLIOT کی جامع تاریخ کے نئے ایڈیشن پر پروفیسر حبیب کا

مبسوط مقدمہ ان کا شاہکار ہے اور اس میں جدید تاریخ نویسی کا وہ انداز نظر آتا ہے جس کا مدار بادشاہوں اور امیروں پر نہیں بلکہ عوام کی زندگی پر ہے۔

علی گڑھ کے دورانِ قیام میں پروفیسر رشید احمد صدیقی کا شاگرد رشید ہونے پر مجھے فخر رہا۔ وہ ایسے مہمان نواز تھے کہ باہر سے آنے والے مسلمان دانشور اور شاعر انھیں کے گھر ٹھہرتے تھے۔ ایسے موقعوں پر صدیقی صاحب مجھے ضرور بلا بھیجتے تھے۔ میں اشتراکیت کا مدّعی تو تھا ہی۔ فی الحال بقول ابوالفضل "چندے برائے سیر باغ الحاد رفتیم" چنانچہ میں کسی کے رعب میں نہ آتا تھا اور صدیقی صاحب کے مہمانانِ گرامی سے گفت و شنید میں مجھے کوئی جھجک نہ ہوتی تھی۔ وہ بھی میری باتوں سے محظوظ ہوتے تھے کہ یہ آواز نئی تھی۔ پہلے تو میں مارکسی نظریے کے زیرِ اثر الحاد کو اشتراکیت کا جزو لازم سمجھتا رہا۔ لیکن بعد ازاں ظاہر ہوا کہ اس میں کلیسہ کی رجعت پروری کو مذہب پر محمول کر دیا گیا ہے۔ علاوہ بریں اسلام کے دورِ اوّل کی انقلابی روایتوں سے مارکس ناواقف تھا اور انیسویں صدی کے میکانکی سائنس نے اسے ان قدروں اور حقیقتوں سے بیگانہ رکھا جس سے جدید علم آگاہ ہوا ہے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین کی شخصیت میں ذہانت، شرافت اور خود گزاری کا بے نظیر امتزاج تھا۔ ان کے عزم و انکسار میں بے پناہ کشش تھی۔ میں نے صرف مولانا ابوالکلام آزاد اور مولوی عبدالحق کو ان سے احتیاط برتتے دیکھا۔ جامعہ ملیّہ کے مردہ جسم میں انھوں نے جس طرح نئی جان ڈالی اور تقسیم ہند کے وقت علی گڑھ یونیورسٹی کی حفاظت میں وہ جس طرح سینہ سپر ہوئے یہ ہماری تعلیمی تاریخ کے اہم واقعات ہیں۔ علی گڑھ میں مجھ پر جو ان کا التفات شروع ہوا وہ تب تک باقی رہا جب وہ حکومتِ ہند کے نائب صدر تھے۔ دہلی ہو یا پیرس، بارہا بے تکلف میرے غریب خانے پر آئے اور میری روحانی بے قراری کی تسکین فرماتے رہے۔

مولانا شبلی دارالمصنّفین اور انجمن ترقی اردو کی داغ بیل ڈال چکے تھے۔ لیکن انھیں سیّد سلیمان ندوی اور مولوی عبدالحق نے پروان چڑھایا۔ سیّد صاحب کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔

مولوی صاحب کی خدمت میں جو وقت گزرا اس کی تفصیل آگے آئے گی۔

شاعروں میں کسی کو اصغر گونڈوی جیسا منکسر، شائستہ اور سنجیدہ نہیں پایا، کبھی کبھی وہ تصوّف کے پیچیدہ نکات میرے ذہن نشین کرنے کی کوشش فرماتے، مگر میں روٹی، کپڑا، مکان کی منطق سے ان کی باتوں کو ٹال دیتا تھا۔ میری رائے میں خواجہ میر دردؔ اور شادؔ عظیم آبادی کے بعد ہماری زبان میں تصوّف کی شاعری میں اصغرؔ کا مقام سب سے بلند ہے اور غزل کی تہذیب میں کوئی ہم عصر ان کا ہم پلّہ نظر نہیں آتا۔

اصغرؔ کو جگرؔ بجا طور پر اپنا مرشد مانتے تھے اور آخری عمر میں تو جگرؔ کی صورت شکل بھی اصغرؔ سے ملنے لگی تھی۔ سالانہ مشاعرے کے موقع پر جگرؔ جب علی گڑھ آتے تو صدّیقی صاحب کو ان کی خاطر منظور ہوتی اور بازار سے ایک آدھ بوتل منگوا دیتے تاکہ جگرؔ تشنہ کامی کے بہانے مشاعرے سے غائب نہ ہو جائیں۔ ایک بار انھوں نے بوتل اس تاکید کے ساتھ میرے سپرد کی کہ جگرؔ صاحب کو اتنی دینا کہ سرور ہو نشہ نہ ہونے پائے۔ لیکن وہ کب ماننے والے تھے۔ بوتل خالی کر دی اور مشاعرہ الٹ کر رکھ دیا۔

قیام پاکستان کے بعد جب کبھی وہ کراچی آئے تو میرے غریب خانے کو نہ بھولے۔ ترکِ مے نوشی کے بعد کسی میں ایسا نکھار آتے نہ دیکھا اور نہ کسی بدشکل کو ایسا دل رُبا پایا۔ ایک بار ان کی فرمائش پر میں نے کشتی پر ضیافت اور شعر خوانی کا ایسا انتظام کیا کہ وہ ہمیشہ یاد کرتے رہے۔

اردو غزل کا کلاسیکی دور جس طرح داغ دہلوی پر ختم ہوا۔ اسی طرح اس صدی میں غزل کی نشاۃ ثانیہ کا دور جگرؔ پر اختتام کو پہنچا۔

علی گڑھ میں تین کٹھن سال اس طرح کٹے کہ گرمیوں کی طویل تعطیل کلکتہ میں بسر کرتا اور بیچ بیچ میں جب موقع ملتا، لاہور، دہلی وغیرہ کی طرف نکل جاتا۔

۱۹۳۳ء کی گرمی کے موسم میں شام کے وقت میں کہیں جا رہا تھا کہ ایک موٹر قریب آ کر رُکی اور اُس میں سے آغا حشر کاشمیری باہر نکلے۔ یہ حُسنِ اتّفاق تھا۔ میں نے جھک کر آداب کیا تو انھوں نے گلے لگا لیا اور گلہ کیا کہ "میاں بڑے بے وفا نکلے۔ شمیم جب سے

لاہور گئے، تم نے میرے گھر کا رخ نہ کیا۔ جب انھیں معلوم ہوا کہ میں علی گڑھ رہ پڑا ہوں تو معذرت قبول کی اور تقاضا کیا کہ جلد جلد آیا کرو۔ میں نے آغا صاحب کے ارشاد کی تعمیل کی، بلکہ "سیتا" نامی فلمی ڈرامے کا جو مسودّہ انھوں نے منشی کو ہندی میں لکھوایا تھا، اس کی نظرِ ثانی بھی کی۔

کثرتِ شراب نوشی سے آغا صاحب کا جگر خراب ہو چکا تھا اور وہ زیادہ وقت پلنگ پر دراز رہتے اور پرہیز کی پابندی عاید کرنے والے ڈاکٹروں کو برا بھلا کہتے رہتے تھے۔ ان کے ضلع جگت اور پھکڑ میں جو ادبی شان تھی وہ سودا اور انشاء اللہ خاں کے سوا اور کسی کو نصیب نہ ہوئی۔ جب خوش گفتاری پر آتے تو اچھے اچھے سر دھننے لگتے۔ ایک بار جمیل مظہری نے انیس کا ذکر چھیڑا تو آغا صاحب نے اردو اور فارسی مراثی کے صدہا اشعار یوں سنا دئے کہ سب دنگ رہ گئے۔

آغا صاحب سیالدہ اسٹیشن کے پاس پنچو خانساماں لین کے ایک مکان میں رہتے تھے۔ ان کے شاگرد عنایت دہلوی کی شامت آئی تو بول اٹھے۔ یہ کارپوریشن والے کیسے جاہل ہیں کہ اس سڑک کا نام آغا حشر لین نہیں کر دیتے۔ پھر کیا تھا، آغا صاحب کے تن بدن میں آگ لگ گئی اور ڈپٹ کر کہا۔ ابے جاہل تو ہے۔ کیا مجھے پنچو خانساماں کا جانشین سمجھا ہے۔ یہ نہیں سوچتا کہ سرکلر روڈ یا دھرم تلہ اسٹریٹ جیسی شاہراہ کا نام آغا حشر سے منسوب ہو۔ جا دفان ہو میرے سامنے سے۔

ایک ایسا ہی واقعہ ۱۹۳۴ء میں لاہور میں پیش آیا جہاں آغا صاحب اپنے عزیز دوست حکیم فقیر محمد چشتی کے مہمان تھے۔ اور لوگوں کے ساتھ میں بھی ان کی باتوں کا لطف لے رہا تھا کہ کسی صحافی نے کہنہ مشق ناول نگار ایم۔ اسلم کے تعارف میں کہا "یہ لاہور کے مال زادہ ہیں"۔ آغا صاحب نے ڈانٹ کر کہا "مال زادہ تو ہوگا، یہ تو امیر زادہ ہیں"۔

آغا حشر کی ڈرامہ نگاری کا دوسرا دور ادبی نقطۂ نظر سے زیادہ قابلِ توجہ ہے۔ یہ دور ترکِ موالات کی تحریک سے متاثر ہے۔ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ آغا صاحب کے دل میں قوم کا درد تھا جس کا اظہار ان کی مشہور نظم "شکریۂ یورپ" میں برملا ہوا ہے۔ اسی زمانے

میں انھوں نے "غلام ہندوستان" "آنکھ کا نشہ" "رستم و سہراب" اور "دل کی پیاس" جیسے ڈرامے لکھے۔ آغا صاحب کا بیان تھا کہ اسٹیج کی ضرورت اور سنسر کے اندیشے سے مسوّدوں میں ردّ و بدل کرنا پڑا۔ جب وہ اصل صورت میں شایع ہوں گے تو اردو ادب میں انھیں شایانِ شان مقام ملے گا۔

آغا صاحب کے انتقال کے بعد یہ مسوّدے ان کے چھوٹے بھائی آغا محمود کے پاس رہ گئے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ ایکٹر بہت اچھے تھے۔ لیکن شعر و ادب سے تعلق نہ رکھتے تھے۔ ان کی رحلت کے بعد ۱۹۶۰ء میں دہلی میں کوئی صاحب مجھ سے یہ کہہ کر ملے کہ وہ بنارس کی آغا حشر اکاڈمی کے سکریٹری ہیں اور ان مسوّدوں کی اشاعت کا انتظام کر رہے ہیں۔ واللہ اعلم

نواب نصیر حسین خاں خیال نے "داستانِ اردو" کی تصنیف میں بڑی محنت صرف کی، مگر افسوس کہ اس کا مسوّدہ بھی ضایع ہو گیا۔ اس کا ایک حصّہ "مغل اور اردو" کے نام سے چھپا اور اہلِ نظر نے مانا کہ محمد حسین آزاد کا طرزِ بیان چھین لیا ہے۔ مرثیے کی صنف کو ان سے بہتر سمجھنے والا کوئی نہ تھا اور اس کی مثال "انیس اور فردوسی" پر ان کے مقالے سے ملے گی۔ سر راس مسعود نے انھیں علی گڑھ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کا صدر بنانے کا فیصلہ کیا ہی تھا کہ ۱۹۳۲ء میں یک بیک نواب خیال کا انتقال ہو گیا۔ ان کے صاحب زادہ حسن نواب کے پاس پٹنہ میں "داستانِ اردو" کا مسوّدہ رہ گیا۔ میری تجویز پر مولوی عبدالحق اسے چھاپنے کو تیار تھے مگر حسن نواب کی سمجھ میں نہ آیا اور ۱۹۴۷ء کے ہنگامے میں اردو ایک قابلِ قدر تصنیف سے محروم ہو گئی۔

یہی ستم ظریفی نواب خیال کے ماموں شاد عظیم آبادی کے کلام کے ساتھ ہوئی جس کا بڑا حصّہ ان کے فرزند کی بے پروائی کی نذر ہو گیا۔

۱۹۳۲ء کی تعطیل میں کلکتہ جاتے ہوئے میں سنسکرت کی سند "ساہتیہ النکار" کا امتحان دینے بنارس ٹھہرا۔ منشی پریم چند کو معلوم ہوا تو سامان اپنے گھر منگوا لیا۔ ان کی شخصیت میں ان کے فن سے کم عظمت نہ تھی۔ ان کی آنکھوں نے "شبِ مالوہ" اور "شام لکھنؤ" کے بعد اب "صبحِ بنارس" کا تماشہ دیکھا۔ یہ وہ شہر ہے۔ جس پر حزیں جیسا بد دماغ ایسا شیدا ہوا کہ

وہیں کا ہو رہا۔ اور جس کی توصیف میں غالب نے "چراغِ دیر" جیسی مثنوی تحریر کی۔

جواہر لال نہرو علی گڑھ کیسے آئے!

جدید تاریخ کا یہ دور اس اعتبار سے اہم تھا کہ جرمنی پر ہٹلر اور روس پر اسٹالن کی ڈکٹیٹر شپ قایم ہو گئی تھی۔ ایک نے نسلی برتری اور دوسرے نے اشتراکیت کے نام پر جبر و ظلم کے وہ ستم توڑے جن کی مثال نہیں ملتی۔ اس وقت فاشزم کی رجعت پرورانہ تحریک کے سدِّباب کے لیے ترقی پسندوں نے اسٹالن کی چیرہ دستیوں کو نظر انداز کر دیا مگر اس خود فریبی نے اشتراکیت کو جس طرح مجروح کیا، اس کا اندازہ مشکل نہیں۔ انسان کے قول و فعل اور معاشرے کے نظریہ و عمل میں جو تضاد ہمیشہ سے چلا آتا ہے، وہ اس موقع پر بھی ظاہر ہوا۔ اس کا احساس مجھے اسی وقت شدّت سے ہوا۔ لیکن نہ تو میں انقلابِ روس کی عہد آفریں اہمیت سے غافل ہوا اور نہ اشتراکیت کے بنیادی اصولوں کا منکر ہوا ــــ ژاں پال سارتر نے خوب کہا ہے کہ فلسفہ اور پولیس کے فرق کو کبھی نہ بھولنا چاہیے۔

ہندوستان کے سیاسی ذہن کو بین الاقوامی مسائل سے روشناس کرنے میں پنڈت جواہر لال نہرو نے پیش قدمی کی۔ ۱۹۳۳ء میں دہرہ دون جیل سے رہا ہو کر وہ فاشزم کے خلاف جہاد کر رہے تھے۔ ان کے ہم نوا تو ہم تھے ہی، اب ان کے دیدار کے مشتاق بن بیٹھے۔ ۱۹۳۴ء کا آغاز تھا کہ اخباروں نے ان کا پروگرام شایع کیا جس کے مطابق فلاں تاریخوں میں دہلی کے قیام کے بعد وہ بذریعہ ٹرین علی گڑھ کے راستے الہ آباد جانے والے تھے۔ علی گڑھ یونیورسٹی پر حکومت ہند کا کنٹرول تھا، لہٰذا وہاں پنڈت جی کے آنے کا سوال ہی نہ تھا۔ لہٰذا ہم نے یہ منصوبہ بنایا کہ دہلی جا کر پنڈت نہرو سے درخواست کریں کہ سرِ راہ علی گڑھ کانگریس کمیٹی کے صدر ٹھاکر مکھن سنگھ کے یہاں ٹھہر جائیں اور رات کے کھانے کے بعد پروفیسر حبیب کے دولت کدہ پر ہمیں نصیحت فرمائیں۔ اسے جرأتِ طفلانہ سے زیادہ کیا کہا جائے، مگر حبیب صاحب نے بڑے جوش سے اس تجویز کی تائید کی، کیونکہ سب سے زیادہ وہی پنڈت جی کے گرویدہ تھے۔ بس یہ منصوبہ بنا کر سبطِ حسن کے ہمراہ میں دہلی چل پڑا۔ اور

پنڈت جی کو ڈاکٹر انصاری کے گھر ڈھونڈھ نکالا۔ ہم نے بڑی سادگی سے اپنے تعارف میں کہا کہ "ہم علی گڑھ یونیورسٹی کے طالب علم ہیں اور ملتجی ہیں کہ کل سہ پہر کی ٹرین سے الہ آباد جاتے ہوئے رات بھر علی گڑھ ٹھہر جائیں، تاکہ ہماری جماعت آپ کی صحبت سے فیض یاب ہو سکے!" پنڈت نہرو اور ڈاکٹر سیّد محمود ہم سے خندہ پیشانی سے ملے، آپس میں مشورہ کیا اور ہامی بھر لی۔ چنانچہ ہم نے فون کے ذریعے یہ اطلاع ٹھاکر مکھن سنگھ اور حبیب صاحب کو دے دی۔ مگر ادھر جب ڈاکٹر انصاری نے فون پر وائس چانسلر کو یہ ماجرا سنایا تو ان کے تعجب کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ تاہم سر راس مسعود کی عالی ظرفی ملاحظہ ہو کہ انھوں نے اپنی لاعلمی ظاہر نہ ہونے دی۔ ہمیں اس واقعہ کی خبر نہ تھی۔ لہٰذا جب ٹرین علی گڑھ پہنچی اور ہم نے کانگریس کے رضاکاروں کی بجائے طلبہ کا ہجوم دیکھا اور لاغر اندام مکھن سنگھ کی بجائے بھاری بھرکم راس مسعود پنڈت نہرو کے استقبال کو بڑھے تو ہوش کے طوطے اڑ گئے اور میں بھیڑ میں اس طرح گم ہو گیا، گویا مہمانِ گرامی کا ہم رکاب تھا ہی نہیں۔ آن کی آن میں سر راس مسعود اور ان کی بیگم، پنڈت جی اور ڈاکٹر محمود کو موٹر میں بٹھا کر اپنے گھر لے گئے اور میں کفِ افسوس مل ہی رہا تھا کہ اعلان ہوا کہ رات کے نو بجے اسٹریچی ہال میں جلسہ ہو گا۔ وقت سے پہلے میں احباب کے ساتھ کرسیٔ صدارت کے پیچھے مورچہ جما کر بیٹھ گیا اور سوچتا رہا کہ جانے اب پنڈت جی سے آنکھیں چار ہوتی ہیں یا نہیں اور یونیورسٹی کے حکام اس کرتوت کی کیا سزا دیتے ہیں۔ پنڈت نہرو پہلی بار علی گڑھ آئے تھے۔ اس لیے سردی کے باوجود ان کے مدّاح اتنی بڑی تعداد میں جمع ہوئے تھے کہ ہال میں تِل رکھنے کی جگہ نہ تھی اور باہر بھی سینکڑوں لوگ جے کار کر رہے تھے۔ جلسے کی صدارت سر راس مسعود نے کی اور موقع کے لحاظ سے پنڈت نہرو نے ادھر اُدھر کی باتیں کر کے سب کو رخصت کر دیا۔ جب صاحب صدر اُن کے لیے راستہ بنانے آگے بڑھے تو میں نے موقع غنیمت جانا اور پنڈت جی سے کہا "آگے بڑی بھیڑ ہے، پیچھے کے راستے نکل چلیں، وہ میری بات میں آ گئے، اور ہال کے دریچے کو پھاند کر ہم سر سیّد ہوسٹل کے تاریک برآمدے میں کھڑے ہو گئے۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ لیکن وہیں روش پر ایک موٹر نظر آئی جس کے سامنے اوورکوٹ پہنے کوئی کھڑا تھا۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، پنڈت جی

کے ساتھ بے باکی سے موٹر میں بیٹھ گیا۔ شخص نامعلوم نے پوچھا، کہاں جائے گا۔ میں نے جواب دیا۔ پروفیسر حبیب کے گھر۔ موٹر جب میدان کی تاریکی سے نکل کر سڑک کی روشنی تلے گزری تو ڈرائیور کے رُخِ انور پر نظر پڑی اور مجھ پر اختلاج کا دورہ طاری ہوتے ہوتے رہ گیا۔ ارے یہ تو پروفیسر شریف (میاں افتخار الدین کے خسر) اور یونیورسٹی کے نامی گرامی استاد تھے۔ میں راستے بھر فکر مند رہا کہ کس بُری گھڑی پنڈت نہرو کو بلانے کا منصوبہ باندھا اور اس سے کیا حاصل ہوا؟ میں نہیں چاہتا تھا کہ ان پر بھرم کھلے، اس لیے اپنی گستاخی کی معذرت بھی نہ کی۔ ذرا دیر میں حبیب صاحب کے گھر پہنچے تو وہ چند لوگوں کے ساتھ ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ دیر تک سیاستِ عالم پر گفتگو ہوتی رہی اور جب پنڈت جی چلے گئے تو حبیب صاحب نے مجھے گلے لگا کر کہا کہ تم قول کے صادق ہو۔ کوئی باور بھی نہ کر سکتا تھا کہ جواہر لال یونیورسٹی اس طرح آئیں گے۔

ہمارے لیے تو یہ مذاق رہا لیکن خمیازہ سر راس مسعود کو اس طرح بھگتنا پڑا کہ ۱۹۳۵ء میں جب ان کے عہدے کی میعاد ختم ہوئی اور وہ دوبارہ انتخاب کے امیدوار ہوئے تو حکومتِ ہند نے ان کی مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا اور انتخاب ہار کر وہ وزیرِ تعلیم کے عہدے پر بھوپال چلے گئے جہاں چند سال بعد ان کا انتقال ہو گیا۔

بعد میں پنڈت نہرو سے وقتاً فوقتاً ملنے کا اتفاق ہوا جس کا ذکر آگے آئے گا۔ ہر بار مزے لے لے کر وہ اس سفر کی تفصیل سُناتے تھے۔

علّامہ اقبال سے ملاقات

اسی زمانے میں اتاترک کے پُرانے رفیق رؤف بے جامعہ ملّیہ کی دعوت پر ہندوستان آئے اور ان کی تقریر سننے کے لیے میں اشرف کے ساتھ دہلی گیا اور کوچہ پنڈت میں احمد علی کے گھر ٹھہرا۔ جلسے کی صدارت علّامہ اقبال نے کی اور انگریزی میں ایسی برجستہ تقریر کی کہ سب ان کی بصیرت کے قائل ہو گئے۔ اس وقت تک ہم تینوں میں سے کسی کو اُن سے نیاز حاصل نہ تھا۔ لہٰذا طے پایا کہ ڈاکٹر انصاری کی قیام گاہ پر وقت مقرر کر کے ان سے ملا جائے۔

دوسرے دن میں نے فون کیا تو جواب ملا کہ اقبال شام کو ہر کس و ناکس سے ملتے ہیں، جو چاہے بلا تکلف آجائے۔ عین وقت پر اشرف اور احمد علی کہیں اور چلے گئے مگر میں فرطِ شوق میں دریا گنج چل پڑا۔ اس کوٹھی کا سلسلہ دارا شکوہ سے ملتا تھا اور مرورِ ایام کے باوجود اس میں پرانی شان باقی تھی۔ ڈاکٹر انصاری کے انتقال کے بعد مولوی عبدالحق نے حیدرآباد منتقل ہو کر اسی کو اپنا مستقر بنایا۔ ڈاکٹر انصاری کے حینِ حیات یہ مکان قومی مہمان خانہ تھا۔ جہاں سیاست کے بڑے بڑے معرکے ہوئے اور پھر مسلمانوں کی بساطِ سیاست پر اردو نے جان کی بازی لگا دی۔

ملازم کی نشان دہی پر جب میں ایک کمرے میں داخل ہوا تو اقبال کو پلنگ پر دراز پایا اور سلام کر کے کونے میں بیٹھ گیا۔ وہ تنہا تھے اور بلا تامّل میری طرف متوجّہ ہو گئے۔ جب انھوں نے سنا کہ میں میوات کے باغی کسانوں کا حال دیکھ کر ان کی زیارت کے لیے دہلی ٹھہرا ہوں، تو مسکرا کر کہا، معلوم ہوتا ہے کہ تم تعلیم کی طرف توجہ کم دیتے ہو، ورنہ ان مشاغل کے لیے وقت کیسے نکل سکتا ہے۔

میں نے عرض کیا کہ میں تجسّس کی اس منزل پر ہوں جب رسمی تعلیم تضیع اوقات معلوم ہوتی ہے۔ میں حقیقت کا جویا ہوں اور اسی کو حاصلِ علم تصوّر کرتا ہوں۔ آپ جیسے بزرگوں کے فیض سے جو حاصل ہوگا وہ کسی درس گاہ میں کب میسّر ہوگا؟

اس جواب پر اقبال محظوظ ہو کر اٹھ بیٹھے اور پوچھا "تمھارے ذہن میں حقیقت کا تصوّر کیا ہے؟"

عرض کیا کہ میں ابھی معاشی مسائل سے زیادہ سوچنے کی صلاحیت پیدا نہ کر سکا اور یہ سمجھتے ہوئے بھی کہ انسان کا مقدّر بھوک اور شہوت کی تسکین کے علاوہ اور بھی کچھ ہے، اسی اُلجھن میں ہوں کہ ان بنیادی مسائل کا مناسب حل نکل آئے تو پھر انسان اپنی خُفتہ صلاحیتوں کو صحیح طور پر بروئے کار لا سکے گا۔

اقبال نے کچھ دیر مجھے غور سے دیکھا اور فرمایا۔ بھوک اور شہوت کے مسائل حیوان اور انسان میں مشترک ہیں۔ جو قدر ان میں امتیاز پیدا کرتی ہے وہ فلسفے کی اصطلاح میں

"آئیڈیا" ہے۔ یہ ایک ایسا جذبہ ہے جو ایمان، ضمیر، اخلاق، مسلک وغیرہ کی شکلیں اختیار کرتا ہے۔ سوچو کہ انسان کی بہتری اور ترقی کی جدوجہد میں جن لوگوں نے مصائب جھیلے ہیں انھیں ان قربانیوں کے لیے کسی نے مجبور نہیں کیا۔ کسی نورِ ایمان نے انھیں اس کاوش کے لیے اُبھارا۔ یہی جذبۂ انسانیت کا جوہر اور اس کی سربلندی کی ضمانت ہے۔

غرض کہ میں دیر تک اقبال کی سمع خراشی کرتا رہا مگر وہ بے لطف نہ ہوئے اور بوقتِ رخصت تاکید کی کہ جب کبھی لاہور آؤ تو مجھ سے ملو۔ بنا بریں لاہور میں چند بار ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آخری ملاقات ۱۹۳۶ء میں پانی پت میں مولانا حالی کی صد سالہ سالگرہ کے مشہور جلسے میں ہوئی جب میرا مقالہ "ادب اور زندگی" ان کی نظر سے گزر چکا تھا۔ جب کسی نے میرا تعارف علامہ اقبال سے ان الفاظ میں کیا کہ یہ آپ کی شان میں سخن گسترانہ باتیں لکھ گئے ہیں، تو انھوں نے کمال شفقت سے فرمایا "ایسے مخلص نوجوانوں کی میں قدر کرتا ہوں۔ بے جان لوگوں کے اتفاق پر جان دار لوگوں کے اختلاف کو ترجیح دیتا ہوں"۔

اس وقت میں نے اقبال کا کلام جستہ جستہ پڑھا تھا۔ اب انصاف کا تقاضہ ہے کہ ان کی شاعری اور شخصیت کی عظمت کا اقرار کروں۔ غمِ دوراں کا ایسا نوحہ خواں اور عظمتِ انساں کا ایسا قصیدہ خواں بیسویں صدی میں کوئی شاعر نہ ہوا۔

لاہور میں ٹیگور

ٹیگور کو میں نے سب سے پہلے کلکتہ میں ۱۹۳۴ء کے وسط میں دیکھا۔ جب وہ شانتی نکیتن سے کلکتہ آتے تو شیام بازار میں اپنے آبائی ٹیگور پیلس میں ٹھہرتے تھے۔ ان کے ایک خُرد سوین ٹیگور میرے شناسا تھے اور یورپ سے زمانۂ حال میں لوٹ کر اسی محل میں سکونت پذیر تھے۔ ایک بار جو ٹیگور پیلس گیا تو معلوم ہوا کہ ٹیگور محفل آرا ہیں۔ پیرانہ سالی کے باوجود ان کی شخصیت پر آرٹ کے دیوتا کا گمان ہوتا تھا۔ ۱۹۳۵ء کے آغاز میں شانتی نکیتن کے لیے چندہ جمع کرنے ٹیگور رقص و سرود کے طائفے کے ساتھ دورے پر نکلے، اور اس وقت لاہور پہنچے۔ جب میں وہاں علی گڑھ سے "ادب اور زندگی" کے لیے مواد جمع کر رہا تھا۔ ٹیگور

کے استقبال کے لیے جو کمیٹی بنی اس میں گوکل چند نارنگ، سر شادی لال، منوہر لال زتشی جیسے ہندو اکابر تھے۔ لیکن سب سے زیادہ چندہ، بھلّا نامی امیر و کبیر کفش فروش نے دیا جس کے جوتے سارے پنجاب میں چلتے تھے۔ البتہ دس ہزار کی تھیلی کمیٹی میں پیش کرتے وقت اُس نے شرط لگائی کہ ٹیگور اس کے دولت کدہ پر ٹھہریں گے۔ اس کی ضد تھی کہ جب میری کوٹھی کسی سے چھوٹی نہیں اور سامان میں کسی سے ہیٹی نہیں تو ٹیگور کو وہاں کون سا آرام میسّر نہ ہوگا۔ اب اسے کون سمجھاتا کہ اس میں وہ شے لطیف نہ ہوگی جسے پہلے تہذیب اور اب ثقافت (ق کی اضافت کے ساتھ) کہتے ہیں۔ غرض کہ غریب ٹیگور کو بھلّا کی مہمانی بھگتنا پڑی۔ اس لق و دق عمارت میں وہ سب کچھ تھا جو کسی سیٹھ کی کوٹھی میں ہوتا ہے۔ بھلّا نے وسیع دیوان خانے کو ایک پردے سے تقسیم کیا اور عقبی حصّے میں ٹیگور کے مطالعے کا کمرہ آراستہ کیا۔ جب کوئی درشن کے لیے آتا تو بھلّا بنفس نفیس پردہ ہٹا کر ببانگِ دہل اعلان کرتا۔

"وہ بیٹھے ہیں گرودیو"، میں نے اب نازک مزاج شاعر کے رُخ پر تجلّی کے بجائے ناراضگی کے آثار دیکھے اور ہمارے سلام کا جواب انھوں نے بڑی بے رُخی سے دیا۔ ستم بالائے ستم کہ بھلّا نے جب سنا کہ ٹیگور کو صبح سویرے بھجن سننے کی عادت ہے، تو اس نے گردوارے سے سکھ خوش الحانوں کو بلا بھیجا اور انھوں نے شاعر کے گوش ہوش درست کر کے رکھ دیے۔

غرض کہ ہفتہ دس دن کی افتاد کے بعد جب ٹیگور نے رختِ سفر باندھا تو بھلّا نے اپنے لان پر تک و احتشام سے چائے کی دعوت کا انتظام کیا۔ بھائی اور حسرت کے ساتھ میں بھی یہاں موجود تھا۔ کسی نے بھلّا کو سمجھایا کہ ایسے موقع پر میزبان کی حیثیت سے تمھیں تقریر کرنا چاہیے۔ لیکن زیادہ مناسب ہوگا کہ الوداع ٹیگور کے انداز کی نظم منثور میں پڑھو۔ پھر اسے نظم بھی لکھ کر دے دی جو کچھ اس طرح کی تھی:-

اے مسافر، کیا تو چلا جائے گا!
پرندے ہوا میں پَر تول رہے ہیں
گائیں چراگاہوں کی طرف جا رہی ہیں اور
ریل گاڑی دھواں اُڑا رہی ہے

اے مسافر، کیا تو چلا جائے گا!
بنگال کا جادو مشہور ہے
لیکن اہل پنجاب کو اس جادو کا منتر خوب یاد ہے
اے مسافر، کیا تو چلا جائے گا۔ وغیرہ وغیرہ

ہم سب نے قہقہوں اور تالیوں سے اس نظم کی داد دی۔ اور تھکا ہارا مسافر جہاں سے آیا تھا وہیں واپس لوٹ گیا۔

بچپن سے جن بزرگوں کا نام پڑھے لکھوں کی زبانی احترام سے سُنا ان میں مولوی عبدالحق کی ذاتِ گرامی بھی تھی۔ علی گڑھ میں جب تصدیق ہوئی کہ علمی خدمات کے علاوہ ان کی ذات میں یہ وصف ہے کہ وہ جدید خیالات کے حامی اور نو واردوں کے رہبر ہیں تو دل میں ان کی عزّت اور بڑھی۔ ابھی میں لاہور سے لوٹا ہی تھا کہ حسنِ اتفاق سے مولوی صاحب کا علی گڑھ آنا ہوا اور رشید احمد صدیقی نے ان سے مجھے ملایا۔ رسالہ "نگار" میں میں نے قاضی نذرالاسلام کی جن نظموں کے تراجم شایع کیے تھے وہ انھیں پسندِ خاطر ہوئے تھے۔ لہٰذا اصرار کیا کہ رسالہ "اردو" کے لیے کچھ اور نظموں کا ترجمہ کر دو۔ فرمایش کی تعمیل کے ساتھ میں نے اپنے مقالے "ادب اور زندگی" کا مسودہ بھی روانہ کر دیا۔ اس وقت میں ایم۔ اے کا طالب علم تھا اور تہیّہ کر چکا تھا کہ گرمیوں میں مستقلاً کلکتہ جا کر انگریزی روزنامہ "ایڈوانس" میں سب ایڈیٹر کی خدمت پر لگ جاؤں گا جس کی پیش کش بابو مول چند اگروال نے کی تھی۔

مسوّدوں کی وصولیابی کے بعد مولوی عبدالحق نے ایک طویل خط کے ساتھ ڈیڑھ سو روپیہ بطور معاوضہ ارسال کیا۔ اس زمانے میں مولوی عبدالحق کے سوا یہ بہادر کس میں تھا کہ ایسا ہنگامہ خیز مقالہ اشاعت کے لیے قبول کرے۔ خط میں انھوں نے مجھ ناچیز کی بڑی حوصلہ افزائی کی اور یہ بھی پوچھا کہ بتاؤ آیندہ کیا کرو گے۔ جب میں نے اپنے ارادے کا اظہار کیا تو تار ملا کہ میں اپریل ۱۹۳۵ء کی آخری تاریخوں میں علی گڑھ آ رہا ہوں اور تم سے ملنے کا خواہاں ہوں۔

مولوی عبدالحق علی گڑھ میں ہمیشہ اپنے ہم جماعت خان بہادر شیخ عبداللہ کی رہایش گاہ عبداللہ لاج میں ٹھہرتے تھے۔ جب مجھے ان کی آمد کی خبر ہوئی تو پروفیسر رشید احمد صدیقی کے ساتھ

ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ مولوی صاحب جس گرم جوشی اور شفقت سے مجھ سے ملے، اسے میں کبھی نہ بھولا۔ رسمی گفتگو کے بعد انھوں نے کہا کہ مجھے یہ سُن کر تردّد ہوا کہ آپ کلکتہ جا کر اخبار نویسی دوبارہ شروع کرنا چاہتے ہیں۔ آپ کا میدان علم و ادب ہے اور وہ بھی اردو میں۔ انجمن نے جو انگریزی اردو ڈکشنری مرتّب کی ہے وہ طباعت کے مرحلے میں داخل ہو چکی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کا انگریزی ہندی ایڈیشن بھی شایع ہو جائے۔ ایک تو ہندی میں کوئی اچھّی لغت نہیں ہے اور اس طرح اردو کے بہت سے الفاظ ہندی میں داخل ہو جائیں گے۔ یہ کام ابھی میری نگرانی میں پنڈت ونشی دھر نے شروع کیا ہے، لیکن وہ اردو سے ناواقف ہیں۔ علاوہ بریں مجھے رسالہ "اردو" کے لیے آپ جیسے معاون کی ضرورت ہے۔

مولوی صاحب کی تائید میں صدیقی صاحب نے بھی بہت کچھ کہا اور میں حیص بیص میں گرفتار ہو گیا۔ میں نے عذر کیا کہ تحریر اور تقریر کی آزادی کا اتنا عادی ہو چکا ہوں کہ ریاست کی پابندی کی تاب نہ لا سکوں گا۔ جواب میں مولوی صاحب نے یقین دلایا کہ تم پر کوئی پابندی نہ ہو گی ماسوا اس کے کہ عملی سیاست میں حصّہ نہ لینا۔ اس یقین دہانی کے باوجود جب میں نے انکار کیا تو مولوی صاحب نے بتلایا کہ وہ دو تین سال میں انجمن کو دہلی منتقل کرنے کا تہیّہ کر چکے ہیں۔ اور واقعی وہ شیخ عبداللہ سے مشورہ کر رہے تھے کہ انجمن کو کس طرح لمیٹڈ کمپنی کی شکل دے کر دہلی لے آئیں۔ لیکن اس کی ضرورت پیش نہ آئی اور گاندھی جی نے ہندی اردو کا قضیہ شروع کر کے ایسی صورت پیدا کر دی کہ چار سال بعد حکومت حیدر آباد کی رضامندی سے انجمن کا کاروبار اورنگ آباد سے دہلی منتقل ہو گیا۔

کچھ تو مولوی صاحب کا احترام کچھ اردو ادب کا نیا نیا شوق اور سب سے بڑھ کر طبعی تیز پسندی، میں نے اقرار کر لیا اور دیوان حافظ سے فال نکال کر آغازِ مئی میں اورنگ آباد چل پڑا۔

منم کہ گوشۂ میخانہ خانقاہِ منست
دعائے پیرِ مغاں وردِ صبح گاہِ منست

حیدرآباد دکن کی انجمن آرائی

۴

زیادہ نہیں، کچھ کم دو سال مجھے مولوی عبدالحق کے ساتھ حیدرآباد اور اورنگ آباد میں کام کرنے کا اتفاق ہوا مگر بوڑھے طالسطائی کو نوجوان گورکی نے جس غور سے دیکھا تھا۔ کچھ اسی انداز سے میں نے اس بزرگ شخصیت کو دیکھا۔ جنھوں نے مولوی صاحب کے دیدار پاکستان میں کیے، وہ ان کے کئی اوصاف سے ناآشنا رہے کیونکہ یہ ان کے زوال کا وقت تھا۔ بلکہ میری دانست میں دہلی کے دورانِ قیام میں بھی ان میں وہ بات نہ رہی تھی۔ ۱۹۳۶ء میں جب گاندھی جی نے اردو کو للکارا، تو مولوی صاحب کی زندگی کا رُخ بدل گیا۔ اس سے پہلے وہ کچھ اور تھے۔ میں نے انھیں اس موڑ پر سے گذرتے ہوئے قریب سے دیکھا تھا۔

۱۹۱۱ء میں جب مولوی صاحب کو محکمۂ تعلیم کی ملازمت اورنگ آباد لے آئی، تو وہ یہیں کے ہو رہے۔ یہاں فطرت اور تاریخ کا وہ سنجوگ ہے، جو انھیں پسند تھا۔ اورنگ آباد کا نام اورنگ زیب عالمگیر سے منسوب ہے، جس نے اپنے طویل عہدِ حکومت کا آدھا حصّہ دکن کی مسلم مملکتوں کے انضمام اور مرہٹوں کی روک تھام میں اس طرح صرف کیا کہ سلطنت

کی بنیاد ہل گئی۔ نہ وہ بھرے دربار میں شیواجی کی توہین کرتا اور دکن کی باج گزار شیعہ ریاستوں کا قلع قمع کرتا اور نہ یہ مصیبت آتی۔ بہر صورت اس زمانے کی یاد دلانے کے لیے شکستہ ایوانوں کے آثار یہاں سے اورنگ آباد تک پھیلے ہوئے تھے۔ یہ وہی دولت آباد ہے جہاں صدیوں قبل محمد تغلق نے دہلی چھوڑ کر کچھ وقت کے لیے اپنا پایۂ تخت بنایا تھا۔ واپس جاتے وقت وہ جن لوگوں کو چھوڑ گیا انھیں نے دکنی اردو کی تخم ریزی کی اور ان کے جو نام لیوا رہ گئے تھے ان کی صورت شکل اور لہجے کے کرارہ پن میں مرحوم دہلی کی چھاپ لگی ہوئی تھی۔ پاس ہی ایلورا کی وہ غاریں ہیں جن کی رگوں سے ہزار سال قبل نامعلوم ساحر فن کاروں نے حسن و جمال کی ایسی مورتیں ایجاد کی تھیں جن کا تصوّر بھی کوئی مجسّمہ ساز نہیں کر سکتا۔ وہیں دیوگری کا ناقابلِ تسخیر قلعہ چٹانوں کی کوکھ سے نکل کر اس دن کو یاد کرتا تھا، جب ملک کافور کی گرفت سے فرار ہوتے وقت دیول دیوی امیر خسرو کی مثنوی کے لیے اپنی تصویر چھوڑ گئی تھی۔

اورنگ آباد کے مضافات میں اورنگ زیب کی چہیتی ملکہ رابعہ زمانی کا مقبرہ ہے جو دکن کا تاج کہلاتا ہے کیونکہ تاج محل کے نمونے پر تعمیر ہوا ہے۔ مقبرے کے داروغہ کے بنگلے کو مولوی صاحب نے اپنی سکونت کے لیے منتخب کیا تھا اور حیدر آباد کے تبادلے کے بعد بھی ہر سال کچھ وقت وہ یہیں گزارتے تھے، بالخصوص برسات میں۔ اوّل جنگِ عظیم سے دو سال قبل علی گڑھ سے انجمن ترقی اردو ایک ٹوٹے ہوئے صندوق میں چند اوراقِ پریشاں کے ساتھ مولوی صاحب کے پاس اورنگ آباد پہنچی تھی۔ پھر انھوں نے اس نونہال کی پرورش خونِ جگر پلا کر جس طرح کی اس کا ذکر اردو زبان کی تاریخ کا روشن باب ہے۔ انجمن کا دفتر، اشاعت گھر اور چھاپے خانے کے ساتھ یہیں رہا تا وقتیکہ ۱۹۳۸ء میں دہلی منتقل ہو گیا۔ سچ تو یہ ہے کہ مولوی صاحب کو اردو سے ماں کی سی عقیدت اور انجمن سے بیٹی کی سی شفقت تھی۔

ان سے ہٹ کر انسانی تعلقات ان کے لیے بے معنی تھے۔ حسن انھیں صرف فطرت میں نظر آتا تھا اور برّصغیر کے قدرتی مناظر ان کی نگاہ میں سمائے ہوئے تھے۔ موسم کا لطف اٹھانا وہ خوب جانتے تھے اور گو کم خور تھے لیکن خوش خور تھے۔ حقّہ کا تمباکو اجین سے تو چائے دارجلنگ سے آئے، اور سگریٹ ہو تو عبداللہ مارکہ۔ ان کے ساتھ رہ کر میری عادتیں بھی

بگڑیں۔ جب مولوی صاحب اپنے فلسفۂ حیات کی تشریح کے لیے یہ کہاوت سناتے تو میں جوش سے ٹیپ کا بند دُہرایا:

جو کوئی ہم سے سیدھم سادھا سیدھم سادھا
ہم بھی اس سے سیدھم سادھا سیدھم سادھا
اور جو کوئی ہم سے ٹیڑھم ٹیڑھم ٹیڑھم ٹاڑھا
ہم بھی اس سے ٹیڑھم ٹیڑھم ٹیڑھم ٹاڑھا

دوسرے بند کے ساتھ وہ تن آور درخت کی طرح اکڑ گئے اور بادِ مخالف کی طرف یوں چھڑی تانی گویا کسی نادیدہ دشمن پر وار کر بیٹھیں گے۔ لیکن پہلے بند کے ساتھ ان کا جسم تسلیم و تعظیم کے انداز میں جُھک گیا۔

کج کلاہی اور تسلیم میں توازن آسان نہیں اور آخری عمر میں توازن کا میزان ہی ٹوٹ جاتا ہے۔ افسوس کہ پاکستان میں جن لوگوں نے مولوی صاحب کی کلاہ اتاری وہ انھیں کے پروردہ تھے۔ ایسے ہی موقع کے لیے رسول کریمؐ نے فرمایا تھا ——— "جن پر تم نے احسان کیا ہے اُن سے ہوشیار رہو۔"

مقبرے کے بنگلے کے ایک کمرے میں بیٹھ کر میں دن بھر لُغت نویسی میں مصروف ہو گیا اور لفظ و معنی کی تلاش میں ایسا محو ہو گیا جیسے کوئی کیمیاگر جڑی بوٹیوں سے رسایِن بنانے کی جستجو کرتا ہو۔ صبح سویرے مولوی صاحب کے ساتھ پہاڑیوں کی سیر کو نکل جاتا اور شام کو تنہا آثارِ کہنہ میں پھرتا رہتا تھا جہاں میرا بے لگام تخیّل صدیوں پرانی ارواح یا دفینوں کو تلاش کرتا تھا۔

اورنگ آباد یا حیدرآباد میں مولوی صاحب کی رہایش گاہ کی وہی شان تھی جو علی گڑھ میں رشید احمد صدیقی کے مکان کی۔ باہر سے آنے والے عالموں اور دانش وروں کی گہما گہمی رہتی تھی۔ البتہ شعراء کرام ان کی مہمان نوازی سے محروم رہتے تھے۔ عہدِ حاضر کے اردو شعراء میں مولوی صاحب، اقبالؔ کے علاوہ کسی کے قائل نہ تھے۔ حیدرآباد میں فانیؔ کو کبھی کبھی

ان کے دیوان خانے میں غزل پڑھتے سنا۔ مگر جب وہ چلے گئے تو منہ بنا کر کہا، دردِ غم اور چیز ہے، اشک شوئی اور چیز ہے۔

خیر۔ ذکر اورنگ آباد کا تھا جہاں بنگلے میں ڈاکٹر لطیف، ڈاکٹر عابد حسین، قاضی عبدالغفار وغیرہ ٹھیرے ہوئے تھے۔ مولوی صاحب اونچا سنتے تھے، لہٰذا زور سے بولتے تھے۔ ایک دن میں نے انھیں کہتے سنا "ایسا بے نیاز آدمی میں نے نہیں دیکھا۔ یا تو کسی طرح نہ آتا تھا اور جو آیا تو نہ سفر خرچ کا ذکر کیا نہ تنخواہ کو پوچھا۔"

دراصل میرے کردار میں ایسا استغنا ہے کہ مشفق ہو یا معشوق، مطلب کی بات نہیں کی جاتی۔ نہ دستِ طلب کبھی دراز ہوا اور نہ لب پر حرفِ مدّعا آیا۔ جو جس نے خوشی سے دیا لے لیا۔ نتیجہ یہ کہ حق تلفی بھی ہوئی اور زیاں کاری بھی۔ لیکن دماغ و دل آسودہ رہے اور یہ بھی ایک قسم کی نعمت ہے۔

ہماری سرزمین کا سب سے دل کش موسم برسات ہے۔ اور اس کا صحیح لطف شمال نہیں دکن میں آتا ہے۔ یوں تو اورنگ آباد میں گرمی برائے نام پڑتی تھی، تاہم دھوپ میں پیڑ پودے کملا جاتے تھے اور ندی نالے خشک ہو جاتے تھے۔ لیکن جون کے دوسرے پکھواڑے (عشرہ) کے ساتھ گھٹا امنڈ کر آئی اور ایسی موسلا دھار بارش ہوئی کہ جل تھل ایک ہو گئے۔ صبح جو آنکھ کھلی تو بنگلے کے پڑوس میں برساتی ندی زور شور سے بہہ رہی تھی۔ ہوا خنک ہو گئی تھی۔ پہاڑیوں میں آبشار جاری ہو گئے تھے، برگ و شجر پر زردی کی جگہ ہریالی نے لے لی تھی، اور مولوی صاحب پکار پکار کر کہہ رہے تھے "چھوڑو کتابوں کو قدرت کا نظارہ کرو کہ یہی علم کا سرچشمہ ہے۔" ان کے ملازم کسی خوش نما مقام پر پکوان بنانے لگے، اور ہم سب مولوی صاحب کے اِذن پر سیر کے لیے نکل گئے۔

جولائی ۱۹۳۵ء کے آخر میں حیدرآباد کا رختِ سفر بندھ رہا تھا کہ ایک دن ڈاک میں مولوی صاحب کے نام ان کے پرانے دوست ظفر عمر صاحب کا خط علی گڑھ سے آیا۔ وہ پولیس کے اعلیٰ افسر تھے، نیز نیلی چھتری، بہرام کی گرفتاری وغیرہ جاسوسی ناولوں کے مشہور مصنف تھے۔ علی گڑھ سے چلتے وقت میں ان کی صاحبزادی حمیدہ کا خواست گار ہوا تھا۔ اس جسارت پر

وہ کبیدہ خاطر ہوئے لیکن فیصلہ مولوی صاحب پر چھوڑ دیا۔ چنانچہ مولوی صاحب نے مجھے وہ خط دکھلایا اور پوچھا "کیا تم اس لڑکی کو جانتے ہو اور اس سے شادی کرنا چاہتے ہو؟"

جب میں نے اقرار کیا تو ذرا دیر خاموش رہ کر سوال کیا "شادی کی ذمّہ داری کو تم نہیں سمجھ سکتے۔ ابھی تمھارا تجربہ کیا ہے اور عمر کیا ہے؟"

میں نے عرض کیا۔ وقت کے ساتھ یہ ذمّہ داری اٹھانے کا تجربہ ہو جائے گا۔ اگر آپ کو میری ثابت قدمی پر بھروسہ ہے تو سفارش کر دیجیے۔ اس طرح کچھ عرصے بعد میری شادی ہو گئی۔ اور جب تک حمیدہ حیدرآباد میں رہیں، مولوی صاحب نے ان سے بیٹی کا سا سلوک کیا اور گھر کا انتظام ان کے سپرد کر دیا۔

حمیدہ میری رفیقۂ حیات ہیں۔ اور گو میں تا عمر پتنگ کی طرح دُور دُور اڑتا رہا۔ لیکن انھوں نے نہ ڈور چھوڑی، نہ کنّی کٹنے دی۔

حیدرآباد میں مولوی صاحب ایک کشادہ کوٹھی میں رہتے تھے جس کا نام "نادر منزل" تھا۔ اس کے ایک حصّے میں پنڈت کیفی اور ڈاکٹر عابد حسین کام کے سلسلے میں مقیم تھے۔ ایک کمرے میں مولوی احتشام الدین اردو لُغت کی تدوین میں مصروف رہتے تھے۔ کتب خانے کے وسیع ہال میں ہزاروں کتابوں اور مسوّدوں کے درمیان مولوی صاحب یوں بیٹھے رہتے تھے جیسے مراقبے میں ہوں۔ بس حقّہ کے غوغے اور دکنی کے اشعار کی تلاوت سے ان کی موجودگی کا ثبوت ملتا تھا۔

رسالۂ اردو (جولائی ۱۹۳۵ء) میں جب میرا مقالہ "ادب اور زندگی" شایع ہوا تو اس کا بڑا شہرہ ہوا اور مولوی صاحب کی فرمایش کے مطابق میں ہر شمارے کے لیے کوئی مضمون لکھتا، نیز ادبِ عالم کے اہم واقعات کو مرتّب کرتا اور "ناخدا" کے نام سے کتابوں پر تنقید کرتا تھا۔ یہ سلسلہ دو سال تک جاری رہا۔ گو میری تحریروں کا مزاج رسالہ کی روایت سے ہٹ کر تھا اور مولوی صاحب کا ذوق خالصتاً کلاسیکی تھا لیکن انھوں نے میرے قلم پر کوئی پابندی نہیں لگائی اور کسی اعتراض کی پروا نہیں کی۔ یہ مضامین بعد میں میرے

دونوں تنقیدی مجموعوں "ادب اور انقلاب" اور "روشن مینار" میں شامل ہوئے۔ فرصت کے وقت جو افسانے لکھے گئے، وہ "محبت اور نفرت" میں یک جا ہو گئے۔

ساتھ ہی ساتھ میں انگریزی، ہندی لغت کے ابتدائی مراحل سے گزرتا رہا لیکن ایک دلچسپ حادثے نے اس کام میں رخنہ ڈال دیا۔

رسالہ الناظر (لکھنؤ) کے مدیر ظفر الملک علوی ہر سال حیدرآباد کا پھیرا لگاتے تھے اور رئیسوں کو کشف و کرامات کے علاوہ یوگ کی ورزشوں کا بھی درس دیتے تھے۔ مولوی صاحب کو انھوں نے وہ ورزش سکھلائی جس میں آدمی سر کے بل کھڑا ہو جاتا ہے تاکہ خون دماغ کی طرف جائے اور اسے شیش آسن کہتے ہیں۔ مولوی صاحب کی عمر اس وقت ۶۵ سال تھی، تاہم جسم میں کس بل کی کمی نہ تھی۔ لیکن جب وہ سر کے بل کھڑے ہوئے تو شانہ اتر گیا اور ہم لوگوں نے انھیں اٹھا کر پلنگ پر لٹا دیا۔ درد میں اُف کرنا تو انھیں آتا نہ تھا۔ ایک بار بچھو نے انگلی میں ڈنک مار دیا اور یہ درد کو ضبط کیے چپ بیٹھے رہے۔ اس بار بھی انھوں نے تکلیف کا ذکر نہ کیا۔ ہاں لیٹے لیٹے ظفر الملک کو بُرا بھلا کہتے رہے۔ ابھی ان کی مالش اور دوا دارو جاری تھی کہ انھیں انگریزی اردو لغت کے فائنل پروف کے پلندے کا خیال آیا۔ آخری پروف وہ خود دیکھتے تھے۔ اورنگ آباد کا پریس باقاعدگی سے اس کام میں لگا ہوا تھا اور انھیں وسوسہ تھا کہ معلوم نہیں کتنی تاخیر ہو جائے۔ مجھ سے کہا کہ تم غور سے یہ پروف دیکھ ڈالو اور پھر ایک ایک ورق کی تنقیح مجھ سے کروا کر انھیں اورنگ آباد بھیج دو۔

مجھے اس قسم کے کام دقّتِ نظر سے کرنے کا شعور تھا۔ چنانچہ پروف کی تنقیح کرتے وقت میں نے چند ایسی غلطیوں کی نشان دہی بھی کی جو پچھلے پروف میں رہ گئی تھیں۔ اس کام سے مولوی صاحب بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے فی الحال ہندی لغت اٹھا رکھو۔ وہ کام بعد میں بھی ہو سکتا ہے۔ چنانچہ اس لغت کے "ایس" (S) سے لے کر آخر تک فائنل پروف میں نے پڑھے۔ لغت کا ضمیمہ اور اس کا مختصر ایڈیشن بھی تیار کیا۔

انگریزی ہندی لغت کا وہ ابتدائی مسودہ، پہلے ایڈیشن کی پہلی کاپی اور لغت کے متعلق مولوی صاحب کے خطوط اب تک میرے پاس محفوظ ہیں۔

اگر شمال کے ماحول میں ولولہ اور ہنگامہ خیزی کا احساس ہوتا تھا تو دکن میں سکون اور جماجمی کا گمان ہوتا تھا۔ یہی حال دنیا کے دوسرے شمالی اور جنوبی خطّوں کا ہے۔ خواہ امریکہ ہو یا یورپ۔ مدراس اگر ہندو علوم کا مرکز تھا تو حیدرآباد ہند اسلامی تہذیب کا گہوارہ۔ ساتویں صدی کے بعد جب شمال میں ہندو سماج کا دامن چاک ہونے لگا تو اس کی بخیہ گری دکن میں ہوئی اور اس کا روپ اب تک باقی تھا۔ ہندو سنگیت اور نرت کا انمول رس دکن میں ملتا تھا اور ویدانت یا سنسکرت کے ایسے پنڈت کہیں نہیں تھے۔ دکن میں اسلامی علوم کے متعلق ایسے دعوے نہیں کیے جاسکتے تھے، تاہم جامعۂ عثمانیہ کے دارالترجمہ دائرۃ المعارف اور انجمن ترقی اردو نے ایک ایسے باب کا اضافہ کیا تھا جس کی مثال شمال میں نہیں تھی۔ اس وقت صحیح معنوں میں حیدرآباد اور لاہور اردو کے دو بڑے مرکز تھے۔ اٹھارھویں صدی میں جب شمال کے مسلمانوں کے ہاتھ سے تلوار اور انیسویں صدی میں سپر تک گر گئی تو ایک میسور اور دوسری حیدرآباد کے حصّے میں آئی۔ ماضی ہو یا حال، کسی دور کی تہذیب نہ سراسر بے عیب ہوتی ہے، نہ سراسر عیب دار۔ یہی حال حیدرآباد کی تہذیبی روایت کا تھا جس کا ڈانڈا دہلی اور لکھنؤ سے ملتا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ جاگیرداری سے اس کا چولی دامن کا ساتھ تھا اور اس میں انحطاط کے آثار نمایاں تھے لیکن جب حیدرآباد پر ہندوستان نے فوج کشی کی تو یہ کسی بہتر معاشی نظام کا غلبہ نہیں، بلکہ ہندو قومیت کی یلغار تھی جس کی خوں چکاں داستان پنڈت سندرلال کی انکوائری رپورٹ میں درج ہے۔ یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ جاگیرداری نظام میں اگر آدمی ہل سے بندھا ہوتا ہے تو صنعتی سماج میں مشین کے ساتھ۔ آج کا آدمی مشین کا غلام ہے، اور خوش ہے کہ کولھو کا بیل نہیں رہا۔

مسز سروجنی نائیڈو کا خانوادہ

حیدرآباد میں سروجنی نائیڈو کے دولت کدے کی وہی آن بان تھی، جو کبھی پیرس کی نامی گرامی علم و فن کی سرپرست خواتین کے "سالون" کی ہوا کرتی تھی۔

انگریزی میں اس پائے کے شعر کہتی تھیں اور ایسی خوش تقریر تھیں کہ سب انھیں "بلبلِ ہند"

کہتے تھے۔ گو وہ کانگریس کی صفِ اوّل کی لیڈر تھیں، لیکن اپنی رواداری کی وجہ سے مسلمانوں میں بھی بہت مقبول تھیں۔ ان کے خانوادہ میں جیسے ذہین و فطین لوگ تھے، شاید ہی کسی اور گھر میں بیک وقت ان کی مثال نظر آئے۔ سروجنی کے والد اپنے زمانے کے مشہور سائنس داں تھے اور ان کے شوہر نامور سرجن تھے۔ ایک بھائی چٹوپادھیائے یورپ میں تعلیم ختم کر کے انقلاب کے بعد روس چلے گئے اور ایم۔ این۔ رائے کی طرح کمیونسٹ انٹرنیشنل (COMMUNIST INTERNATIONL) سے وابستہ ہو گئے۔ پھر جب اسٹالن نے پرانے انقلابیوں کا قتلِ عام کیا تو یہ بھی مارے گئے۔ اگر ایم۔ این۔ رائے ہندوستان بھاگ نہ آتے تو ان کا بھی وہی حشر ہوتا۔

مسز نائیڈو کے چھوٹے بھائی ہرین چٹرجی بے مثل اداکار، شاعر اور موسیقی داں ہیں لیکن ان سے زیادہ بے قرار آدمی دیکھنے میں نہ آیا۔ مسز نائیڈو کی بڑی لڑکی مس پدم جامدّتوں مغربی بنگال کی گورنر رہیں اور چھوٹی لیلامنی وزارت خارجہ کے اعلیٰ عہدے پر فائز رہیں۔ غرض کہ ہمہ خانہ آفتاب و ماہتاب تھا۔ ان سب سے میری ملاقات تھی، لیکن دوستی مسز نائیڈو کے بڑے لڑکے ڈاکٹر جیسوریہ سے تھی جنھیں سب "بابا" کہا کرتے تھے۔

جرمنی میں دس سال رہ کر اور ڈاکٹری کی اعلیٰ ڈگری لے کر بابا ابھی ابھی آئے تھے اور آتے آتے "ایوا" کو بیاہ لائے۔ یہ دونوں نازی دشمن تحریک میں عملی حصّہ لے چکے تھے، لہٰذا ہٹلر کے برسرِ اقتدار آتے ہی ہندوستان نکل آئے۔ مجھ سے اور حمیدہ سے اُن کے جو تعلّقات استوار ہوئے، جیتے جی باقی رہے۔ بابا، غیر مقلّد قسم کے اشتراکی تھے۔ ایسی جدّتِ طبع میں نے شاید ہی کسی اور میں دیکھی ہو۔

ان کی صحبت میں میری روح کے کئی گوشے روشن ہوئے۔ اب تک میرے کان موسیقی کے رس سے ناواقف تھے۔ بابا اور ایوا نے مجھے مغربی موسیقی کے رمز سمجھائے اور یورپ کے قیام کے وقت مجھے اس سے لذّت آشنا ہونے کے بہت سے موقعے ملے۔ ہندوستانی موسیقی کا شوق بعد میں امرت سر میں ہوا۔ میرے ان دوستوں کو حیوانوں سے محبّت تھی اور ان کے چھوٹے سے فلیٹ میں چرند و پرند امن و آشتی سے رہتے تھے۔ یہ شوق بھی مجھے اسی زمانے

میں ہوا اور اس کا پہلا تجربہ نادر منزل میں جس طرح ہوا، اس کا حال میں نے "مولوی عبدالحق کا چڑیا گھر" کے عنوان سے ایک مضمون میں بھی لکھا ہے۔ (مطبوعہ۔ اوراق، لاہور ۱۹۶۹ء) حمیدہ اور میرے لیے حیدرآباد میں "نادر منزل" کے بعد یہ فلیٹ ہمارا دوسرا گھر تھا۔

بات ۱۹۳۶ء کے آغاز تک پہنچی جب یورپ میں بحران اور ملک میں ہیجان برپا ہو چکا تھا۔ فاشزم نے ایسا زور باندھا کہ مسولینی کی افواج نے بڑی دیدہ دلیری سے حبشہ پر قبضہ کر لیا اور دنیا کہرام مچاتی رہ گئی۔ اس واقعہ کا مولوی صاحب پر گہرا اثر ہوا اور انھوں نے مجھے ایک کتاب مرتّب کرنے کی ہدایت کی۔ یہ کتاب انجمن نے "حبشہ و اطالیہ" کے نام سے شایع کی اور اس میں قاضی عبدالغفار، ڈاکٹر حمید اللہ، ڈاکٹر یوسف حسین وغیرہ کے مضامین شامل تھے۔

اس کے فوراً بعد ہٹلر اور مسولینی کی تائید سے جنرل فرانکو نے اسپین کی جمہوری حکومت کے خلاف بغاوت کا علم بلند کیا اور تین سال تک وہ خانہ جنگی برپا ہوئی جس نے دورِ جدید کی شعوری زندگی کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ فاشزم کی دانستہ حوصلہ افزائی مغربی ملکوں کے سرمایہ دارانہ مفاد نے کی۔ لیکن اسٹالن کو فاشزم کے خطرے کا شدید احساس تھا، اور اس کی ہدایت پر دنیا بھر کے کمیونسٹ فاشسٹ دشمن عناصر سے مل کر "متحدہ محاذ" بنانے میں مصروف تھے۔ یہ تحریک سیاست کے علاوہ علم، فن، ادب وغیرہ کی سمتوں میں بھی گامزن تھی اور اس میں اشتراکی (سوشلسٹ) لبرل وغیرہ سبھی شامل تھے۔ ۱۹۳۶ء میں سجّاد ظہیر وغیرہ نے اسی پس منظر میں انجمن ترقی پسند مصنّفین کی داغ بیل ڈالی تھی۔

ملکی سیاست بھی ایک نئے موڑ پر آ گئی تھی۔ ۱۹۳۵ء میں برطانوی پارلیمنٹ نے ہندوستان میں آئینی اصلاحات کا قانون پاس کر دیا تھا جس کی رو سے صوبائی خود مختاری کا اصول تسلیم کر لیا گیا تھا، اور اس کے مطابق صوبائی انتخابات کی تیاری شروع ہو رہی تھی۔ یہ قانون تقسیم ملک تک بلکہ آزادی کے بعد بھی ہندوستان اور پاکستان میں نافذ رہا تا آنکہ انھوں نے اپنے اپنے آئین مرتّب نہیں کر لیے۔

اس وقت کانگریس بڑی منظّم جماعت تھی اور اسے مسلمانوں کے قوم پرست گروہ اور کانگریس سوشلسٹ پارٹی کی تائید حاصل تھی، جس کی وجہ سے اس کی رجعت پسند قیادت پر پردہ پڑ گیا تھا۔ مسلم اکثریت کو اس قیادت پر کوئی اعتبار نہ تھا اور مسلم لیگ کی تنظیم نو کا کام جناح صاحب نے ابھی شروع کیا تھا۔ یہ صاف نظر آ رہا تھا کہ ہندو قومیت اور مسلم قومیت الگ الگ سمتوں میں رواں ہیں اور متّحدہ قومیت کی تحریک تھوڑے سے نیک نیت لوگوں تک محدود ہے۔ سیاست کا بایاں بازو کمزور تھا اور اُسے برطانوی سامراج سے زیادہ یورپ کے فاشسزم کا فکر لاحق تھا۔ پھر جواہر لال نہرو کا جادو اس کے سر پر ایسا چڑھا کہ اندرا گاندھی کے دور تک نہیں اُترا۔

یہ صورتِ حال تھی کہ اپریل کا مہینہ آ گیا جب مولوی صاحب شمال کے سالانہ دورے پر نکلتے تھے۔ اسی وقت گاندھی جی کا دعوت نامہ موصول ہوا جس میں تحریر تھا کہ قومی جدوجہد میں ادیبوں کی کارگزاری پر غور و خوض کے لیے انھوں نے ناگپور میں مہینہ کے آخر میں ایک جلسہ منعقد کیا ہے۔ ملک کے ایک سو منتخب دانش وروں اور ادیبوں کو مدعو کیا گیا تھا جن میں مولوی صاحب کے علاوہ میں بھی شامل تھا۔ اس وقت ہم نے دعوت نامے پر کوئی توجہ نہیں دی، اور ریل پر بیٹھ کر دہلی روانہ ہو گئے۔

حیدرآباد کی شمالی سرحد پر قاضی پیٹھ نامی جنکشن تھا، جہاں ریل پٹری بدل کر دہلی کی جانب رواں ہو جاتی تھی۔ لیکن پلیٹ فارم پر چہل قدمی کے لیے اترا تھا کہ شام کے جھٹ پٹے میں جگر صاحب نظر آئے جو وحشت کے عالم میں اِدھر اُدھر گردش کر رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر ان کی باچھیں کھل گئیں اور بولے، میاں کسی طرح مشکل کشائی کرو۔ پیاس سے گلے میں کانٹے پڑ رہے ہیں۔ میں اُن کی بے کلی کی وجہ سمجھ گیا اور پوچھا، تردّد کیا ہے۔ بیرے سے کہیے ڈبّے میں پہنچا دے گا، اور یہ منظور نہیں تو اسٹیشن کے بار میں بیٹھ کر پی لیجیے۔ لیکن جگر صاحب کو یہ دونوں باتیں پسند نہ تھیں۔ انٹر کے ڈبّے میں ہم سفر انھیں پینے کی اجازت کیسے دیتے، اور بار میں بیٹھنے میں خدشہ تھا کہ کہیں گاڑی نہ چھوٹ جائے۔ جب میں نے مولوی صاحب

کو یہ ماجرا سُنایا تو انھوں نے بلا تکلّف کہا کہ جگر کو یہیں بلا لاؤ اور بیرے سے کہو کہ اُن کے لیے نوشش دارو لائے۔ یہ سُن کر مجھے سخت حیرت ہوئی، لیکن مولوی صاحب کسی قسم کے احتساب کو پسند نہ کرتے تھے۔ چنانچہ جب جگر شرماتے ہوئے ہمارے سیکنڈ کلاس کے ڈبّے میں داخل ہوئے اور بصد معذرت مولوی صاحب کے سامنے مؤدّب جام پر جام لنڈھانے لگے تو بڑی دل لگی رہی۔ پھر جب رنگ چڑھا تو وہ لہک لہک کر اپنا کلام سُناتے رہے اور اس کی داد مولوی صاحب ہوں، ہاں یا مُنھ چڑھا کر دیتے رہے۔ خاصی دیر بعد جب ٹرین کہیں ٹھیری تو جگر ہنسی خوشی ہم لوگوں سے رخصت ہو کر اپنے ٹھکانے چلتے بنے۔

جب ہم دہلی پہنچے تو پلیٹ فارم پر مجاز انتظار کر رہے تھے۔ میں نے انھیں پہلے سے اطلاع دے دی تھی۔ مولوی صاحب اپنے آبائی وطن ہاپوڑ، برادر بزرگ ضیاء الحق صاحب سے ملنے دو دن کے لیے جا رہے تھے، اور میرا رُخ علی گڑھ کی طرف تھا۔ فرمایا کہ تم بھی ہاپوڑ چلے چلو۔ وہاں سے علی گڑھ چلے جانا اور میں لاہور ہوتا ہوا فلاں تاریخ کو دہلی میں ڈاکٹر انصاری کی کوٹھی میں ملوں گا۔ اُسی رات کو حیدرآباد روانگی ہے۔ یہ پروگرام بنا کر ہم ریستوراں میں بیٹھ گئے۔ کیونکہ گاڑی چلنے میں ڈیڑھ گھنٹے کی دیر تھی۔ اس اثنا میں وہ مجاز سے ہنسی مذاق کی باتیں کرتے رہے۔ اس حد تک کہ اُس غریب کو "چونچ" کہہ کر پکارنے لگے اور بعد میں جب کبھی مجاز کا ذکر آیا، اُسے پیار سے "چونچ" ہی کہتے تھے۔

مولوی عبدالحق کے بڑے بھائی — ضیاء الحق

شیخ ضیاء الحق مولوی صاحب سے عمر میں کئی سال بڑے تھے۔ دراز قد، سینہ چوڑا چکلا، دہانہ پھیلا ہوا، رنگ گہرا سانولا، چھوٹی چھوٹی دھنسی ہوئی چمک دار آنکھیں، آواز میں گھن گرج۔ غرض ایسے کلّے ٹھلّے کے آدمی تھے کہ پہلی نظر میں ڈر لگتا تھا۔ وہ "پمفلٹ باز" کے لقب سے مشہور تھے، کیونکہ اظہارِ مدّعا کتاب یا مضمون میں نہیں پمفلٹ میں کرتے تھے۔ اُن کی ذات سے جو روایت منسوب تھی، اس کا ذکر ذرا تفصیل سے کیا جائے گا۔

اس صدی کے آغاز میں ہندوستان میں برطانوی سامراج میں ایسا استحکام نظر آتا تھا

کہ چند وکیلوں اور دانشوروں کے علاوہ کوئی اس پر حرف زنی کی جسارت نہیں کرتا تھا۔ لیکن بعض قوم پرست نوجوانوں نے دہشت پسندی کا راستہ اختیار کیا اور اس غرض سے جو خفیہ تنظیمیں بنائیں، ان میں سے دو نے آزادی کی جنگ میں خاص کردار ادا کیا۔ ایک تو بنگال کی "یگانتر پارٹی" اور دوسری جلاوطن حریت پسندوں کی غدر پارٹی، جس کی نشو و نما کینیڈا اور امریکہ میں ہوئی۔ مولوی برکت اللہ بھوپالی اس کے سرگرم رکن تھے اور ان کی سوانح عمری میں اس کا مفصل حال ملے گا۔

"یگانتر پارٹی" کا اوّلین مقصد یہ تھا کہ بنگال کی تقسیم کو کالعدم کیا جائے جو ۱۹۰۵ء میں عمل میں آئی تھی۔ اس سلسلے میں انگریزوں کے خلاف دہشت گردی کے کئی واقعات سرزد ہوئے جن میں سب سے سنگین وہ حادثہ تھا جو علی پور بم کیس سے موسوم ہے۔ بھری عدالت میں انگریز سیشن جج کو ہلاک کرنے کے الزام میں خودی رام بوس نامی نوجوان کو پھانسی کی سزا دی گئی تھی اور اس نے اپنی صفائی میں ایسا ولولہ انگیز بیان دیا تھا کہ ملک کی مُردہ رگوں میں تازہ خون دوڑ پڑا۔ اسی موقع پر اکبر الہ آبادی نے کہا تھا ؎

پروانہ کا حال اس محفل میں ہے قابلِ رشک اے اہلِ نظر
اک رات ہی میں پیدا بھی ہوا عاشق بھی ہوا اور مر بھی گیا

ٹیگور نے اس واقعے کی یاد میں جو نظم لکھی وہ اس طرح شروع ہوتی ہے:

جودی تو مار ڈاک شُنے کیُو آشے نا تو بے ایکلا چولو رے

ایکلا چولو، ایکلا چولو، ایکلا چولو رے

اگر تیری پکار سُن کر کوئی نہیں آتا، تو نہ سہی۔ تو اکیلا چلا چل، اکیلا چلا چل

اس نظم کی تال پر معلوم نہیں کتنے آتش نفس، آزادی اور انقلاب کی راہ پر چل پڑے تھے۔ جب بنگال کے دونوں حصے از سرِ نو متحد کر دیے گئے تو "یگانتر پارٹی" کا زور ٹوٹ گیا۔ اور اس کے کچھ ارکان شمالی ہند میں پھیل گئے۔ ان میں راس بہاری بوس کا نام قابلِ ذکر ہے کیونکہ ۱۹۱۵ء میں جب دہلی میں وائسرائے لارڈ ہارڈنگ پر سربازار بم پھینکا گیا تو شبہ انھیں کے گروہ پر ہوا۔ ان میں سے کئی پکڑے گئے اور کئی بھاگ گئے۔ راس بہاری بوس جاپان

چلے گئے اور تا عمر برطانوی سامراج سے نبرد آزما رہے۔ مفروروں میں ضیاء الحق، سردار اجیت سنگھ (شہید دکن بھگت سنگھ کے چچا) اور صوفی امبا پرشاد بھی تھے۔ ان میں سے ضیاء الحق بعد میں ہندوستان لوٹ آئے، باقی دونوں باہر رہ گئے۔ اجیت سنگھ نے برازیل میں سکونت اختیار کرلی اور گزشتہ جنگ عظیم میں اطالوی ریڈیو پر "آزاد ہند حکومت" کی خدمت انجام دی۔ امبا پرشاد (مراد آبادی) شیراز میں رہ پڑے اور تصوّف کے رنگ میں ایسے ڈوبے کہ "ہندی صوفی" کہلائے۔ ۱۹۵۹ء میں جب میں پہلی بار شیراز گیا، تو کسی نے ان کی قبر کا پتا دیا جو خواجو کرمانی کے مدفن کے پاس تھی۔

واپس آکر شیخ ضیاء الحق نے انگریز سے صلح کرلی لیکن راجہ رئیسوں پر پمفلٹ کا وہ طومار باندھا کہ وہ پناہ مانگنے لگے۔ اس مہم میں دیوان سنگھ مفتوں سے ان کا یارانہ ہوگیا اور خواجہ حسن نظامی سے ٹھن گئی۔

دو دن کی ملاقات میں ان کی تین باتیں یاد رہ گئیں۔ انھیں صفائی کا ایسا شوق تھا کہ صبح کاذب کے وقت لال ٹین جلا کر نوکروں کو آواز دیتے اور پھر جاروب کے زرّاٹوں اور پانی کے شرّاٹوں کا وہ شور اٹھا کہ نیند حرام ہوگئی۔ جب پَو پھٹی تو میں نے مولوی صاحب سے کہا کہ "چلیے ذرا باہر سیر کر آئیں"۔ انھوں نے کہا کہ اس کا موقع نہیں ہے کیونکہ ہر طرف بندر مورچہ تھامے بیٹھے ہوں گے اور جب تک شہر میں جاگ نہ پڑ جائے، یہ نہیں ہٹیں گے۔

ضیاء الحق صاحب کا دوسرا شوق پکانے اور کھلانے کا تھا۔ اپنے ہاتھ سے پکا کر جو نعمتیں انھوں نے دسترخوان پر رکھیں، ان کی لذّت کبھی نہ بھولی۔

شیخ ضیاء الحق کے پاس اردو اخباروں اور رسالوں کا اپنا نادر مجموعہ تھا کہ میں نے اور کہیں نہیں دیکھا۔ انیسویں صدی سے لے کر زمانۂ حال تک کے ہزاروں فائل بڑے قرینے سے ان کے کتب خانے میں رکھے ہوئے تھے اور جب دونوں بھائی نجی باتوں میں مصروف ہوتے تو میں گھنٹوں ان کی ورق گردانی کیا کرتا تھا۔

سال بھر بعد ضیاء الحق صاحب کا انتقال ہوگیا، اور یہ ذخیرہ ان کے گھر پر ہی رہا۔ خبر نہیں، اب کس کی تحویل میں ہے۔

ساہتیہ پرشد ناگپور کا جلسہ

اپریل ۱۹۳۶ء کے آخری ہفتہ کی مقررہ تاریخ کو میں ڈاکٹر انصاری کی کوٹھی پہنچا تو مولوی صاحب کو موجود پایا۔ لاہور کے دورے کا حال سناتے ہوئے انھوں نے یک بیک کہا "تمھارے بھائی تو بڑے کام کے آدمی ہیں۔ میں ان سے مل کر خوش ہوا اور لاہور کے احباب کے مشورے کے بعد فیصلہ کیا گیا کہ انھیں اورنگ آباد بلالوں تاکہ انجمن کے مینیجر کی ذمہ داری سنبھالیں"۔ واقعتاً اس وقت انجمن کے انتظامی حالات دگرگوں تھے۔ مولوی صاحب کی عدم موجودگی اور مروّت سے کچھ لوگ علانیہ ناجائز فائدہ اٹھا رہے تھے اور وہ کسی دیانت دار مینیجر کی تلاش میں تھے۔ چند ماہ بعد شمیم صاحب نے اپنا عہدہ سنبھالا اور ایسی جاں فشانی سے بدنظمی کی اصلاح کی جو ریاستی ماحول کے لحاظ سے قرینِ مصلحت نہ تھی۔ نتیجہ برایں شمیم دل برداشتہ ہو گئے اور دو سال بعد جب انجمن کا کاروبار دہلی منتقل ہوا تو وہ استعفیٰ دے کر بمبئی چلے گئے۔

ہماری ٹرین شام کو حیدرآباد جاتی تھی، لہٰذا وقت کاٹنے کے لیے مولوی صاحب نے جامعہ ملّیہ کا قصد کیا جو اس زمانے میں قرول باغ میں کرائے کے مکانوں میں واقع تھی۔ ہم پروفیسر مجیب کے گھر اُتر گئے اور انھوں نے ڈاکٹر ذاکر حسین وغیرہ کو خبر کر دی۔ باتوں باتوں میں ذاکر صاحب نے کہا کہ کل ناگپور میں گاندھی جی کا جلسہ ہے، آپ لوگ ہمراہ کیوں وہاں کھیر نہیں جاتے۔ معلوم نہیں مولوی صاحب کو وہ دعوت نامہ یاد تھا یا نہیں۔ مجھے یاد ضرور تھا مگر میں نے دانستہ اس کا ذکر نہ کیا تھا کیونکہ تا ایں دم مولوی صاحب گاندھی جی کے مدّاح تھے اور میں سخت بدظن تھا۔ غرض اس مشورہ پر مولوی صاحب نے لبیک کہا کہ مختلف زبانوں کے دانشوروں سے ملاقات ہو جائے گی اور گاندھی جی سے بالمشافہ گفتگو کا موقع ملے گا۔

گاڑی دوسرے دن صبح اٹارسی جنکشن پہنچی، جہاں الہ آباد کی ٹرین سے سنگم ہوتا تھا، اس میں سے پنڈت نہرو کے ہمراہ منشی پریم چند اور آچاریہ نریندر دیو کو برآمد ہوتے دیکھا۔ پریم چند نے مجھے آواز دی اور احوال معلوم کر کے پنڈت جی سے میری ادبی سرگرمیوں کا تعارف کرایا۔ انھوں نے ہنس کر کہا "میں ان حضرت کو دوسری حیثیت سے جانتا ہوں۔ پھر مزے لے لے کر وہ علی گڑھ

کے اس سفر کا قصّہ سناتے رہے اور چیں بہ جبیں ہو کر پوچھا "تمھیں کچھ اور کرنا چاہیے۔ لغت نویسی بوڑھوں کا کام ہے اور ریاست میں کسی آزاد خیال کے لیے گنجایش نہیں۔" آچاریہ نریندر دیو کانگریس سوشلسٹ پارٹی کے صدر اور مشہور ماہر تعلیم تھے۔ ہم اس طرح بلا ارادہ ناگپور پہنچے تھے کہ نہ کسی کو اطلاع دی تھی نہ کہیں ٹھیرنے کا انتظام کیا تھا چنانچہ اسٹیشن کے ویٹنگ روم میں ہی رہ پڑے۔

شاہتیہ پرشد، کے جلسے میں گاندھی جی نے جو گل کھلایا، وہ سب کو معلوم ہے اور اس کی جو روداد مولوی صاحب نے قلم بند کی تھی، وہ تاریخی دستاویز ہے۔ جب گاندھی جی نے ادبی مسائل سے صرفِ نظر کر کے لسانی بحث میں سارا دن لگا دیا اور جلسے کی فضا مکدّر ہو گئی تو میں نے پنڈت نہرو سے بیزاری کا اظہار کیا۔ دوسرے دن ان کے مشورے پر ادیبوں کے فرائض کی تشریح کے لیے جو بیان تیار کیا وہ میری کتاب "ادب اور انقلاب" کا پیش لفظ ہے۔ اس پر مولوی عبدالحق، پنڈت نہرو، منشی پریم چند، آچاریہ نریندر دیو اور میرے دستخط تھے۔ گاندھی جی نے ہماری اس تجویز کو نامنظور کر دیا کہ اس بیان کو جلسے کا فیصلہ تصوّر کیا جائے، البتہ مجھے اسے پڑھ کر سنانے کی اجازت ضرور دی اور اس کے لیے کلمۂ خیر بھی کہا۔

جو بحث یہاں شروع ہوئی، اس نے آگے چل کر لسانی سیاست کی شکل اختیار کر لی اور لامحالہ قومی سیاست کا ضمیمہ بن گئی۔ اس کے بعد اردو کا تحفظ، مسلم لیگ کی سیاست کا ایک اہم نکتہ قرار پایا، اور دوسری طرف سے ہندی، ہندو، ہندوستان کا نعرہ بلند ہوا۔ پہلے تو سمجھ میں نہ آیا کہ گاندھی جی نے خواہ مخواہ ہندی اردو کا قضیہ کیوں شروع کیا اور ادبی مسائل کی بجائے لسانی عداوت کیوں پیدا کی۔ بعد میں جا کر اصل بھید کھلا۔ گاندھی جی باخبر سیاست دان تھے لیکن ادبی اور ثقافتی معاملات میں ان کے مشیر کے۔ ایم منشی اور کاکا کالیکر جیسے متعصّب فرقہ پرست تھے جن میں سے ایک گجراتی اور دوسرا مرہٹی کا نامی گرامی مصنّف تھا۔ انھوں نے گاندھی کو سمجھایا کہ ادب میں جدید خیالات عام ہو رہے ہیں اور اگر فوری طور پر ادیبوں کو کانگریس کے جھنڈے تلے جمع نہ کیا گیا تو وہ کسی اور طرف بہک جائیں گے۔ بنا بریں گاندھی جی جلسے کی تشکیل کے لیے آمادہ ہو گئے۔ اس کی تاریخ ہندی ساہتیہ سمّیلن

کے سالانہ جلسے کے ساتھ رکھی گئی جو ناگپور میں منعقد ہوا تھا۔ اس طرح ساہتیہ پرشد کے جلسے میں ہندی کے طرف دار بڑی تعداد میں جمع ہو گئے اور پس پردہ یہ طے پایا کہ اسی وقت طے کرا لیا جائے کہ قومی زبان ہندی اتھوا (یعنی) ہندوستانی ہو گی۔ یہ تجویز کانگریس کے اس فیصلے کے منافی تھی کہ قومی زبان ہندوستانی ہو گی جس سے مراد شمالی ہند کی وہ بول چال کی زبان ہے جو ہندی یا اردو میں لکھی جاتی ہے۔

بعد از خرابیٔ بسیار ۱۹۴۵ء میں گاندھی جی کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور انھوں نے "ہندوستانی لٹریچر بورڈ" کے قیام کا ارادہ کیا۔ بورڈ کے دس ارکان میں ڈاکٹر تارا چند، پنڈت سندر لال، ڈاکٹر ذاکر حسین وغیرہ کے ساتھ میرا نام بھی رکن اور سکریٹری کی حیثیت سے شایع ہوا، لیکن اب مصالحت کے دروازے بند ہو چکے تھے۔ ہندو مسلم مفاہمت کے ایک بڑے پُل کو گاندھی جی نے ہماری نظر کے سامنے توڑ دیا تھا۔ جب کلچر اور ادب سیاست کے گرداب میں آتے ہیں تو انجام یہی ہوتا ہے۔

ساہتیہ پرشد کے جلسے نے مولوی صاحب کی زندگی اور انجمن کے لائحۂ عمل کو بدل کر رکھ دیا۔ حیدرآباد ہوتے ہوئے چند روز بعد ہم اورنگ آباد پہنچے، تو سب سے پہلے مولوی صاحب نے اپنے کمرے سے چرخہ اٹھا کر پھینک دیا اور کھادی کے کپڑے تہ کر دیئے، طاق سے وہ لُٹیا بھی ہٹا دی، جو لوک مانیہ تلک کبھی سیاسی روپوشی کے زمانے میں چھوڑ گئے تھے۔ ان کے چہرے پر نرمی کے بجائے سختی نمایاں ہو گئی تھی اور آنکھوں میں فکر کی بدلی کے بجائے عزم کی دھوپ چمکنے لگی تھی۔ کبھی افسوس اور کبھی غصّے کے لہجے میں وہ بار بار کہتے تھے۔ میں گاندھی کو بے ریا اور قومی اتحاد کا داعی سمجھتا تھا لیکن وہ تو قومی زبان کو مٹانے کے درپے ہے۔ اب ہمیں اردو کی حفاظت کے لیے ہر قسم کی قربانی دینے کا تہیہ کرنا ہے، اور انجمن کو فعال اور تنظیمی ادارہ بنانا ہے۔

اس کا عملی ثبوت انھوں نے یوں دیا کہ انگریزی ہندی لغت کے کام کو منسوخ کر دیا۔ اس سے کوئی خاص فرق نہ ہوا کیونکہ یہ ابھی ابتدائی مرحلے میں تھا اور میں کچھ وقت سے انگریزی اردو ڈکشنری میں مصروف تھا۔ میں نے بمبئی سے اندولال یاجنک کی کتاب

GANDHI AS I KNOW HIM منگوائی تو پڑھ کر دنگ رہ گئے اور بولے "میں نہ جانتا تھا کہ گاندھی ایسا ابلہ فریب ہوگا، اس کا ترجمہ ہونا چاہیئے۔ غرض یہ کہ مولوی صاحب کا ردّ عمل شدّت اختیار کرتا گیا اور اردو سے ان کی بے پایاں محبت کا تقاضہ بھی یہی تھا۔

ایک تو میری دلچسپی یک سر علمی اور ادبی تھی جس میں زبان کی حیثیت وسیلۂ اظہار سے زیادہ نہ تھی۔ دوسرے اردو سے وابستگی کے باوجود ہندی سے عناد کا جذبہ نہ رکھتا تھا۔ میرا عقیدہ تھا کہ ہر دانشور کو روز افزوں فرقہ پرستی کا مقابلہ کرنا چاہیئے کیونکہ یہ رجعت پروری کی بدترین شکل ہے۔ مولوی صاحب کا معاملہ اور تھا۔ انھوں نے سرسیّد کے زمانے میں ہندی اردو تصادم کی ابتدا دیکھی تھی اور گاندھی کے چیلنج کے خطرے کو سمجھنے کا زیادہ تجربہ رکھتے تھے۔

اسی وقت دو باتیں ایسی ہوئیں جنھوں نے مجھے چونکا دیا اور اپنے مستقبل کے متعلق سوچنے پر مجبور کیا۔ مولوی صاحب نے ادب عالیہ کے سو شاہکاروں کو اردو میں منتقل کرنے کی اسکیم پر غور و خوض شروع کر دیا تھا۔ ان کا ارادہ تھا کہ سال بھر بعد ڈکشنری کا کام ختم کر کے میں ہمہ وقت اسی طرف لگ جاؤں گا۔ مجھے اس تجویز میں ایسا انہماک ہوا کہ فرصت کا وقت فہرست بنانے میں صرف کرتا تھا۔ مگر ایک دن مولوی صاحب نے کہا "فی الحال اس خیال کو ترک کرنا ہوگا۔" اس مایوسی کا داغ ابھی تازہ تھا کہ انھیں کہتے سنا "اس کی طبیعت میں ایسی وحشت ہے کہ مجھے دھڑکا لگا رہتا تھا کہ جانے کس دن اُٹھ کر چلا جائے۔ لیکن شادی کے بعد یہ کہیں نہیں جا سکتا۔"

اس ایک جملے نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔ شمیم صاحب کی رضامندی سے میں نے رائے پور کی جائداد بیچنے کا فیصلہ کیا اور وہاں جا کر اسے اونے پونے بیچ دیا۔ سچ کہا ہے کہ "سب گھٹا دیتے ہیں مفلس کی غرض، مال کا مول" اگر کچھ وقت وہاں بیٹھا رہتا تو دوگنے دام ملتے۔ لیکن ایسے کاموں کے لیے میرا مزاج موزوں نہیں ہے۔ بہر صورت اس بندھن کو توڑ کر جب حیدرآباد

لوٹا تو چند ہزار روپے گرہ میں تھے، جن میں سے آدھے بھائی کو بھیج دئے۔ میں دنیا داری سے ناواقف تھا، مگر حوصلہ اور جرأت کی کمی نہ تھی۔ اب وقت آگیا تھا کہ آیندہ کے متعلق کوئی صاف و صریح پروگرام بنالوں۔ میں نے طے کیا کہ حیدرآباد چھوڑ کر دہلی چلا جاؤں اور وہاں سے اردو میں ایک نئے قسم کا ہفتہ وار اخبار نکالوں۔ میری سرشت میں ایسی گردشِ پرکار تھی کہ جہاں سکون سے بیٹھا، وہاں خفقان اٹھنے لگا اور لطفِ خرام کو دل ترسنے لگا۔ بس حیدرآباد کی محفلوں سے جی اکتانے لگا اور ایک دن میں نے جی کڑا کر کے مولوی صاحب کو اپنے ارادے سے آگاہ کر دیا۔

مجھے وہ شام یاد ہے۔ حقّے کا گہرا کش کھینچ کر وہ دیر تک خاموش رہے اور پھر کہا۔ "یہ سچ ہے کہ میرے اصرار پر یہاں آتے وقت تم نے صاف کہہ دیا تھا کہ دو سال سے زیادہ نہ رہو گے۔ مگر ابھی ۱۹۳۶ء کا آخر ہے اور ڈکشنری کا مختصر ایڈیشن ختم کرنا ہے۔ بعد ازاں تصنیف و تالیف کے سلسلے میں انجمن کو تمھارے تعاون کی ضرورت ہوگی"۔ میں نے یقین دلایا کہ دہلی سے میں یہ خدمت باقاعدگی سے انجام دیتا رہوں گا۔ اگر ابھی چلا جاؤں تو اخبار کے ابتدائی انتظامات میں آسانی ہوگی۔

ظاہر ہے کہ وہ میری ضد سے ناخوش ہوئے۔ انھوں نے مجھے اور حمیدہ کو وہ شفقت دی جو صرف باپ دے سکتا ہے، اور ہم نے ان کا اتنا ہی احترام کیا۔ لیکن بالآخر میں انجمن کا ملازم تھا اور مجھے معلوم تھا کہ آگے چل کر میرا نباہ نہ ہو سکے گا۔ مناسب یہی تھا کہ کسی اختلاف یا بدمزگی سے قبل کوئی اور راستہ اختیار کر لوں۔

دہلی پہنچ کر شاہد احمد کی مدد سے میں نے دریا گنج میں سربلند جنگ کی کوٹھی میں فلیٹ کرائے پر لیا اور اخبار کے لیے ڈکلریشن داخل کر دیا۔ اہل کاروں نے اسی وقت ہوشیار کر دیا کہ دار و مدار حیدرآباد کی رپورٹ پر ہے اور اس کے آنے میں دیر لگے گی۔ مولوی صاحب کو اس امر کی اطلاع دے کر میں کچھ ڈکشنری کے کام میں اور کچھ مجوزہ اخبار کے معاملات میں مصروف ہو گیا۔

علی گڑھ کے دورانِ قیام سے شاہد احمد سے جو ادبی رفاقت شروع ہوئی وہ کراچی میں موسیقی کی محفلوں تک باقی رہی۔ جب کبھی میں دہلی میں کھاری باؤلی کی پُرپیچ گلیوں سے گزر کر ان کے بالاخانے پر پہنچتا تو ان کا چکور جو چوکیداری کے فرائض انجام دیتا تھا، فرطِ جوش میں مجھ پر حملہ آور ہوتا، کاتب آواز لگاتے کہ اختر صاحب آگئے۔ ان سے مضمون وصول کیجیے، اور انصار ناصری، فضل حق قریشی، صادق الخیری، جملہ احباب جمع ہو جاتے تھے۔ میرے کچے گانوں کے مقابلے میں شاہد صاحب کے پکّے گانوں کا رنگ پھیکا پڑ جاتا تھا۔ دن بھر کی مضمون نگاری اور خوش گپّی کے بعد ہم کباب کی تلاش میں جامع مسجد کی سیڑھیوں کی طرف چل پڑتے تھے۔ شاہد احمد کے "ساقی" اور صلاح الدین احمد کے "ادبی دنیا" نے اردو دانوں میں جو ذوق پیدا کیا، اسے کیسے بھلایا جا سکتا ہے؟ ان دونوں کے خلوص کا میرے دل پر گہرا نقش ہے۔

دو ماہ کے انتظار کے بعد اخبار کے ڈکلیشن کی درخواست حکّام نے مسترد کر دی، اور دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ حیدرآباد کی رپورٹ خاطر خواہ نہ تھی۔ یہ سن کر میرے اوسان گُم ہو گئے۔

مولوی عبدالحق کی شخصیت کے بعض پہلو

مولوی صاحب کی ظاہری شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ لیکن ان کی داخلی زندگی رازِ سربستہ رہ گئی۔ ان کے ہم نشیں یا تو اس کی کیفیتوں سے لاعلم رہے اور یا کسی مصلحت سے خاموش رہے۔ اگر مولوی صاحب کی یادداشتیں دستِ بُردِ زمانہ سے بچ رہی ہیں تو شاید ان پر روشنی پڑے۔

عملی سیاست سے انھیں کوئی سروکار نہیں رہا۔ یوں عمر کا بڑا حصّہ حیدرآباد جیسی ریاست میں بسر کرنے کی وجہ سے وہ لازماً وہاں کی سیاست کے مزاج سے خوب واقف تھے۔ اس کا ایک رخ تھا برطانوی اقتدار اور نظام کی خود مختاری میں خاموش کشمکش۔ میر محبوب علی خاں کے انتقال کے وقت جب وراثت کا مسئلہ چھڑا تو انگریز نے بے جا مداخلت کی کوشش کی

اور چند محبّانِ وطن موردِ عتاب ہوئے۔ مولانا ظفر علی خاں تو حیدر آباد سے رخصت کر دئے گئے اور مولوی عبدالحق کا تبادلہ اورنگ آباد کے ویران علاقے میں کر دیا گیا۔ مولانا ظفر علی خاں نے اس واقعے کی طرف اشارہ کیا ہے:

وہ کہنی مارنے والوں کا ساتھ اگر دیتے
نظام آج نہ ہوتا غلام ٹامی کا

میر محبوب علی خاں نے اپنے اشعار میں کہیں کہیں انگریز کی غلامی سے نجات کی تمنّا کا اظہار کیا ہے:

یہ کہہ رہی ہے پلٹ کر نگاہِ یار ابھی
زمانہ اور بھی بدلے گا ایک بار ابھی

مولوی صاحب کی سیاسی سوجھ بوجھ کا اصل جوہر دہلی آ کر کھلا، جب انھوں نے اردو کی خاطر گاندھی جی سے مقابلے کے لیے مسلم لیگ کا تعاون حاصل کیا، اور اہالیانِ حیدر آباد سے اس کا تعلق قائم کیا۔

میرا ذہن اس تجسس میں رہتا تھا کہ انجمن اور کوہ و دمن کے اندر جو انسان چھپا ہوا ہے اُسے کسی ترکیب سے دیکھوں۔ سب جانتے ہیں کہ زمانۂ طالب علمی کی چند روزہ شادی اور طلاق کے بعد مولوی صاحب رشتۂ ازدواج کے پابند نہیں ہوئے۔ ایک بار سڑک پر شادی کا بینڈ بجا تو مولوی صاحب تالی بجا کر شور مچانے لگے "اُلّو پھنسا، اُلّو پھنسا" اور میں نے پیپل کے سوکھے ڈنڈ کی طرف دیکھا تو انھوں نے ایک گندم نما جو فروش کی طرف اشارہ کیا جو عقدِ ثانی کی تیاری کر رہا تھا۔

یہ نہیں کہا جا سکتا کہ مولوی صاحب عورت ذات کے خلاف تھے۔ البتہ وہ اس طوق کو ناپسند کرتے تھے جسے شیخ سعدیؒ ازراہِ وضع داری سنّتِ رسول اللہ کہہ کر زینتِ گردن بنائے رہے۔

ایک بار میں گراموفون خرید لایا تو مولوی صاحب نے اپنی تجوری سے کوئی شکستہ ریکارڈ نکالا اور کہا اسے بجاؤ۔ دکن کے شہر شولاپور کی گوہر نامی ممتاز گلوکارہ کا یہ گیت تھا۔ آواز

میں کیا موہنی تھی۔ اظہار میں کیا کسک تھی۔ خاموشی سے دو تین بار اسے سن کر انھوں نے ٹھنڈی سانس لی اور کہا "اس ریکارڈ کو تم رکھ لو۔ وہ یادگار اب تک میرے پاس محفوظ ہے ؎

عالمِ ہو میں اک آواز سی آجاتی ہے
چپکے چپکے کوئی کہتا ہے فسانہ دل کا

یہ سوچا بھی نہ تھا کہ حیدرآباد میں تحریر اور تقریر کے بے محابا استعمال کا یہ انجام ہوگا۔ جامعہ عثمانیہ کے کئی روشن دماغ طلبہ پر ان کا اثر ضرور ہوا تھا، جن میں مخدوم محی الدین سے میری دوستی اسی نوعیت کی تھی جیسی علی گڑھ میں مجاز سے۔ بعد میں مخدوم صرف قلم نہیں بلکہ عمل کے بھی دھنی ثابت ہوئے۔ جامعہ کی سیاست کی وجہ سے مولوی صاحب ان سے ناراض تھے اور مجھے ان کی ملاقات سے باز رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ ہماری بیٹھک کبھی بابا کے فلیٹ میں ہوتی یا عابد روڈ کے کسی چائے خانے میں۔ اس طرح ہم نے ایک ادبی انجمن کی طرح ڈالی جسے حیدرآباد کی ترقی پسند تحریک کا سنگِ بنیاد سمجھنا چاہیئے۔

اخبار کا جو سراب مجھے دہلی لے آیا تھا، آنکھ سے اوجھل ہو چکا تھا، اور مجھے کوئی دوسرا راستہ تلاش کرنا تھا۔ یہی وہ موقع تھا جب سجاد ظہیر سے دہلی میں ملاقات ہوئی۔ اس کا تذکرہ انھوں نے "روشنائی" میں کچھ اس انداز میں کیا ہے "اختر حسین سے ملاقات ہوئی جو مولوی عبدالحق سے لڑ کر دہلی آگئے تھے۔ وہاں کی انجمن ترقی پسند مصنّفین کے معاملات سے میں مطمئن نہ تھا، لہٰذا ان سے کہا کہ اس کی ذمّہ داری سنبھال لیں۔ لیکن وہ تیار نہیں ہوئے کیونکہ انھیں بڑا آدمی بننے کی دُھن تھی"۔ تعجب ہے کہ سجّاد ظہیر جیسے سنجیدہ آدمی کے قلم سے ایسی چھوٹی بات نکل گئی۔ میں نے عذر میں ان سے یہی کہا تھا کہ میں دہلی سے جلد چلا جاؤں گا، کیونکہ وہاں رہنے کا اب کوئی جواز نہیں ہے۔

اپریل میں مولوی صاحب شمال کے سالانہ دورے پر آئے اور دہلی میں میرے غریب خانے پر قیام فرمایا۔ جب میں حیدرآباد واپس جانے کے لیے آمادہ نہ ہوا تو انھوں نے ناراضگی کا اظہار نہ کیا بلکہ ازراہِ التفات امیّد دلائی کہ انجمن کو تصنیف و تالیف کے سلسلے میں ہمیشہ میرے تعاون کی ضرورت ہوگی۔

مولوی عبدالحق کا چڑیا گھر

مولوی عبدالحق کی شخصیت میں بڑا تنوع تھا۔ متاہلِ زندگی سے کنارہ کشی کے باوجود اُن میں زندگی اور جولانی بدرجۂ اتم موجود تھی۔ اچھے کھانوں کا شوق، مطالعے کا ذوق، حسِ مزاح، سیر و تفریح، جانوروں سے لگاؤ اور کئی ایسے دلچسپ مشغلے تھے جن میں مولوی صاحب اور میرے مزاج میں ہم آہنگی اور یکسانیت تھی۔ ایک مضمون "مولوی عبدالحق کا چڑیا گھر"

کئی سال پہلے میں نے رسالہ "اوراق" لاہور کے لیے لکھا تھا اُسے اس کتاب کا حصّہ اس لیے بنا رہا ہوں کہ مولوی صاحب کی شخصیت کے اس رُخ پر آج تک کسی نے کچھ نہیں لکھا۔

حیدرآباد دکن میں مولوی عبدالحق صبح سویرے بلاناغہ سیر کو نکلتے اور اپنے بندھے ہوئے راستے پر حسین ساگر کی طرف چل کھڑے ہوتے۔ لیکن مجھے یاد ہے کہ ایک بار انھوں نے باغِ عامہ کی طرف جانا شروع کر دیا۔ گو یہ جگہ اُن کی قیام گاہ سے زیادہ دور نہ تھی۔ باغِ عامہ میں داخل ہو کر وہ تیز تیز اس طرف پہنچے جہاں کچھ شیر کٹہروں میں بند تھے اور ان میں سے ایک کے سامنے کھڑے ہو جاتے۔ اس میں ایک شیرنی بند تھی جو آہنی تیلیوں کے پاس آکر مولوی صاحب کو غور سے دیکھتی اور غرّا کر کچھ پوچھتی۔ حال ہی میں اس نے دو بچّے دئے تھے اور رکھوالا انھیں جنگلے سے نکال کر ہمارے پاس چھوڑ دیتا۔ اب مولوی صاحب کی باچھیں کھل جاتیں اور وہ دیر تک ان سے کھیلتے رہتے۔ یہ ان کے مزاج کا ایک نیا رُخ تھا جس سے میں پہلے واقف نہ تھا۔ بہرحال میں زیادہ زور شور سے اس کھیل میں شریک ہو جاتا حتیٰ کہ ہم میں سے کسی کی ٹھوکر بچّہ کو لگتی اور وہ درد سے چیخ اٹھتا۔ شیرنی جو ہماری حرکتوں کو ناپسندیدگی سے دیکھتی ہوئی جنگلے میں جوش سے اُچھل رہی تھی، اب غصّے سے دہاڑ اٹھتی۔ رکھوالا ہنستا رہا اور بچّے کو گود میں اٹھا کر ماں کے پاس لے گیا۔ مولوی صاحب نے چھڑی سنبھالی اور کہا کہ چلو اب کل آئیں گے۔

میں نے نہ دیکھا نہ سنا تھا کہ انھیں جانوروں سے کسی قسم کی دلچسپی تھی لیکن مولوی صاحب کہنے لگے۔ یہ بات نہیں۔ مدّت ہوئی (یعنی اوّل جنگ عظیم سے پہلے) جب میں اورنگ آباد میں نگرانِ تعلیم تھا تو ایک اسیشن کتّا پال لیا تھا۔ اس سے مجھے از حد اُنس ہو گیا۔ تم نے مقبرے کا بنگلہ دیکھا

ہے کہ وہ آبادی سے کس قدر ہٹ کر ہے۔ اس زمانے میں وہاں مستقل قیام تھا۔ وہاں کی تنہائی میں وہ کتّا میرا تنہا رفیق تھا اور ہمیشہ سائے کی طرح میرے ساتھ ہوتا تھا۔ ایک بار کوئی شکاری جنگل سے ننھی سی شیرنی پکڑ لایا اور خواہ مخواہ میرے پاس چھوڑ گیا۔ اس کے لیے میں نے بہت بڑا پنجرا بنایا اور اس کی خدمت پر ایک آدمی تعینات کر دیا۔ دیکھتے دیکھتے شیرنی بڑی ہونے لگی اور مجھے اس سے بھی تھوڑا سا لگاؤ ہو گیا۔ مگر کتّا اُسے ایک آنکھ نہ بھاتا تھا اور نہ کتّے کو اس کی موجودگی گوارا تھی۔ یہ دن میں اس پر دس بار بھونک آتا اور شیرنی وقت بے وقت اسے ڈپٹ دیتی تھی۔ میں نے ان میں صلح و آشتی کے لاکھ جتن کیے لیکن سب بے سود۔ ابھی سوچ رہا تھا کہ اس قضیے کا فیصلہ کس طرح ہو کہ ایک روز موت کتّے کو جنگلے کے قریب لے گئی۔ اور شیرنی نے پنجے سے اس کی گردن کو پکڑ کر اس طرح مروڑا کہ وہ مر گیا۔ میں نے آ کر دیکھا کہ وہ خونم خون بے جان پڑا ہوا تھا۔ افسوس ہوا۔ پھر میں نے شیرنی کو باغِ عامہ بھیج دیا اور تہیّہ کیا کہ آئندہ کوئی جانور نہ پالوں گا۔

جب کبھی مولوی صاحب کو کوئی ایسا واقعہ یاد آتا تو ان کی آنکھوں کی سفیدی زیادہ پھیل جاتی اور وہ کچھ دیر کے لیے چُپ ہو جاتے تھے۔ چنانچہ واپسی کے وقت ان پر یہی کیفیت طاری تھی۔ یک بیک مجھے ان کی تنہائی کا شدید احساس ہوا اور میں نے دل ہی دل میں فیصلہ کیا کہ ان کے لیے کہیں سے کوئی اچھّی نسل کا کتّا لاؤں گا۔

اتنے میں مولوی صاحب نے کہا "کیا عجب کہ یہ وہی شیرنی ہو" میں نے جواب دیا۔ "بھلا یہ کیسے ممکن ہے۔ شیر کی عمر پندرہ بیس سال سے زیادہ نہیں ہوتی"۔

"اگر وہ نہیں تو اس کی بیٹی ہو گی۔ شکل اُس سے ملتی ہے"۔

مولوی صاحب کبھی کبھی ایسی بھولی بھالی باتیں کہہ جاتے تھے کیونکہ ان کی پیرانہ سالی میں طفلانہ معصومیت کا پرتو باقی تھا۔

ان کے مکان کے آگے پیچھے بہت بڑا احاطہ تھا اور سامنے پیپل کے دو اونچے اونچے پیڑ پہرا دے رہے تھے۔ ان کے تنوں کے ارد گرد میں نے لوہے کی جالی بچھا دی اور یہاں وہاں سے رنگ برنگے پرندے منگوا کر چھوڑ دیے۔ مولوی صاحب اس انتظام سے خوش ہوئے اور

روز گھڑی دو گھڑی اس کا تماشہ کرنے لگے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کہتے جاتے تھے کہ پرندوں کو بند نہیں کرنا چاہیئے۔ اس مضمون پر اقبال کی وہ نظم "پرندے کی فریاد" خوب ہے۔ اردو شاعروں میں وہ سب سے زیادہ حالی اور اقبال کے قائل تھے۔

اتنے میں خبر ملی کہ قاضی عبدالغفار کی کُتیا نے بچّے دئے ہیں۔ اس زمانے میں قاضی صاحب حیدرآباد سے روزنامہ "پیام" نکالتے تھے۔ گو انھوں نے کُتیا کا نام موتی رکھا تھا، مگر تھی وہ ولایتی، اسپیشل نسل کی اور سج دھج میں کسی انگریز میم سے کم نہ تھی۔ قاضی صاحب بذات خود اس کی خدمت اور بناؤ سنگار میں مصروف رہتے تھے۔ اس کا ایک بچّہ مجھے پسند آیا اور جب وہ کچھ بڑا ہوا تو میں اسے مانگ لایا۔ اس کے نرم نرم سفید اور کالے گھنگھریالے بال اور مہر و وفا میں تیرتی ہوئی آنکھیں مجھے اب تک یاد ہیں۔

مولوی صاحب اسے دیکھتے ہی خوشی سے اُچھل پڑے۔ نہایت احتیاط سے انھوں نے اسے چھوا اور کہنے لگے "بے شک اچھّی ذات کا ہے۔ اس کا نام اچھّا سا ہونا چاہیئے"۔

میں نے کئی نام تجویز کیے لیکن انھیں کوئی نہ بھایا اور اپنی طرف سے اسے نازی کا لقب دے دیا۔ میں نے لاکھ بحث کی کہ صاحب نازی تو نہایت ظالم اور جفا پرور ہیں، اس غریب کو ان سے کیا نسبت۔ لیکن مولوی صاحب کو یہی نام پسند آیا۔ اور ہم سب اسے نازی کہہ کر پکارنے لگے۔

جب نازی کی ٹانگوں میں سکت آئی تو اس نے چل کر اندرون خانہ کا جائزہ شروع کیا۔ دیکھتا کیا ہے کہ ایک کمرے میں مولوی احتشام الدین، شان الحق حقی کے والد مرحوم، اردو لُغت کی تدوین میں ہمہ تن مصروف ہیں۔ جب نازی نے انھیں مخاطب کرنے کی کوشش کی تو انھوں نے ایسی جریب تانی کہ وہ دُم دبا کر دُہائی دیتا ہوا بھاگا۔ دوسرے کمرے میں جھانکا تو کیا دیکھتا ہے کہ ڈاکٹر عابد حسین انگریزی اردو ڈکشنری کی ترتیب میں مشغول ہیں۔ انھوں نے ہکلائی ہوئی آواز میں نازی کو اس زور سے ڈانٹا کہ وہ دم بخود رہ گیا۔ اب اُسے پتا چلا کہ اس جگہ اس کے سرپرست دو ہیں۔ ایک مولوی عبدالحق اور ایک میں۔ یوں اپنی طرف سے میں نے اسے باور کرا دیا تھا کہ اس کے اصل مالک مولوی عبدالحق ہی ہیں اور باقی وقت اسے انھیں کی

خدمت میں گزارنا ہے۔

صبح کے ناشتے کے بعد جب مولوی صاحب اپنے کتب خانے میں داخل ہوتے تو نازی بھی ان کے پیچھے لگ لیتا اور چُپ چاپ ان کی کرسی کے پیچھے بیٹھ جاتا۔ مولوی صاحب کام میں مصروف ہو جاتے اور یہ آنکھیں بند کر کے کسی نامعلوم فکر میں محو ہو جاتا۔ اتنے میں ملازم غنّے کر آتا اور مولوی صاحب کش پر کش اڑانے لگتے تھے۔ نازی کو یہ حرکت سخت ناگوار تھی۔ حقّے کے بول پر پہلے وہ بہت چونکا کہ شاید یہ کسی جانور کی آواز ہے۔ دھواں الگ اسے پریشان کرنے لگا اور اس نے اتنا واویلا مچایا کہ مولوی صاحب نے دِق آ کر اسے کمرے سے نکال دیا۔ اس کے بعد نازی زیادہ چوکس ہو گیا۔ اب وہ مولوی صاحب کے پلنگ کے نیچے اس وقت لیٹتا جب وہ خود آرام کرنے لگتے تھے۔ آہستہ آہستہ وہ اس سے کچھ کہتے اور نازی کے کان فرطِ مسرّت سے کھڑے ہو جاتے تھے۔

دور سے دیکھو تو نازی پر بھیڑ کے بچّے کا گمان ہوتا تھا۔ مولوی صاحب اس کی طرف گیند اچھالتے تو وہ پوستین کے بار کے باوجود بجلی کی طرح اس پر لپکتا اور پھرتی سے اسے پنجوں میں دبوچ لیتا۔ کبھی اسے شبہ ہوتا کہ اس کی دُم جسم سے الگ کوئی چیز ہے اور وہ بار بار چکّر کاٹ کر اسے پکڑنے کی ناکام کوشش کرتا۔ پھر وہ باغ کے کسی کونے کا رُخ کرتا جہاں اس نے ہڈیوں کا دفینہ دبا رکھا تھا اور دیر تک ان پر دانت تیز کرتا رہتا۔ غرض کہ نازی کی شرارتوں میں دلچسپی کے کئی پہلو تھے۔

انھیں دنوں مجھ سے ایک غلطی سرزد ہوئی۔ شام کو میں اکثر مسز سروجنی نائیڈو کے دولت کدے کی طرف جا نکلتا تھا۔ انھوں نے ایک حسین و جمیل سیامی بلّی پال رکھی تھی اور حال ہی میں بلّی کے یہاں خوشی ہوئی تھی۔ مسز نائیڈو نے کہا کہ ان میں سے ایک بچّہ لے جاؤ۔ دیکھتا کیا ہوں کہ ماں سے اس کی شکل بالکل نہیں ملتی۔ نرا سیاہ فام کالے دیو کی اولاد۔ لیکن مسز نائیڈو نے یقین دلایا کہ ہر بچّہ شروع میں بدصورت لگتا ہے، بڑا ہو کر صورت شکل نکالتا ہے، غرض کہ شرما حضوری میں اس کالے کلوٹے کو بغل میں داب کر لے آیا۔

اسے دیکھتے ہی نازی نے نعرۂ احتجاج بلند کیا اور مولوی صاحب نے بھی ناخوشی کا اظہار

کیا۔" لاحول ولاقوۃ"۔ بلّی بھی کوئی پالنے کی چیز ہے اور بھلا کتّے بلّی کا نباہ ایک گھر میں کیسے ہو سکتا ہے۔ اسے فوراً واپس کر دینا چاہیئے۔

بلّی کا بچّہ مسکین صورت بنائے ٹوکری میں بیٹھا خوف وہراس کے عالم میں ہماری باتیں سُن رہا تھا۔ اس کی طرف داری میں مَیں نے کئی خیال تراشے۔ سیامی بلّی کی زیبائی کی ثنا خوانی کی اور گربہ پروری کے ثواب گنائے۔ عبید زاکانی کی نظم "گربہ و موش" اس وقت تک نظر سے نہ گزری تھی لیکن کیتھرین مینسفیلڈ (KATHERINE MANSFIELD) کا مضمون بلّی کی تعریف میں یاد دلایا جسے مولوی صاحب بھی ملاحظہ فرما چکے تھے۔ جب مولوی صاحب کسی طرح قائل نہ ہوئے تو میں نے نوکروں کی شہادت پیش کی جس کے مطابق کتب خانے میں چوہوں کی موجودگی کے آثار پائے جاتے تھے۔ یہ سنتے ہی مولوی صاحب نے اپنے اعتراض واپس لے لیے اور اس طرح وہ بلّا ان کے خانوادے میں شامل ہو گیا۔

مولوی صاحب کے مشورے کے بغیر میں نے اس کا نام "لاما" رکھ دیا۔ مجھے یقین تھا کہ بڑا ہو کر وہ بھی تبتی لاماؤں کی طرح گول مٹول موٹا تازہ ہو گا۔ ابھی تو وہ لاغر و نحیف تھا اور اس کی شکل پر عبرت و حسرت کے ایسے آثار تھے کہ اگر کوئی ۱۹۴۷ء میں دیکھتا تو اسے مہاجرین کے قافلے کا حواری سمجھتا۔

ہم نے لاما کی پرورش میں کوئی کوتاہی نہ کی۔ نازی کی دست درازی سے اسے ہمیشہ محفوظ رکھا اور بے صبری سے اس دن کا انتظار کیا جب وہ بڑا ہو کر سیامی رنگ روپ کا جلوہ دکھلائے گا مگر افسوس کہ عمر کے ساتھ اس کی بدصورتی میں اضافہ ہوتا گیا۔ نہ اس کا قد بڑھا نہ بال، ایک رنگ کا کالا پن تھا جو روز بروز گہرا ہوتا چلا گیا۔ اس کا باپ ضرور کوئی حبشی بلّا تھا اور یہ ہو بہو اسی پر ہوا تھا۔ اس کی سراسیمگی کی اصل وجہ یہی تھی کہ وہ اس راز کو زیادہ دیر چھپا نہ سکتا تھا۔

اب گھر میں "لاما" کی کوئی ساکھ نہ رہی۔ ہر کوئی اسے دُھتکارتا اور نازی بے روک ٹوک اسے کھدیڑتا تھا۔ پناہ یا تو اسے مولوی احتشام الدین کے کمرے میں ملتی تھی جہاں وہ کسی موٹی سی لغت کے پیچھے چُپ چاپ چھپ کر بیٹھ جاتا تھا اور یا وہ کبھی میری میز پر اچک کر بیٹھ جاتا اور

آنکھیں بند کر کے دل ہی دل میں اپنے خدا کو یاد کرنے لگتا۔

لاما کو ہمیشہ یہ تمنا رہی کہ مولوی صاحب کبھی اس کی طرف التفات کریں۔ آخر یہ اسی کے دم قدم کی برکت تھی کہ کتب خانے سے چوہے یکسر غائب ہو گئے۔ اس خدمت سے مولوی صاحب یقیناً خوش ہوئے، بلکہ ایک بار جب لاما کی دیکھا دیکھی نازی نے کتابوں کی الماری میں گھسنے کی کوشش کی تو مولوی صاحب نے ایک بید رسید کیا۔ یہ نظارہ قابلِ دید تھا۔ مولوی صاحب کے ہاتھوں نازی کبھی نہ پٹا تھا۔ اس لیے اس کی آنکھوں میں شکایت کے آنسو امڈ آئے اور لاما کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں۔

اس مستعدی کا صلہ لاما کو یہ ملا کہ اب وہ بھی نازی کے ساتھ مولوی صاحب کے دسترخوان کا خوشہ چین ہو گیا۔ ان کی کرسی کے ایک طرف نازی اور دوسری طرف لاما آسن جماتا اور مولوی صاحب روٹی کا ایک ٹکڑا کبھی اِدھر کبھی اُدھر ڈالتے جاتے۔ زیادہ توجہ نازی کی جانب ہوتی اور تر نوالہ اسے ہی ملتا تھا لیکن لاما پنجے سے مولوی صاحب کی ٹانگ کو ٹھوکے دے کر اپنی موجودگی سے آگاہ کرتا رہتا اور اس طرح اپنا حصّہ وصول کر لیتا تھا۔

نازی نے جیسے ہی محسوس کیا کہ مولوی صاحب لاما سے شفقت نہیں بلکہ رواداری کا تعلق قایم کر رہے ہیں تو اس کا جذبۂ انتقام جاگ اٹھا اور وہ اس کی جان کا لاگو ہو گیا۔ اس طرح رگیدا کہ گھر میں داخلہ مشکل کر دیا۔ مجبور ہو کر لاما نے باغ میں سکونت اختیار کر لی۔ گھاس پر لیٹے لیٹے وہ گھنٹوں پرندوں اور تتلیوں کو دیکھا کرتا۔ یا تو وہ کھانے کی آہٹ سن کر اندر آتا اور یا رات کے وقت جب اس کی رنگت شب کی سیاہی میں اس طرح گھل مل جاتی تھی کہ تلاش کے باوجود اس کا پتا نہ چل سکتا تھا۔

رفتہ رفتہ لاما بہت چالاک ہو گیا اور اسے اندازہ ہوا کہ نازی کی وجہ سے اس کی حق تلفی ہو رہی ہے۔ اب اس نے بقا کے لیے جد و جہد کا فیصلہ کر لیا۔ اور وہ داؤں گھات استعمال کیے جو اسے حبشی باپ سے ورثے میں ملے تھے۔ کبھی تو وہ صوفے کے نیچے چھپ جاتا جہاں نازی کی رسائی نہ ہو سکتی تھی۔ یہ اگر اپنا منہ اندر کرتا تو اس کی ناک نوچ لیتا اور جب تک یہ اپنی ناک سہلائے یک بیک باہر نکل، اس کی ٹانگ پر پنجہ مار یہ جا وہ جا باہر نکل بھاگتا تھا۔ جب

نازی باغ میں اس کا پیچھا کرتا تو وہ دیر تک اسے چکمہ دے کر ایک طمانچہ رسید کر ایک جست میں کسی درخت پر چڑھ جاتا تھا۔ اب تو نازی کے غصّے کی حد نہ رہتی اور وہ اس زور سے بھونکتا کہ سب چونک جاتے۔ مولوی صاحب بگڑ کر کہتے کہ ساری شرارت اس لاما کی ہے۔ وہ پیار سے نازی کو تھپک کر لاما کو گھونسہ دکھاتے جو پیڑ پر بیٹھا انھیں منہ چڑھا رہا تھا۔

اس سینہ زوری کا الٹا اثر ہوا اور لاما سمجھ گیا کہ اس گھر میں اس کا کوئی ہمدرد و خیر خواہ نہیں۔ جب چھوٹا تھا تو صبح و شام اسے دودھ ملائی ملا کرتی تھی اور نازی کے ظلم و ستم سے سب اس کی حفاظت کرتے تھے، مگر جب بڑا ہوا تو سب نے منہ موڑ لیا۔ لہٰذا لاما نے بچاؤ کی ایک نئی ترکیب سوچی۔

آس پاس کی کوٹھیوں میں کئی آوارہ بلّے رہتے تھے۔ دن بھر وہ تلاشِ معاش میں سرگرداں رہتے لیکن رات کو کسی کھلی جگہ مل بیٹھتے اور دنیا والوں کی سفّاک اور بے رحمی پر ببانگِ دہل تبصرہ کرتے۔ معلوم نہیں کب لاما اس غول میں شامل ہو گیا۔ ہمیں تو پتا اس رات کو چلا جب باغ کے درختوں سے یک بیک بلّوں کا دل خراش کورس سنائی دیا۔ یہ گویا ایک جنگی ترانہ تھا جو تیز سے تیز تر ہوتا گیا۔ پہلے ایک للکار پھر متواتر چیخ۔ دم بھر میں در و بام اس گھن گرج سے گونج اٹھے۔ ہم حیران ہو کر درختوں کو تاکنے لگے کہ ماجرا کیا ہے؟ اتنے میں بجلی کی ایک ہلکی سی روشنی میں لاما کی چھب نظر آئی کہ جوش و خروش سے الاپ میں مصروف تھا۔ اس میں شک نہیں کہ وہ اس کورس کا مکھیا تھا کیونکہ اس کے اشاروں پر کورس کے سُر کبھی نیچے اور کبھی اونچے ہو جاتے تھے۔

اس تماشے پر مولوی صاحب بے اختیار ہنس پڑے۔ بلّوں کو بھگانے کے لئے وہ ہُو حق کرنے لگے اور ہم نے سنگ باری کی۔ دوسرے دن صبح جب لاما ناشتے کی میز پر حاضر ہوا تو نہ اس نے ندامت کا اظہار کیا اور نہ مولوی صاحب نے خفگی ظاہر کی بلکہ اس پر خاص عنایت کی۔ کہنے لگے کہ یہ بڑا بدذات ہے۔ اگر اس کا دوزخ نہ بھرا تو زیادہ تنگ کرے گا۔

جب یہ خبر مشتہر ہوئی کہ مولوی صاحب کو جانور پالنے کا شوق ہے تو کوئی شناسا ان کے لیے ہرن کا جوڑا لے آیا۔ یہ دونوں ابھی کم عمر تھے۔ انھیں کوٹھی کے پچھواڑے چھوڑ دیا گیا۔

یہاں وہ بے خطر چرتے چگتے کلیلیں کرتے پھرتے تھے۔ لیکن جیسے ہی کسی نے ان کی طرف دیکھا۔ وہ چوکنّا ہوئے اور دوسری طرف بھاگ نکلے۔

چند روز تو مولوی صاحب ان کی خبر گیری کرتے رہے۔ لیکن پھر بیزار ہو کر کہنے لگے، بھئی ہرن کی فطرت میں بڑی وحشت ہوتی ہے۔ یہ کسی کا دوست نہیں۔ اسے جنگل کی آب و ہوا راس آتی ہے اور بس اسے پالنا لاحاصل ہے، تاہم جب وہ کام کرتے کرتے تھک جاتے تو کتاب خانے کے برآمدے سے کھڑے کھڑے ان وحشیوں کو دیر تک دیکھتے رہتے اور میر کا یہ شعر گنگنانے لگتے ؎

دور بہت بھاگو ہو ہم سے سیکھ طریق غزالوں کا
وحشت کرنا شیوہ ہے ان اچھّی آنکھوں والوں کا

غزل کی شاعری مولوی عبدالحق کو پسند نہ تھی۔ البتہ انھیں میر سے عقیدت تھی اور بے خیالی میں ان کا کوئی شعر زبان پر آجاتا تھا۔ یوں تقریر یا تحریر میں وہ شعر کو داخل نہ ہونے دیتے تھے۔

شام کو مولوی صاحب عموماً گھر پر ہوتے تھے اور یہی وقت تھا کہ لوگ ان سے ملنے آتے تھے۔ ان کے آنے سے پہلے اور جانے کے بعد وہ باغ میں چہل قدمی کرتے تھے۔ کبھی وہ پرندوں کے پنجرے کے پاس جاتے اور پل بھر ان کا زمزمہ سنتے۔ پھر پیچھے کے میدان میں ہرنوں کی ٹوہ لیتے جو کان جوڑے جگالی کر رہے تھے۔ بعد میں وہ آرام کرسی پر بیٹھ کر حقّہ پیتے ہوئے کسی کتاب کے مطالعے میں مشغول ہو جاتے تھے۔ اب انھیں اکیلے پن کا احساس نہ تھا کیونکہ نازی قدموں پر سر جھکائے بیٹھا تھا اور نزدیک کہیں لاما چل پھر رہا تھا۔ یہ محفل جلد درہم برہم ہو گئی جب میں کچھ عرصے بعد حیدر آباد سے یورپ چلا گیا اور مولوی صاحب انجمن ترقّیٔ اردو کے دفتر کے ساتھ دہلی آگئے۔

مدّتوں بعد ایک بار جب اس زمانے کا ذکر آیا تو ان کی آنکھوں کی سفیدی پھیل گئی۔ انھوں نے حقّے کا کش زور سے کھینچا اور دیر کے لیے خاموش ہو گئے۔

میرے دوسرے محسن بابو مول چند اگروال کو ہندی سے میری دوری پسند نہ آئی تھی۔ جب

انھیں خبر ہوئی کہ میں دہلی میں کس طرح زچ ہو گیا ہوں۔ تو لکھا کہ کلکتہ آجاؤ اور جی چاہے تو ہندی ماہنامہ "وشوامتر" کی ادارت سنبھالو یا انگریزی روزنامہ "ایڈوانس" میں کام کرو۔

کچھ وقت اسی حیص بیص میں گذر گیا کہ ایک دن اچانک حمیدہ نے کہا۔ تم کیوں پریشان ہوتے ہو۔ چلو یورپ چلے چلیں۔ وہاں سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری لے آؤ گے تو کام کی کمی نہیں رہے گی۔ میں ان کی شکل دیکھتا رہ گیا۔ کیونکہ یہ خیال کبھی میرے دماغ میں نہ آیا تھا۔ ہماری شادی کو سال بھر ہوا تھا اور وہ دنیا داری سے میری طرح بے خبر اور حوصلہ مندی میں میری ہم سر تھیں۔

انگلستان کی طرف دل یوں مائل نہ ہوا کہ جہاں رنگ و نسل کا تعصّب ہو وہاں رہنا میری غیرت قبول نہیں کرتی اور پھر برطانوی سامراج کی چیرہ دستی سے بھی ایسی شدید نفرت تھی کہ اُس کے گڑھ میں زیادہ وقت گزارنا بھی پسند نہ تھا۔ بنا بریں، میں نے فرانس جانے کا تہیّہ کیا جو صدیوں سے ادب و فن کا گہوارہ تھا، اور اب متحدہ محاذ کی حکومت کے دور میں فاشسٹ دشمن اور ترقی پسند تحریک کا مرکز تھا۔ پیرس یونیورسٹی کا وقار دنیا کی قدیم ترین دانش گاہوں میں مُسلّم تھا۔ فرانسیسی زبان کی لاعلمی مانع راہ نہ تھی کیونکہ مجھ میں زبان سیکھنے کی فطری صلاحیت تھی۔

یہ وہ زمانہ تھا جب بہت کم ہندوستانی مغرب کا سفر کرتے تھے اور اعلیٰ تعلیم کے لیے یورپ جانے والوں کی تعداد اور بھی کم تھی۔ اگر یونیورسٹی کی مناسب سند ہو تو داخلہ بلا دقّت مل جاتا تھا۔ فارن ایکس چینج کی کوئی پابندی نہ تھی، جتنے روپے چاہیں منی آرڈر سے دنیا کے کسی گوشے میں بھیج دیں یا بنک کے ذریعہ بلا تردّد روانہ کر دیں۔ صحت کے سرٹیفکٹ کا نام بھی نہ سُنا تھا، ہر مسافر صحت مند سمجھا جاتا تھا۔ جس پاس پورٹ پر حکومت برطانیہ کی مہر لگی ہو اُس پر بلا توقّف سرحد پر ویزا مل جاتا تھا۔ ارزانی ایسی تھی کہ بیس پونڈ یعنی تین سو روپے میں مہینہ آرام سے کٹ جاتا تھا اور فرانس میں تو ہر قسم کی تعلیم مفت تھی۔ البتہ روپیہ آج سے کم از کم دس گنا مہنگا تھا۔ بیرونی تعلیم کے لیے اسکالرشپ کوئی نہ دیتا تھا۔ خاص کوشش سے راجہ رئیس کسی کو نواز دیں تو اور بات ہے۔ مسز سروجنی نائیڈو کے اصرار پر ٹرا ونکور ریاست کے دیوان سر رام سوامی ایئر نے وظیفہ دینے کا حتمی وعدہ بھی کیا۔ لیکن عین موقع پر کمند ٹوٹ گئی اور میں دیوار سے گرتے گرتے بچا۔ علاّمہ اقبال کی سفارش اور نجیب اشرف ندوی کے کوشش کے باوجود بمبئی کے

فضل بھائی تعلیمی ٹرسٹ نے بات اَن سنی کر دی۔ گرہ میں چند ہزار روپے تھے، جو مشکل سے سال بھر کی کفالت کرتے۔ بس قلم پر بھروسہ تھا۔

سب سے مشکل پاسپورٹ کا مسئلہ تھا۔ حکومت کی نظر میں کچھ ایسا ہی معتوب تھا کہ ظفر عمر صاحب بھی بے بس ہو گئے۔ میں مایوس ہو گیا تھا کہ وسط ۱۹۳۷ء میں یو۔ پی میں کانگریس کی وزارت نے قلمدان سنبھالا اور پنڈت پنت وزیرِ اعلیٰ مقرر ہوئے۔ مسز نائیڈو اور ڈاکٹر راجندر پرشاد نے جب انھیں متواتر تار بھیجے تو پنڈت پنت کی مداخلت کے بعد روانگی سے چند روز قبل ہمیں پاسپورٹ وصول ہوئے۔

اگست کے آخر میں بمبئی سے ہمارا جہاز روانہ ہونا تھا۔ مسز نائیڈو نے ہدایت کی کہ سہر راہ وردھا میں گاندھی جی کے درشن کر لو، کیونکہ ساہتیہ پرشد کے جلسے کے بعد وہ تم سے ملنے کے خواہاں ہیں۔ ان کے ارشاد کی تعمیل ضروری تھی۔

گاندھی جی کے درشن

وردھا شہر کے پاس سیوا گرام میں گاندھی جی کا آشرم تھا۔ وہاں پہنچنے کے لیے یا تو بیل گاڑی سے سفر کرنا ہوتا تھا یا پیادہ۔ ہم جیسے شہری مہمانوں کو ایک صاف و سادہ مکان میں ٹھیرایا جاتا تھا، ورنہ دیش بھگت قسم کے لوگ آشرم کی ایک جھونپڑی میں چٹائی پر سوتے اور کیلے کے پتّل پر کھاتے تھے۔ صرف مسز نائیڈو اور مولانا آزاد کو چارپائی میسّر آتی تھی۔ آشرم میں مقیم گاندھی جی کے چیلے کھیتی باڑی اور پارچہ بافی میں وقت گزارتے تھے، چنانچہ میں نے خان عبدالغفار کو ایک کیاری کی گھاس کاٹتے دیکھا۔

دوسرے دن گاندھی جی کی خدمت میں حاضر ہوا۔ وہ ایک چھوٹی سی کوٹھری میں آلتی پالتی باندھے چٹائی پر بیٹھے کچھ لکھ رہے تھے۔ انھوں نے خندہ پیشانی سے میرے سلام کا جواب دیا اور عینک اتار کر غور سے دیکھا۔ اُن کی شخصیت میں سب سے پُرکشش آنکھیں تھیں، اس لحاظ سے کہ اُن میں اپنے مافیہ کو سربستہ رکھنے اور مخاطب کے باطن تک دیکھنے کی طاقت تھی۔ گاندھی جی نے کہا "مجھے یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ آپ اردو اور ہندی، دونوں زبانوں کے ادیب ہیں

اور سنسکرت سے بھی واقف ہیں۔ یورپ سے لوٹ کر آپ کیا کیجیے گا؟"

جواب میں میں نے کہا۔

"اگر موقع ملا تو میں ہندو مسلمانوں کی باہمی بدگمانیوں کو دور کرنے کے لیے اپنی صلاحیت کو بروئے کار لاؤں گا۔"

گاندھی جی اس جواب سے خوش ہوئے اور کہا۔

"یہ خیال بہت اچھا ہے۔ قومی اتحاد کا مسئلہ بہت اہم ہے اور یہ صرف سیاست کا میدان نہیں، بلکہ علم و ادب کی توجہ کا مستحق ہے۔"

اس ملاقات کو گاندھی جی نے اس طرح یاد رکھا کہ ۱۹۴۵ء میں ہندوستانی، لٹریچر بورڈ کا سیکرٹری مجھے نامزد کیا۔ لیکن میں نے اس پیش کش کو قبول نہ کیا کیونکہ پانی سر سے گزر چکا تھا۔

یورپ کا پہلا سفر

۵

سفر پیرس

سمندر نے مجھ پر ایسا جادو کیا کہ زیادہ وقت ڈیک پر بیٹھا نیلے آسمان اور نیلگوں ردائے آب کو دیکھتا رہتا تھا۔ بیچ سمندر میں سورج کا طلوع و غروب، افق تا افق شفق کی لالہ فامی، لہروں پر چاندنی کے بکھرنے سے دھوپ چھاؤں کی کیفیت۔ یہ ایسے نظارے ہیں کہ زبان سے بیان نہیں ہو سکتے۔

ایک دن میں فرانسیسی کی ابتدائی کتاب اور پیرس کا نقشہ پھیلائے بیٹھا تھا کہ ایک معمّر ہم سفر نے تعارف کا ہاتھ بڑھایا اور انگریزی میں کہا۔ میرا نام ڈاکٹر لیکلر (LECLAR) ہے اور یہ میری اہلیہ ہیں۔ ہم دونوں پیرس کے رہنے والے طبیب ہیں۔ میں نے حمیدہ کو ان سے ملایا اور بتلایا کہ ہم حصولِ تعلیم کے لیے پیرس جا رہے ہیں۔

ڈاکٹر لیکلر نے پوچھا "کیا تم فرانسیسی جانتے ہو اور پیرس میں کسی سے شناسا ہو؟" جب میں نے جواب نفی میں دیا تو انھوں نے تعجب سے کہا "انگلستان کیوں نہیں جاتے، وہاں تمھیں

آسانی ہوگی"۔ میں نے کہا "انگریز کی محکومی کا اتنا شدید احساس ہے کہ اس کی سرزمین میں رہنے کو جی نہیں چاہتا۔ فرانس کی آزاد فضا مجھے زیادہ راس آئے گی اور زبان کا کیا ذرا سی محنت سے سیکھ جاؤں گا"۔

یہ بات انھیں ایسی بھائی کہ جہاز پر ہی انھوں نے ہماری سرپرستی اختیار کرلی اور پیرس میں ہمیشہ ہمارے مہربان رہے۔ ان کے چچا زاد بھائی وہی جنرل لیکلرک تھے جنھوں نے ۱۹۴۴ء میں پیرس کو جرمن تسلّط سے آزاد کیا تھا اور ان کے نام سے وہاں کی ایک شاہراہ موسوم ہے۔ ڈاکٹر اور مادام لیکلرک اشتراکیت کے ہمدرد تھے اور اس کی کارکردگی کا جائزہ لینے کے لیے ریل پر سوویٹ روس کو ایک سرے سے دوسرے سرے تک دیکھ کر جہاز بدلتے ہوئے مہینوں کے بعد یہاں تک پہنچے تھے۔ روسی عوام کی خستہ حالی اور ستم زدگی کا حال سناتے ہوئے انھوں نے کہا "یہ نہ بھولو کہ یہ تاریخِ انسانی کا سب سے بڑا سماجی تجربہ ہے اور اس کا نتیجہ دیر میں برآمد ہوگا کیونکہ فرانس یا جرمنی جیسے صنعتی ملکوں کی بجائے یہ ایک پس ماندہ زراعت پیشہ ملک میں عمل پیرا ہے۔ اشتراکیت کا مقصد دولت کی تقسیم ہے۔ لیکن روس جیسے مفلس ملک میں فی الحال دولت کہاں سے آتی؟ علاوہ بریں وہاں جمہوری آزادی پہلے بھی نہ تھی کہ اس کی قدر ہوتی۔ صنعتی ترقی کے ساتھ آسودگی اور جمہوری آزادی کا دور آئے گا"۔

یہ سچ ہے کہ ہر ترقی پرور انقلاب کا ردِّ عمل اس طرح ہوتا ہے کہ خلافت راشدہ کی جانشینی معاویہ کو، انقلابِ فرانس کی نپولین کو، اور انقلابِ روس کی اسٹالن کو میسّر آتی ہے۔ وہ اپنی قوموں کی بہبود و برتری میں ایسے کوشاں ہوتے ہیں کہ اصل نظریہ نظامِ حکومت کا آلۂ کار بن جاتا ہے۔ بہ ایں ہمہ، امام، کلیسا اور پارٹی۔ اپنے عمل و کردار کا جواز نظریے سے ہی پیش کرتے ہیں۔ یہی ایک امر امید افزا ہے کہ کوئی جابر یہ کہنے کی جرأت نہیں کرتا کہ مساوات اور آزادی کی طلب بے معنی ہے اور جو یہ کہتا ہے وہ خود ہٹلر کی طرح اپنی انا میں جل مرتا ہے۔

اس زمانے میں مغرب کا رُخ کرنے والے ہندوستانیوں کی تعداد بہت کم تھی۔ چند ہزار

کسان، مزدور اور لشکری کینیڈا، امریکہ اور انگلستان میں رہ پڑتے تھے۔ یورپ میں ہماری تعداد مشکل سے چند سو ہوگی۔ فرانس میں سوڈیڑھ سو سے زیادہ نہ تھے جن میں زیادہ تر گجراتی تاجر اور بیس تیس طالب علم ہوں گے۔ اس وقت نہ ہوائی سفر تھا، نہ سیاحت و تجارت کا سودا، نہ کسی کے پاس فاضل پیسہ۔ اہل یورپ کا عام خیال تھا کہ ہندوستان میں یا تو جوگی اور جادوگر رہتے ہیں اور یا راجہ رئیس۔ یہاں کا بھرم تو جنگ کے بعد کھلا، ورنہ پچھلے زمانے میں ہم بڑے آبرومند تھے۔ پچھلا زمانہ میں نے یوں کہا کہ گزشتہ جنگِ عظیم سے پہلے کے دور کو عرفِ عام میں یہی کہتے ہیں۔ اس واقعے نے ان کی یادداشت پر ویسی ہی اِمٹ لکیر کھینچ دی ہے جیسی یہاں ۱۹۴۷ء نے۔ تاریخ کے ادوار اسی طرح مقرر ہوتے ہیں۔

مولوی عبدالحق نے ہماری آمد کی اطلاع عبداللہ چغتائی کو دے دی تھی جو پیرس میں تاج محل پر تحقیق کر رہے تھے۔ اسٹیشن سے لے جا کر انھوں نے ہمیں لیٹن کوارٹر کے ایک ہوٹل میں ٹھیرا دیا۔ یہ قدیم محلہ یونیورسٹی کے اردگرد دریائے سین کے بائیں کنارے پر پھیلا ہوا ہے۔ اور طلبہ اور سیلانیوں کی آماجگاہ ہے۔ اس زمانے میں پیرس کی آبادی اب سے آدھی یعنی چالیس لاکھ کے لگ بھگ تھی۔ اس میں کم از کم ایک چوتھائی غیر ملکی تھے، بیشتر مشرق اور وسطی یورپ کے مہاجر۔ ان میں ہر مزاج، قماش اور مذہب کا آدمی نظر آتا تھا۔ خانہ بدوش روسی، بلقان کے دانشور، جرمن یہودی، ہنگری کے چینی، اطالوی فاشسٹ دشمن، عرب مزدور، پیشہ ور انسان نواز اور غریب پرور۔ شہر میں سب کے لیے جگہ تھی اور رواداری کا یہ حال تھا کہ نسل، رنگ یا زبان کے تعصب کا ذکر بھی نہ آتا تھا۔ البتہ انگریز سیاح مزاج کے ویسے ہی تختۂ مشق تھے، جیسے ہمارے یہاں سکھ۔ جب کسی سے بدتمیزی سرزد ہوتی تو کہا جاتا تھا کہ یہ انگریز معلوم ہوتا ہے! اور امریکن کا وہی درجہ تھا جو ہماری کم عمری میں شریفوں کی محفل میں بنیے بقال کا۔

ہمارے ہوٹل کے پڑوس میں امتیاز علی خاں اور برجیش سنگھ رہتے تھے۔ امتیاز نواب کرنال کے بھتیجے اور نواب زادہ لیاقت علی خاں کے چچازاد بھائی تھے۔ برجیش راجہ کالاکانکر کے صاحب زادے تھے۔ ان سے پہلے ہی دن ایسی دوستی ہوئی کہ پیرس کے دوران قیام تک باقی

رہی، بلکہ امتیاز سے تعلقِ خاطر میں ان کے حسنِ حیات کمی نہیں ہوئی۔ یہ دونوں حصولِ علم کے بہانے سالہا سال سے پیرس میں مقیم تھے۔ رند مشربی اور شب باشی کے باوجود اشتراکیت میں ان کا ایمان راسخ تھا۔ یہ برجیش سنگھ وہی تھے، جن سے آگے چل کر اسٹالن کی لڑکی سوتیلانہ نے بیاہ رچایا اور جب ماسکو میں وہ چل بسے تو ان کی لاش کو جلا کر راکھ لیے ہندوستان آئی اور امریکہ فرار ہو گئی۔

امتیاز نے "ودیان" نامی فرانسیسی خاتون سے شادی کی جو لیٹن کوارٹر کے ایک عجیب و غریب زمین دوز کیبرے (خرابات) کی مالکہ تھی۔ جب اس نے امتیاز کی خاطر پہلے شوہر سے طلاق کا فیصلہ کیا تو خاصا ہنگامہ ہوا اور دوستی کا حق ادا کرنے کے لیے میں اس جگہ کو رونق بخشنے لگا۔ یہ خرابات دریا کے پاس انقلابِ فرانس سے پہلے ایک تہ خانے میں موجود تھا اور اس کی فضا میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ مدّتوں سے جو مشاہیر یہاں آتے رہے، ان کے نام سنگِ مرمر کے ایک کتبے پر کندہ تھے۔ ان میں بودلیر، آسکر وائلڈ، برنارڈ شا وغیرہ نمایاں تھے۔ یہاں کی خصوصیت یہی تھی کہ کسی چیز سے نیا پن ظاہر نہیں ہوتا تھا، پرانے ناچ گانے، کہنہ در و دیوار، وقت خوردہ قندیلیں، آڑی ٹیڑھی کرسی میزیں، دہقانی چولیوں اور لہنگوں میں ملبوس خواصیں۔ رطلِ گراں، مٹکوں اور کنستروں کا ایسا انبار کہ خاقانی نے آواز دی ؎

ساقی بدہ رطلِ گراں آں مے کہ دہقاں پرورد

غرض اس کا ووبولے (CAVEAUBOLAY) کی ایسی شان تھی کہ دور دور سے لوگ اسے دیکھنے آتے تھے۔ کبھی کبھی لندن کے احباب ہمّت سنگھ، فیروز گاندھی وغیرہ آجاتے تو لطفِ صحبت دوبالا ہو جاتا۔ یہ وہی فیروز تھے جنھوں نے بعد میں پنڈت نہرو کی صاحبزادی اندرا سے شادی کی۔

پیرس میں ایسے کئی مقام تھے جو اپنے کردار اور فضا کے لیے مشہور تھے۔ رات گئی، بات گئی، اب ان کا ذکر بھی بے سُود ہے۔ کیونکر یا تو وہ بے نشان ہو گئے، اور یا برائے نام رہ گئے۔ ایک شبستان LUMIERE نامی مجھے پسند تھا۔ وہاں دو چار مصوّر آپ کا خاکہ یا کارٹون بنانے کے لیے موجود ہوتے تھے۔ ایک دو شاعر برجستہ آپ کی شان میں چھوٹی موٹی

نظم لکھنے کو تیار رہتے تھے اور ایک وائلن نواز آپ کی دل پسند دُھن چھیڑ دیتا تھا۔

خالدہ ادیب خانم سے تعارف

ہوٹل میں سامان رکھ کر میں نے وہ خط بذریعہ ڈاک خالدہ ادیب خانم کو روانہ کر دیا جو مسز سروجنی نائیڈو نے ان کے نام دیا تھا۔ چند سال قبل جامعہ ملّیہ کی دعوت پر خانم ہندوستان آئی تھیں اور ان کے خطبات، ترکی میں مشرق و مغرب کی کش مکش کے نام سے شایع ہو کر اہلِ نظر سے خراجِ تحسین حاصل کر چکے تھے۔ واپس آ کر اپنے سفر کا حال انھوں نے INSIDE INDIA کے نام سے لکھا جس کا ترجمہ اردو میں "اندرونِ ہند" کے نام سے چھپا۔ خالدہ خانم اور ان کے شوہر عدنان بے، اتاترک کے اوّلین رفیقوں میں تھے۔ لیکن سیاسی اختلاف کی بنا پر انھوں نے ترکِ وطن کیا اور پیرس میں سکونت اختیار کر لی۔ عدنان بے ترکی زبان کا درس دینے لگے اور خالدہ خانم انگریزی میں تصنیف و تالیف میں مشغول ہو گئیں۔ وہ بیک وقت انگریزی اور ترکی کی معروف مصنّفہ تھیں اور ان کی کئی کتابوں کے ترجمے یورپین زبانوں میں ہو چکے ہیں۔

دو دن بعد عدنان بے نے فون پر ہمیں چائے کی دعوت دی۔ پیرس کے جنوب میں "دوستے یونیورستے" نامی علاقہ تقریباً پچاس ہوسٹلوں پر مشتمل ہے جن میں سے ہر ایک کسی نہ کسی ملک نے اپنے طلبہ کی اقامت کے لیے بنایا ہے۔ سب ملا کر یہاں دس بارہ ہزار طالب علم رہتے ہیں۔ اساتذہ کے لیے سیکڑوں فلیٹ قرب و جوار میں بنائے گئے ہیں، جن میں سے ایک عدنان بے کے حصّے میں آیا تھا۔

عدنان بے دراز قد، لاغر اندام، کم سخن اور افسردہ مزاج آدمی تھے۔ خالدہ خانم کی خوش مزاجی میں ایسا وقار تھا اور ان کی آنکھوں میں ذکاوت اس طرح درخشاں تھی کہ پہلی نظر میں کسی عظیم شخصیت کی موجودگی کا گمان ہوتا تھا۔ ان کی بے پایاں شفقت کا سایہ جمیدہ اور مجھ پر اس طرح رہا کہ مشکل وقتوں میں بھی ہمیں تنہائی کا احساس نہیں ہوا۔

خالدہ خانم نے مشورہ دیا کہ فرانسیسی زبان اور تہذیب سے جلد واقفیت حاصل کرنے کا

صحیح طریقہ یہی ہے کہ کسی ایسے شریف گھر کے مہمان بنو جہاں انگریزی سے کوئی آشنا نہ ہو۔ اس طرح تم مجبوراً جلد از جلد زبان سیکھو گے اور اچھے لوگوں سے میل ملاقات پیدا کرو گے۔ چنانچہ انھوں نے کسی وکیل کی بیوہ مادام مارتاں کے گھر ہماری رہائش کا انتظام کر دیا اور وہاں سال بھر ہم بڑے چین سے رہے۔

میں صبح سویرے انگریزی کا اخبار پڑھتا، پھر فرانسیسی روزنامہ میں انھیں خبروں کو دہراتا اور مشکل لفظ کا مطلب ڈکشنری میں دیکھ لیتا۔ پھر دکانوں کے نرخ ناموں سے اشیا کے نام یاد کرتا ہوا فرانسیسی زبان کا درس لینے چلا جاتا اور اپنی میزبانوں سے تحریر و تقریر میں اصلاح لیتا رہتا۔ غرض چند مہینوں میں گفت و شنید میں رواں ہو گیا اور مطالعے میں مہارت ہو گئی۔

زبان سیکھنے کا آسان طریقہ یہی ہے کہ اہلِ زبان میں رہا جائے اس سے نہ صرف زبان کا صحیح ادراک ہوتا ہے بلکہ اس کے مزاج سے بھی تعلق پیدا ہوتا ہے۔ اسی طرح روزمرّہ کی خصوصیتوں اور ادب کی نزاکتوں کا پتا چلتا ہے۔ رفتہ رفتہ جب فرانسیسی زبان کے وسیلے سے اس کے ادب تک براہِ راست رسائی ہوئی تو سمجھ میں آیا کہ اس کی نثر کیوں بے ہمتا ہے۔

انگلستان کو اس نسبت سے سلطنتِ رومیٰ کا جانشین کہا گیا ہے کہ اس کے آئین و قانون اور نظم و نسق سے استفادہ کیا۔ فرانس کے حصے میں یونان کی حکمت اور فنی جوہر آئے۔ فرانس کا طرزِ فکر منطق و استدلال سے بنا ہے اور اسی وجہ سے اس کے ادب کی شان نظم نہیں نثر میں نظر آتی ہے۔ یہاں لفظ و معنی میں ایسی ہم آہنگی ہے کہ ابہام کا پردہ چاک ہو جاتا ہے اور لفظ کا ظاہر و باطن ایک ہو کر سادگی، صحت اور اختصار کے میل سے حسن پیدا کرتا ہے۔ اور یہ حُسن ایسا ہے کہ حقیقت کو آئینہ دکھاتا ہے۔

دانش گاہِ پیرس، جسے سوربون یونیورسٹی بھی کہتے ہیں، سات سو سال پرانی ہے۔ میرے زمانے میں وہاں سترّہ ہزار طالب علم تھے۔ اب تعداد دُگنی ہے۔ اس سے بھی زیادہ ہو گئی تھی لیکن اطراف میں نئی دانش گاہوں کے قیام کے بعد کم ہو گئی ہے۔ تعلیم بالکل مفت تھی بلکہ شناختی کارڈ پر مخصوص ریستوراں، اسٹور، تھیٹر، ریل وغیرہ میں خاصی رعایت مل جاتی تھی۔ ایک طریقہ

ایسا پسندیدہ ہے کہ اس کی پیروی سے ہمارے تعلیمی اداروں کو بھی فائدہ ہو سکتا ہے۔ وہاں مستقل اساتذہ کے علاوہ مختلف علوم کے ماہروں کو معاوضے پر بطور مہمان درس کی دعوت دی جاتی ہے۔ مثلاً اس وقت پیرس یونیورسٹی میں سات سو مستقل اور دو ہزار مہمان استاد ہیں۔ باہر کا آدمی بلا روک ٹوک لیکچر سن سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس طرح درس و تدریس کا دائرہ بہت وسیع ہو جاتا ہے اور یونیورسٹی بسم اللہ کے گنبد میں بند نہیں رہتی۔

ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے لیے میں نے تحقیق کا جو موضوع منتخب کیا، وہ تھا "ہندِ قدیم کی زندگی سنسکرت ادب کے آئینے میں"۔ یہ کام میں نے علومِ ہند کے مشہور زمانہ پروفیسر لوئی رینو کی نگرانی میں انجام دیا۔ نیز عمرانیات کی حد تک میری رہبری پروفیسر مارک بلوک نے کی جو دورانِ جنگ نازیوں کے ہاتھوں مارے گئے۔ جب انھوں نے تحقیقی مقالہ کے خاکہ کی منظوری دے دی اور حوالہ کی کتابوں کی فہرست مکمل کر دی، تو طے پایا کہ ان کے درس میں حسب ضرورت شرکت کروں اور ہفتے میں ایک بار اُن سے مل کر غور طلب مسائل پر ان کی ہدایت حاصل کروں۔ مہینے میں ایک آدھ بار ملاقات ان کے گھر پر ہوتی تھی اور اس طرح آزادی سے تبادلۂ خیال کا موقع فراہم ہوتا تھا۔

کہنے کو پیرس میں ایک "انڈین ایسوسی ایشن" بھی تھی جس کے ارکان میں دو رجحانات کارفرما تھے۔ بیشتر تاجر اور چند نوجوان گاندھی بھگت کانگریسی تھے اور باقی ریڈیکل (شدت پسند) قسم کے طالب علم تھے۔ اس وقت ایسوسی ایشن کا جو صدر تھا وہ بعد میں ڈاکٹر کیسکر کے نام سے سالہا سال پنڈت نہرو کی حکومت میں وزیر اطلاعات کے عہدے پر فائز رہا۔ میں پیرس پہنچا ہی تھا کہ ایسوسی ایشن کا جلسہ اس غرض سے منعقد ہوا کہ یا تو کیسکر کو دوبارہ صدر منتخب کیا جائے اور یا کسی اور کو یہ جگہ دی جائے۔ کیسکر کانگریسی خیالات کا ترجمان تھا۔

"قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند" مجھ سے بغیر پوچھے برجیش اور امتیاز کی تحریک پر اکثریت نے مجھے گوشے سے اٹھا کر کرسیٔ صدارت پر بٹھلا دیا۔ ایسوسی ایشن کا پتا صدر کی رہائش گاہ کو سمجھا جاتا تھا اور اس کی جملہ متاع کاغذ کا ایک چھپا ہوا پیڈ تھا۔ ایسوسی ایشن کی انتظامیہ کی میٹنگ

مہینے میں ایک بار ہمارے پسندیدہ کیفے سُورس میں ہوتی تھی جس کے مالک نے ہماری خوشنودی کے لیے روزنامہ "بمبئی کرانیکل" جاری کر دیا تھا، جس کا بنڈل ماہ بہ ماہ پہنچا کرتا تھا۔ ایسوسی ایشن کا عام جلسہ کسی نامور ہندوستانی رہنما کی آمد کے وقت ہوتا تھا جس کا خرچ چندہ سے بلا دقّت پورا ہو جاتا تھا۔

ایسوسی ایشن کے صدر کی حیثیت سے کبھی کبھی مجھے دلچسپ فرائض سے دوچار ہونا پڑتا تھا۔ ایک دن کسی مدراسی نووارد نے کہا کہ میں ماہرِ رقص ہوں، آپ کسی ترکیب سے تعارف کرا دیں تو میرا کاروبار چل نکلے۔ اس وقت تک یورپ میں ہندوستانی نرت یا سنگیت کو کوئی نہیں جانتا تھا۔ بہرحال میں نے سوچا کہ ہر سنیچر کی رات کو یونیورسٹی یونین میں جو محفلِ رقص ہوتی ہے اس میں اس کا ناچ ہو جائے تو کیا مضائقہ ہے؟ چنانچہ موقعۂ واردات پر اس نے اپنی دھج کشن جی کی بنائی۔ سر پر اودے رنگ کی پگیا، ہاتھوں میں مُرلی اور گلے میں پھولوں کی مالا۔ کمر کے نیچے دھوتی کہیں سے ہندوستانی ساز کے دو تین ریکارڈ بھی مل گئے۔ جب یہ شخص اسٹیج پر وارد ہوا تو حاضرینِ کے جمِ غفیر نے اشتیاق سے اس کا خیر مقدم کیا اور میں نے کشن لیلا اور اس رقاص کی تعریف میں تقریر کی۔ پھر ساز کی گت پر ٹھوکر لگا کر اس نے جھونکا بھرا تو پاؤں کے انگوٹھے میں پھنس کر دھوتی کھُل گئی اور یہ سرِ عام ننگا ہو گیا۔ وہ تو خیر ہوئی کہ لنگوٹی رہ گئی۔ ایک لمحے کے لیے ہال میں سنّاٹا چھا گیا، پھر لڑکیوں نے فرانسیسی میں "اوئی توج" کی آواز لگائی۔ یہ نامعقول دھوتی باندھنے لگا تو میں نے ڈانٹا کہ یہاں اگر عورتیں بے لباس ناچتی ہیں، تو تُو کیوں شرماتا ہے۔ اس نے میری بات رکھ لی اور ننگ دھڑنگ وہ دھما چوکڑی مچائی کہ سب عش عش کرتے رہ گئے۔ جب وہ اسٹیج سے رخصت ہوا تو میں نے تماشائیوں کو سمجھایا کہ یہ رقص اس عاشقِ مہجور کی کیفیت بیان کرتا ہے جو ہماری آب و ہوا میں چاک دامن ہو کر کوچہ یار میں ناچتا پھرتا ہے۔

پنڈت نہرو کی آمد

جون ۱۹۳۸ء میں جواہر لال نہرو جب پیرس وارد ہوئے تو ان کی شہرت ہندوستان کے حدود سے باہر پہنچ چکی تھی۔ ان کی انگریزی تصانیف لندن سے شایع ہو کر مقبول ہو چکی تھیں

اور فاشزم کی مذمّت میں ان کے اقوال اخباروں میں نقل ہوتے تھے۔ پیرس میں چند ہفتے انھوں نے "ہوٹل نپولین" میں قیام کیا اور مجھے بارہا ان کی صحبت کا شرف حاصل ہوا۔ اس موقع پر ان کی صاحبزادی اندرا سے بھی ملنے کا موقع ملا جو آکسفورڈ سے آئی ہوئی تھیں۔

"انڈین ایسوسی ایشن" نے پنڈت نہرو کے اعزاز میں جو جلسہ کیا اُس کی صدارت کا فرض مجھے انجام دینا پڑا۔ ہندوستانیوں کے علاوہ غیر ملکی بھی خاصی تعداد میں موجود تھے۔ میں نے اپنی تقریر میں کانگریسی وزارتوں کے خلاف مسلمانوں کی شکایتوں کا ذکر کرتے ہوئے خدشہ ظاہر کیا کہ اگر ان کا سدِّباب نہ ہوا تو دونوں قوموں میں اختلاف بڑھ جائیں گے اور قومی اتحاد کا امکان ختم ہو جائے گا۔ اس پر پنڈت جی چراغ پا ہو گئے اور فرمایا کہ ملک کے اندرونی معاملات پر بحث کا یہ موقع و محل نہیں۔ اُن کی خفگی کی اصل وجہ یہ تھی کہ ۱۹۳۷ء میں یو۔پی میں کانگریس اور مسلم لیگ کی مخلوط وزارت کے قیام میں وہی حارج ہوئے تھے جس کے بعد دونوں جماعتوں میں تنازعہ بڑھتا چلا گیا۔

راجہ کالاکانکر سے پنڈت جی کے خاص مراسم تھے اور اس نسبت سے برجیش انھیں خوب جانتے تھے۔ چنانچہ جلسے کے بعد پنڈت جی کے ساتھ وہ امتیاز اور مجھے کسی عمدہ رستوراں میں لے گئے۔ جب کھانا ختم ہوا تو پنڈت جی نے فرمائش کی کہ کافی کہیں اور چل کر پی جائے۔ ہم لوگوں نے ٹیکسی پر "موں پرناس" کے علاقے کا رخ کیا جو اب سے زیادہ اس وقت دانشوروں اور فن کاروں کے قہوہ خانوں کے لیے مشہور تھا۔ ہم جب کیفے "رو تونڈ" میں جا کر بیٹھے تو برجیش نے کہا "اوّل جنگ عظیم سے قبل یہ چھوٹی سی جگہ تھی اور لینن یہاں اکثر آتا تھا۔ اس کے مالک ژاکوب (JACOB) سے اس کی ملاقات ایسی غیر رسمی تھی کہ کبھی پیسے کی تنگی ہوتی تو پرچہ بھیج کر قرض منگوا لیتا تھا۔ پھر جب لینن فرانس سے چلا گیا اور چند سال بعد انقلابِ روس کے لیڈر کی حیثیت سے رونما ہوا تو ژاکوب حیرت سے اُچھل پڑا اور اُن پرچوں کو فریم میں آویزاں کر کے اعلان کیا کہ یہ وہ جگہ ہے جس کا سرپرست لینن تھا۔ پھر تو اس کیفے میں سیّاحوں کا ایسا ہجوم ہوا کہ اس کی قسمت جاگ اٹھی اور حلیہ بدل گیا۔ یہ واقعہ سُن کر پنڈت جی سخت متعجّب ہوئے اور پوچھا "ژاکوب اب کہاں ہے اور پرچیاں کہاں گئیں؟" برجیش نے

بتلایا "ژاکوب بوڑھا ہو چکا ہے اور کاروبار اس کے بھائی بند چلاتے ہیں۔ تاہم وہ اکثر رات کو یہاں آتا ہے"۔ حُسنِ اتفاق سے وہ تجوری کے پاس محوِ نوشی نظر آیا۔ پنڈت جی نے اس سے ملنے کی خواہش ظاہر کی، تو میں ہمّت باندھ کر اس کے پاس گیا اور کہا کہ ہندوستان کا لینن محض آپ سے ملنے آیا ہے اور اگر آپ اس سے مل لیں تو بڑا کرم ہو۔ اس عرض پر ژاکوب نے لبیک کہا اور ہمارے پاس آ بیٹھا۔ پھر تجوری سے تین چار فریم لے آیا جن میں لینن کے چند حرفی نوٹ محفوظ تھے جن کی روشنائی مدّھم پڑ چکی تھی۔ ہم لوگوں نے دیر تک ان نادر دستاویزوں کا معائنہ کیا اور پنڈت جی نے کہا "موسیے ژاکوب، ان پرچوں کی قیمت کا اندازہ لگانا مشکل ہے"۔ ژاکوب نے ہنس کر جواب دیا "مجھے لاکھوں روپے پیش کیے گئے۔ میں انھیں بیچ دوں تو میری حیثیت کیا رہ جائے گی۔ پھر آپ جیسے لوگ مجھے کیوں پوچھیں گے؟"

کیفے روتوندا اب بھی باقی ہے۔ لیکن ژاکوب کو مرے عرصۂ دراز ہوا اور معلوم نہیں ان پرچوں کا کیا حشر ہوا؟

چند روز بعد اسپین کی جمہوری حکومت کی دعوت پر پنڈت نہرو میڈرڈ چلے گئے۔ دراصل جمہوریت کی جاں کنی کا وقت نزدیک آ رہا تھا۔

اسپین کی خانہ جنگی

یہ سب سمجھتے تھے کہ اسپین میں ترقی اور رجعت کے مابین جو جنگ ہو رہی تھی۔ اس کے فیصلے پر دُنیا کے مستقبل کا بڑی حد تک دارومدار ہے۔ ۱۹۳۶ء میں ملک کی نو زائیدہ جمہوریت کے خلاف جس نے بغاوت کا پرچم بلند کیا وہ مقبوضہ مغربی صحرا کا فوجی حاکم جنرل فرانکو تھا۔ اس نے عرب سپاہیوں کو ورغلایا کہ جس اُندلس سے تمھارے اجداد کو صدیوں پہلے بزورِ شمشیر نکالا گیا تھا، چلو، اس پر قبضہ کریں۔ یہ ویسی ہی بات تھی جو ۱۸۵۷ء میں انگریز نے سکھوں کو سُجھائی تھی کہ "چلو دہلی پر قبضہ کرو اور مسلمانوں سے پرانا بدلہ چکاؤ"۔ چنانچہ فرانکو کی فوج ملک کے جنوبی ساحل پر اُتر آئی اور خانہ جنگی کی آگ بھڑک اٹھی۔ سولھویں صدی میں اُندلس سے اپنے جبری انخلا کو عربوں نے اس طرح یاد رکھا ہے کہ ان کے جانشیں مراکش میں اب

تک اپنے متروکہ مکانوں کی چابیاں اور سامان کی فہرست لیے بیٹھے ہیں کہ موقع ملتے ہی دعویٰ دائر کریں۔ فرانکو کی اس مہم کا شور ہندوستان تک پہنچا اور اس کے نائب جنرل مولا (MAULA) کا نام جب خواجہ حسن نظامی نے سُنا تو انھیں یقین آگیا کہ یہ بھی کوئی سیّدی و مولائی ہے اور اس کی حمایت میں بیان دے ڈالا۔ فرانکو تاحیات ان عرب صحرانشینوں کی وفاداری کو نہ بھولا اور انھیں اپنا باڈی گارڈ بنائے رکھا۔ نپولین کا خاص خادم بھی ایک مصری عرب تھا جس کا نام "رستم" پڑ گیا تھا۔

فرانکو کے ساتھ کلیسا، سرمایہ دار اور جاگیردار تھے اور پشت پر ہٹلر اور مسولینی کی فوجی طاقت تھی۔ جمہوری حکومت کے ساتھ بائیں بازو کی پارٹیاں تھیں جن کی باہمی رقابت نے فرانکو کا کام آسان کر دیا۔ جس طرح جرمنی میں سوشلسٹ اور کمیونسٹ جماعتوں کے باہمی نفاق نے نازی حکومت کا راستہ ہموار کر دیا تھا۔ ۱۹۳۸ء میں جب اسپین کی جمہوری حکومت پسپا ہونے لگی تو ہٹلر نے بڑھ کر آسٹریا پر قبضہ کیا اور فرانس پر دونوں طرف سے فاشزم کا ایسا نرغہ ہوا کہ متحدہ محاذ کا شیرازہ منتشر ہو گیا۔ اُدھر روس میں سرخ فوج کے اندر اسٹالن نے ایسا تہلکہ مچایا کہ وہ مفلوج ہو کر رہ گئی اور اس کا خمیازہ اسے جنگ کی ابتدا میں جس طرح اٹھانا پڑا وہ سب کو معلوم ہے۔ بنا بریں ۱۹۳۸ء کے اکتوبر میں برطانیہ اور فرانس نے میونخ میں چیکوسلوویکیا پر جرمنی کے تسلّط کو تسلیم کر کے مشرق میں ہٹلر کی یلغار کے لیے میدان صاف کر دیا۔

مغربی حکومتوں نے غیر جانب داری کے بہانے جمہوری فوجوں کو اسلحہ بھیجنے سے انکار کر دیا اور روس اتنی دور تھا کہ وہاں سے وافر کمک پہنچنا امرِ محال تھا۔ اس موقع پر دنیا کے دانشوروں، ادیبوں اور فن کاروں نے انٹرنیشنل برگیڈ ترتیب دے کر جس بہادری سے فاشزم کا مقابلہ کیا، اس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔ اس میں آندرے مالرو، ہیمنگوے، اروِیل، آرتھر کوئسلر جیسے لوگوں نے شرکت کی۔ یہ وہ منزل ہے جہاں صحیح معنوں میں ادب کی تخلیق خونِ جگر سے ہوتی ہے۔

فرانس کی جو خفیہ تنظیم اسپین کے جمہوری علاقے سے رابطہ رکھتی اور رسل و رسائل کا انتظام کرتی تھی اس سے میرے دوست "الفانسو دی فگیریڈو" کا گہرا تعلّق تھا۔ وہ برازیل کے

ایک پرانے خاندان کا چشم و چراغ تھا، اور مدّتوں سے پیرس میں رہ پڑا تھا۔ اُس کا باپ کاؤنٹ فگیریڈو کبھی فرانس میں برازیل کا سفیر تھا۔ برازیل کے ڈکٹیٹر ورگس (VARGAS) کے خلاف فوجی بغاوت میں الفانسو پیش پیش تھا اور اس کی ناکامی کے بعد پیرس میں جلاوطنی کے دن کاٹ رہا تھا۔ شہر کے شمالی ریلوے اسٹیشن GAREDUNORD کے پاس اس کا ذاتی فلیٹ تھا جس میں سات آٹھ کمرے تھے۔ اس کا وقت انقلابی سرگرمیوں میں اس طرح صرف ہوتا تھا کہ قریبی دوستوں کو بھی اس کی نوعیت کا اندازہ نہیں ہوا۔ وہ محتاط اور کم سخن تھا۔ لیکن مجھ سے اس کی دوستی ایسی مستحکم ہوئی کہ زمان و مکان کے فاصلے کے باوجود اب تک باقی ہے۔

اس کی صحبت میں مجھے اسپین اور جنوبی امریکہ کے کئی نامور لوگوں سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ ایک بار اس نے میرا تعارف یگانۂ روزگار "پکاسو" سے کرایا جو اپنے شاہکار گوئرنکا (GOERNICA) کی نمائش کا اہتمام کر رہا تھا۔ نازی بم باروں نے اس شہر کو نیست و نابود کر دیا تھا اور اس تصویر میں "پکاسو" نے اس تباہ حال شہر کے پس منظر میں انسانیت کے انتشار کا خاکہ اڑایا ہے۔ اسپین پر نپولین کے حملے کی ہولناکی کا جو منظر GOYA نے پیش کیا تھا، اس کے بعد، جنگ کی بربادکاری کا اس سے زیادہ مؤثر مرقع کسی نے پیش نہیں کیا۔ پکاسو کی عمر اُس وقت پچاس سال ہوگی۔ میانہ قد، ورزشی جسم، تند مزاج، باطن بیں نگاہیں، متحرک خدوخال۔

پابلو نرودا، چلّی کے سفارت خانے میں اتاشی کی خدمت انجام دے رہا تھا اور الفانسو کے فلیٹ میں اس کا آنا جانا تھا۔ وہ دیر تک اسپین کے انقلابی شاعر "گارسیا لورکا" کا کلام سُناتا رہا جسے غرناطہ میں فاشسٹوں نے قتل کر دیا تھا۔

میری طرح الفانسو کو شطرنج کا شوق تھا اور یہ شوق کبھی کبھی ہمیں کیفے نپولین لے جاتا تھا، جو اوپیرا کے پاس ہی تھا۔ اس کے متعلق مشہور تھا کہ نپولین یہاں شطرنج کھیلنے آتا تھا۔ ہال کے صدر میں چبوترے پر اس کی مرصّع کرسی ایک خوبصورت بساط کے ساتھ رکھی ہوئی تھی۔ اس روایت کی کشش تھی کہ دنیا بھر سے شطرنج کے شائق یہاں جمع ہوتے تھے۔

ایک رات کو میں حسبِ قرار وہاں بیٹھا الفانسو کا انتظار کر رہا تھا کہ میرے ہمسایہ نے پوچھا "شطرنج کھیلو گے؟" اس عمر رسیدہ قوی ہیکل شخص سے تعارف کے بغیر میں کھیل پر آمادہ ہو گیا۔ بساط لگاتے ہوئے اس نے مسکرا کر کہا "کچھ بازی بھی تو لگاؤ" میں سمجھ گیا کہ یہ کوئی خرانٹ ہے اور بازی کی بجائے کافی کی پیش کش کی۔ تھوڑی دیر میں مات ہوتے ہی والا تھا کہ الفانسو آ گیا اور اس شخص کو سلام کر کے مجھ سے بولا "ارے، تم کس سے کھیلنے بیٹھ گئے۔ جانتے بھی ہو کہ یہ "کاپا بلانکا" ہے" میں نے اس شاطر باکمال سے معذرت کی، کچھ وقت پہلے تک وہ عالمی چیمپئن رہ چکا تھا۔ اس کے بعد میں نے کئی بار اسے یہاں شطرنج کھیلتے دیکھا۔ اب تو مشق نہیں۔ پہلے مجھے شطرنج میں خاصی مہارت حاصل تھی۔

اسپینی پناہ گزینوں کے کیمپوں میں جانے کا مجھے بارہا اتفاق ہوا اور اشتراکی فرقہ وارانہ رقابتوں کے بہت سے واقعات سنے اور دیکھے۔ ان کا ذکر اب بے سود ہے۔ کوشش کے باوجود اس وقت میں اسپین نہ جا سکا۔ اس کا موقع ۱۹۶۲ء میں ملا۔ اس کا حال کسی دوسرے باب میں آئے گا۔

خدا کرے، کرنل وائڈمین زندہ برقرار ہو۔ چند سال پہلے تک تو وہ مغربی جرمنی میں حیات تھا۔ ۱۹۳۹ء میں جب جمہوری فوجوں کی آخری صفیں ٹوٹ گئیں تو وہ کسی طرح جان بچا کر فرانس میں داخل ہو گیا اور جب میں اس سے ملا تو وہ ساری شام ملی جلی جرمن، فرانسیسی اور اسپینی میں بے حس دنیا والوں کو مغلظات سناتا رہا۔

وائڈمین ناکام انقلاب کا ہیرو تھا۔ پہلی جنگ عظیم میں وہ جرمن فوج میں کپتان تھا۔ جرمنی کی شکست کے بعد وہ کمیونسٹ تحریک میں سرگرم عمل رہا اور اس کی مجلس عمل کا رکن تھا۔ نازیوں کے تسلط کے بعد بھاگ کر روس چلا گیا اور سرخ فوج کے ہائی کمان سے بحیثیت مشیر وابستہ ہو گیا۔ جب ۱۹۳۸ء میں نازی جاسوسوں کے فریب میں آ کر اسٹالن نے سرخ فوج کے بے شمار افسروں کو ہلاک کیا تو وائڈمین بھاگ کر اسپین کی جمہوری فوج میں کرنل کے عہدے پر فائز ہوا۔ سوویٹ فوج پر اس کی کتاب (RED ARMY) نے اسی زمانے میں شہرت حاصل کی تھی۔

فرانس کے حکام نے اسے تین ماہ کا اقامت نامہ دیتے وقت آگاہ کر دیا تھا کہ اگر اس مدت میں وہ کہیں اور نہیں چلا گیا تو اسے جرمنی بھیج دیا جائے گا جہاں اس کی موت یقینی تھی۔ بین الاقوامی انقلاب پسند کی حیثیت سے وہ ایسا نیک نام تھا کہ کوئی ملک اسے ویزا دینے کے لیے تیار نہ تھا۔ بیچارہ دن بھر سفارت خانوں کے چکر لگاتا اور شام کو تھکا ہارا ہمارے پاس آ بیٹھتا اور ایک سانس میں ہٹلر، اسٹالن اور فرانکو کی ستم رانیوں کا حال سنانے لگتا۔ ایک بار میں نے اسٹالن کی صفائی میں زبان کھولی تو وہ مرنے مارنے پر آمادہ ہو گیا۔

وقت کے ساتھ اس کی مایوسی بڑھتی گئی۔ لیکن ایک دن قسمت نے ایسی یاوری کی کہ افسانے سے زیادہ زندگی کے حیران کن ہونے کی مثال صادق آئی۔ وائڈمین ندی کے کنارے فٹ پاتھ پر ٹہلتا جا رہا تھا کہ یک بیک ایک موٹر پاس آ کر رکی اور اس میں سے کسی خوش لباس شخص نے اتر کر پوچھا "کیا آپ مسٹر وائڈمین ہیں؟" یہ سمجھا کہ قاصدِ اجل ہو گا۔ بہر صورت جب اقرار کیا کہ میں وہی شخص ہوں۔ تو اجنبی گرم جوشی سے بغل گیر ہوا اور بائیس سال پرانا واقعہ یاد دلایا۔ جب میدانِ جنگ میں اسے گرفتار کر کے وائڈمین نے ترس کھا کر رہا کر دیا تھا۔ اس واقعے کا اس پر ایسا گہرا اثر ہوا کہ وائڈمین کی شکل صورت کو مرورِ ایام کے باوجود نہ بھولا۔ یہ کسی با اثر خاندان کا فرد تھا اور اس کی کوشش سے وائڈمین کو فرانس میں طویل وقت تک رہنے کی اجازت مل گئی۔ اس خوشی میں ہم لوگوں نے جو جشن منایا اس کا سماں آج تک یاد ہے۔

سر شیخ عبدالقادر

۱۹۳۸ء میں گرمیوں کی تعطیل میں نے لندن میں گزاری۔ جہاں انڈیا آفس لائبریری سے اپنے ریسرچ کے سلسلے میں استفادہ کرنا تھا۔ وزیرِ ہند کی کونسل کے رکن کی حیثیت سے سر عبدالقادر ان دنوں لندن میں مقیم تھے۔ شیخ صاحب کا ایک کارنامہ تو یہ ہے کہ "مخزن" کے ذریعہ اردو نظم و نثر کو نئی سمتوں سے روشناس کیا، اور دوسرا یہ کہ انگریزی داں طبقہ کو اردو ادب سے آشنا کیا۔ اب تو مغربی ممالک کی متعدد دانش گاہوں میں اردو کے درس و تدریس کا انتظام ہے۔ ریڈیو پر پروگرام ہوتے ہیں، روزنامے شایع ہوتے ہیں۔ پہلے ایسا کچھ نہ تھا۔ امریکہ سے ڈاکٹر

سیّد حسین نے "یادِ وطن" کے نام سے قابلِ ذکر رسالہ نکالا اور لندن میں شیخ صاحب کے دم سے اردو مجلس کا چراغ روشن ہوا۔ ان کی صدارت میں اس کے جلسے باقاعدہ ہوتے اور اردو کے شائقوں کو بڑی تعداد میں یک جا کرتے تھے۔

شیخ صاحب، حفیظ جالندھری کے ایسے قدر دان تھے کہ انھیں لندن بلایا اور ان کی بعض نظموں کا انگریزی میں ترجمہ کیا تاکہ ان کا تعارف وہاں کے ادبی حلقوں میں ہو۔ حفیظ میرے پرانے کرم فرما ہیں۔ میں انھیں علی گڑھ سے جانتا ہوں، جہاں وہ رشید احمد صدیقی کے مہمان ہوئے تھے۔ ایک بار جب وہ نظم خواں ہوئے تو گھر کے بچّے زور شور سے دادِ سخن دینے لگے اور صدیقی صاحب نے لقمہ دیا۔ چُپ کیوں ہو گئے۔ آپ کے اصل سننے والے تو یہی ہیں۔ دراصل حفیظ کے کلام کی خوبی یہی ہے کہ اس میں خاص و عام کے ذوق کی تسکین کا سامان موجود ہے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اردو میں ہندی شاعری کے سبک عناصر کو سمونے کی سب سے کامیاب کوشش عظمت اللہ خاں اور حفیظ نے کی ہے۔

میں بلا ارادہ اردو مجلس کے جلسے میں پہنچا تو حفیظ نے شیخ صاحب سے ملایا اور پھر ان سے نیاز مندی کا تعلق ایسا استوار ہوا کہ تقسیم ہند تک باقی رہا۔ ان کی وسیع القلبی، نکتہ رسی، اور جوہر شناسی کا فیض سب کے لیے جاری تھا۔

ایک بار شیخ صاحب کھانے پر مجھے شفیع رستوراں لے گئے جو لندن کا بہترین ہندوستانی رستوراں سمجھا جاتا تھا۔ میں نے اپنے سامنے کی پلیٹ کو سرپوش سے ڈھکا ہوا دیکھا۔ شیخ صاحب نے مسکرا کر کہا۔ اس میں آپ کے مطلب کی چیز ہے۔ سرپوش ہٹایا تو پلیٹ پر ایک بڑا سا ٹومیٹو رکھا تھا۔ شیخ صاحب نے قہقہہ لگایا۔ نوش جان۔ کیا یہ آپ کی مرغوب غذا نہیں ہے؟ معلوم نہیں میں کس ترنگ میں لکھ گیا تھا۔ یا خدا، میں تیری رحمت کا قائل ہوں کہ تو نے عورت اور ٹومیٹو جیسی نعمتیں پیدا کیں۔ بس، ٹومیٹو سے جی ایسا ہٹا کہ پھر منہ کو نہ لگا۔

شیخ صاحب کا ذہن علم و فن کی نئی منزلوں کو تلاش کرتا رہتا تھا۔ سوہو، کے کسی چائے خانے میں انھوں نے کہا "کان لگا کر سنو کہ یہ جیسی گٹار پر کیا گا رہا ہے؟" اس گیت کا بول یہ تھا ؎

اودرے دے رُک آر چریا کلا اینڈ چریا کلی
(درخت کے اوپر کالا چڑا اور کالی چڑیا ہیں)
انڈرے دے رُک آر پیارا نوں اینڈ پیاری نی
(درخت کے نیچے پیارا اور پیاری ہیں)

جیسی بولی میں ہندوستانی عناصر پر شیخ صاحب نے ایسی گفتگو کی کہ یہ میری دلچسپی کا موضوع بن گیا اور بعد میں ہنگری اور اسپین جیسے دور دراز ملکوں میں ان سے مل کر اس امر کی مزید تصدیق ہوئی کہ ان کا جنم بھوم یہی برصغیر ہے اور ان کی بولی میں ہماری زبان کے الفاظ کثرت سے شامل ہیں۔

ہماری پیرس واپسی کے ذرا دیر بعد حفیظ کے ساتھ سر عبدالقادر ایک ہفتے کے لیے وہاں سیر کے لیے آئے۔ ان کے ساتھ شہر کے اطراف کے کئی قابلِ دید مقاموں تک رسائی ہوئی اور میں شیخ صاحب کی دیدہ وری کو مان گیا۔ ایک دن موزے گیمے (MUSEE GUIMET) نامی عجائب گھر چلنے کی فرمائش کی۔ یوں تو میں پیرس کے تقریباً سبھی مشہور عجائب گھروں میں کافی وقت گذار چکا تھا، لیکن اس جگہ سے ناواقف تھا۔ وہاں "گاندھارا" کے مجسّموں کا بہت بڑا ذخیرہ تھا۔ جب شیخ صاحب کو میری لاعلمی کا اندازہ ہوا تو وہ اس عجائب گھر میں دیر تک "گاندھارا" کی فنی خوبیوں پر تقریر کرتے رہے۔ انھیں فنونِ لطیفہ کا کیسا گہرا ادراک تھا، اس کا علم ہمارے یہاں کم لوگوں کو ہے۔

ایک شام میں شیخ صاحب اور حفیظ کو خالدہ ادیب خانم سے ملانے لے گیا۔ دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں اور شیخ صاحب نے حفیظ کی نظموں کی انگریزی میں ترجمانی کی۔ جب وہ چلے گئے تو خانم نے پوچھا کہ حفیظ کرتے کیا ہیں۔ جب میں نے بتلایا کہ ان کا پیشہ شاعری ہے۔ تو انھیں یقین نہ آیا۔ ذرا مشکل سے انھیں باور کرا سکا کہ صرف حفیظ نہیں، بلکہ اور کئی شاعروں کا وظیفۂ حیات یہی فن شریف ہے اور گو اب درباداری اور قصیدہ سرائی کے دن بیت گئے لیکن مختلف ذرائع سے اتنی فتوحات حاصل ہوتی ہیں کہ راوی چین لکھتا ہے۔ خالدہ خانم نے حیرت سے کہا کہ یہ تمھارے ہی ملک میں ممکن ہے ورنہ دوسری جگہ مفت میں بھی شعر سننے کی کسی

کو فرصت نہیں۔

عدنان بے اور خالدہ خانم کو قومی وقار کا اتنا پاس تھا کہ اتاترک سے اپنے اختلاف کا ذکر کبھی نہ کیا۔ بایں ہمہ خوددار اتنے تھے کہ حکومت ترکیہ سے ہر ماہ پنشن آتی اور یہ اسے واپس کر دیتے تھے۔ پیرس کے ترک باشندے، جن میں سے چند میرے قریبی دوست تھے دل میں ان کا احترام کرتے لیکن سفارت خانے کے خوف سے ان سے دور دور رہتے تھے۔

ایک دن باتوں باتوں میں خانم نے ان ہندوستانی مسلمانوں کا حال سنایا جو بظاہر تحریک خلافت کے نمائندہ مگر دراصل برطانوی جاسوس تھے۔ ان میں سے ایک مصطفےٰ صغیر مراد آبادی نے اتاترک کے قتل کی سازش کی اور بااثر حلقوں سے ایسی راہ و رسم پیدا کی کہ اس کے حُسنِ نیت پر سب کو اعتبار ہو گیا۔ پھر کسی طرح اس کا راز فاش ہو گیا اور اسے گولی مار دی گئی۔ جو مشتبہ ہندوستانی اس موقع پر ترکی سے فرار ہوئے ان میں اقبال شیدائی بھی تھے۔

خالدہ خانم کو وطن سے دوری کا غم اور دونوں بیٹوں سے طویل جدائی کا صدمہ تھا۔ ۱۹۳۸ء کے آخر میں جب اتاترک کا انتقال ہوا تو ان کی جگہ عصمت انونو نے لی جنھیں ان سے کوئی پرخاش نہ تھی۔ میں نے پوچھا کہ اب تو آپ کو وطن لوٹنے میں کوئی قباحت نہیں۔ وہ بولیں کہ یہ تبھی ممکن ہے، جب عصمت انونو ہمیں واپس آنے کی دعوت دیں۔ اس کا کچھ جواز چاہیئے۔ پھر کچھ سوچ کر بولیں "اگر تم میرا انٹرویو ہندوستان کے کسی انگریزی اخبار میں چھاپ دو اور اس کا ترجمہ ترکی میں شایع ہو تو یہ کام آسان ہو جائے گا"۔ چنانچہ اپنے قلم سے انھوں نے ایک طویل انٹرویو لکھا (یہ مسودہ میرے پاس محفوظ ہے)، جو میرے نام سے "ہندوستان ٹائمز" میں اشاعت پذیر ہو کر ترکی میں منتقل ہوا۔ اس صلح صفائی کا نتیجہ وہی ہوا جو خانم نے سوچا تھا۔ چند ماہ بعد پیرس کا ترک سفیر بارہ سال میں پہلی بار عصمت انونو کا خط لے کر خانم کے گھر آیا۔ وطن لوٹ کر وہ تصنیف و تالیف میں مشغول رہیں اور ان کا انتقال ۱۹۶۴ء کے لگ بھگ ہوا۔ ان کی بعض تحریریں اور تصویریں ہماری عزیز متاع ہیں جن میں

حمیدہ کو اور مجھے انھوں نے اپنی اولاد کہہ کر مخاطب کیا ہے۔

پاکستان کے تصوّر سے انھوں نے مجھے کس طرح آشنا کیا۔ اس کی تفصیل آگے آئے گی۔

۱۹۳۸ء کے آغاز میں یہ دل خراش خبر ملی کہ ٹراونکور کے وزیر تعلیم اور وزیر اعلیٰ کی کش مکش کا نزلہ مجھ پر گرا اور آخری مرحلے پر وظیفے کی درخواست مسترد ہو گئی۔ مستقل آمدنی کا سہارا فقط انجمن ترقی اردو کا معاوضہ رہ گیا جس کے لیے میں ماہ بماہ بالاقساط مقررہ کام بھیج دیتا تھا۔ شکنتلا کے علاوہ قاضی نذر الاسلام کی نظموں کے تراجم کے مسوّدے مولوی صاحب تک پہنچ چکے تھے۔ علاوہ بریں، ان کی فرمائش کے مطابق مختصر ہندی اردو لُغت کی تدوین بھی شروع کر دی تھی۔ یک بیک مارچ ۱۹۳۸ء میں انھوں نے اطلاع دی کہ عنقریب انجمن کا کاروبار دہلی منتقل ہو جائے گا اور اس کی تنظیم نئے خطوط پر ہو گی۔ بنا بریں فی الحال کام موقوف کر دو۔

یک نہ شد دو شد۔ لیکن شکایت کی گنجایش نہ تھی کیونکہ یہ ایک ریاستی ادارہ کا معاملہ تھا۔ اگر انگریزی میں لکھنے کی مشق نہ ہوتی تو میں کہیں کا نہ رہتا۔ اس کے بعد یورپ کے قیام کے دوران میں نے اردو یا (ہندی) میں ایک حرف نہ لکھا۔ انگریزی اخبار نویسی اور یونیورسٹی کے مشاغل نے اس کی فرصت ہی نہ دی۔

ستم بالائے ستم اسی وقت انگریزی اردو لغت باقاعدہ منظر عام پر آئی تو مولوی صاحب کے دیباچے میں معاونین کی فہرست سے خاکسار کا نام غائب تھا۔ اس واقعے کا غم مجھے مدّتوں رہا اس وجہ سے نہیں کہ دو سال کی محنت ضایع ہوئی، بلکہ اس لیے کہ میرا قبلہ گاہ ٹوٹ گیا۔ انسانی تعلقات میں میں بعض بنیادی اصولوں اور قدروں کا پابند ہوں اور جب کبھی ان میں بل پڑا، بغیر حرفِ شکایت قلم یا زبان پر لائے وہ تعلّق ختم ہو گیا۔ شکر ہے کہ مولوی صاحب سے میرے تعلّق میں آیندہ وہ پہلی سی شور اشوری نہ رہی تو بے نمکی بھی نہ ہوئی اور مجھے ان کی نیز انجمن کی خدمت کے موقع فراہم ہوتے رہے۔

۱۹۳۸ء کے اواخر میں حمیدہ ہندوستان واپس چلی گئیں تو میں لیٹن کوارٹر کے پرانے

ہوٹل میں اٹھ آیا۔ چند ماہ بعد میرا مقالہ مکمّل ہوا تو اسی زمانے کے قاعدے کے مطابق اس کی سو مطبوعہ کاپیاں داخل کرنے کا مرحلہ درپیش ہوا۔ اس فرض سے عہدہ برا ہوتے ہوتے جون کا مہینہ آگیا، اور ضابطہ کی رو سے کم از کم تین ماہ بعد زبانی امتحان کی تاریخ مقرر ہوئی تھی، جس کے نتیجے پر ڈگری کے ڈویژن کا انحصار تھا۔ علاوہ بریں دو ذیلی مقالے دوسرے استادوں کی نگرانی میں تیار کرنا ہوتے تھے جن کا براہِ راست تعلق اصل مقالہ سے نہ ہوتا کہ امیدوار کی وسعتِ علم کا اندازہ ہو سکے۔ ان اسباب کی بنا پر طے پایا کہ زبانی امتحان اکتوبر میں ہوگا۔

شہرِ روشن

پیرس کو "شہرِ روشن" کہا گیا ہے۔ اس کے چراغاں کا لطف اٹھانا ہو تو کسی بلندی سے مثلاً آئفل ٹاور سے دیکھو تو شب برات یا دیوالی کا سماں نظر آتا ہے۔ یہ روشنی کا ایک پہلو ہے۔ لیکن اس نور کی کیفیت جدا ہے جس کی ضیا پاشی صدیوں سے علم و فن اور انسانی آزادی کی روایتوں نے کی ہے۔ عہدِ قدیم میں جو حیثیت روم کی تھی، اور عہدِ وسطیٰ میں بغداد کی، وہی عہدِ جدید میں پیرس کی تھی۔ یہ شہر صرف بڑی سلطنتوں کے مرکز ہی نہیں تھے، بلکہ عالمگیر تہذیبوں کے محور بھی تھے۔ تہذیبوں کو جاگیردار بورژوا اور پرولتاری کے کنٹوپ نہیں اُڑھائے جا سکتے۔ ان کا جوہر انقلاب زمانہ کے بعد بچ رہتا ہے وہ انسانیت کے سیہ خانے کو اُجالتا اور آگے کا راستہ سُجھاتا ہے۔

پیرس کا گُن سب نے اپنے اپنے ذوق کے مطابق گایا ہے۔ عورتوں نے فیشن کے لیے، مردوں نے تماش بینی کے لیے، فن کاروں نے مصوّری اور موسیقی کے لیے، سیّاحوں نے شہر سازی اور چمن بندی کے لیے، لذّت پسندوں نے خورد و نوش کی بوقلمونی کے لیے، یہ سب پہلے بھی تھا اور اب بھی ہے۔ البتّہ اس وقت موٹروں نے شہر پر قبضہ نہ کیا تھا، نہ آپا دھاپی تھی، نہ گرانی تھی۔ بے فکری کا وہی حال جو نادر شاہ کے حملہ سے پہلے دہلی میں تھا، جس کا تذکرہ ایک ہم عصر نے مُرقع دہلی میں تحریر کیا ہے۔ ۱۹۳۹ء شروع ہوا تو اسپین میں جمہوریت کا دم ٹوٹ رہا تھا، چیکوسلوویکیا پر ہٹلر کی گرفت مضبوط ہو چکی تھی اور جنگِ عظیم

کے بادل اس طرح اُمنڈ آئے تھے کہ سب کہتے تھے، چند ماہ میں خون برسا کر رہیں گے۔ لیکن تن آسانی اور عیش پسندی کا یہ حال تھا، سلطنت اور سرمایہ کا غرور ایسا تھا کہ کل کا فکر کسی کو نہ تھا۔

علم و فن کو فرانس کی زندگی میں خاص مرتبہ حاصل تھا، اور ان کے مسائل کو سیاست و تجارت سے زیادہ اہمیت دی جاتی تھی۔ اس وقت ادب کا موضوعِ بحث یہ تھا کہ وہ کس حد تک سیاسی و سماجی کش مکش سے وابستگی یا کنارہ کشی اختیار کر سکتا ہے۔ فرانسیسی ادب کو دورِ حاضر کے ادبی رجحانات کی تجربہ گاہ کہنا چاہیے۔ لیکن ہر تجربہ کی آزادی کے ساتھ شرط یہی تھی کہ وہ اصلاً ادب ہو۔ میں نے یورپ میں ایک ہندوستانی ادیب، کے عنوان سے کہیں ان معاملات کو مختصراً بیان کیا ہے۔

گاہے گاہے، خانۂ خالی را پری می گیرد، ہُما کا سایہ ہو تو پیغمبری اور شاہی مل جاتی ہے، جن اگر نیک مزاج ہو تو الہ دین کا چراغ دیتا ہے۔ لیکن پری کے سائے تلے صرف خلل دماغ کی پرورش ہوتی ہے۔ اس سے نجات کے دو راستے ہیں۔ ایک تو وہ جو مولانا ابوالکلام آزاد نے اختیار کیا۔ اپنے تذکرہ میں نوجوانی کے اس حادثے کا حال لکھتے ہوئے انھوں نے توبہ و استغفار کی طرف گریز کیا ہے۔ یہ تب کی بات ہے جب بمبئی میں ڈیڑھ دو سال انھوں نے آغا حشر کی صحبت میں گزارے تھے۔

دوسرا راستہ امیر تیمور نے اختیار کیا۔ اس کا بیان ہے کہ جب ایک بار یلغار کرتا ہوا وہ ایران کے شمال میں گیلان کے خطہ محمود آباد کی طرف پہنچا تو سُنا کہ وہاں کی عورتیں ایسی جادو اثر ہیں کہ کوئی فرد اُن کے دام سے نہیں نکل سکتا۔ تیمور کہتا ہے کہ کسی دشمن سے وہ ایسا نہ ڈرا تھا جیسا اس خطرے سے۔ اور اس طرح بھاگا کہ لشکر کو کہیں دم نہ لینے دیا تا آں کہ وہ دیارِ حسن و عشق سے نکل کر بے آب و گیاہ ریگ زار پہنچ گئے۔

۱۴ر جولائی فرانس کا قومی دن تھا۔ دن میں کیسی ریل پیل اور رات کو کیسی چہل پہل تھی۔ لیکن دل میں اندیشہ تھا کہ اگلا سال ایسا نہ ہوگا، اور اب کے بچھڑے ہوئے جاتے پھر ملیں نہ ملیں۔ مجھے سوئٹزرلینڈ دیکھنے کا بڑا شوق تھا، کوہِ ندا کی سی ایسی کشش تھی کہ میں آخر ماہ وہاں

چھٹی منانے چل پڑا۔

دوسری جنگ عظیم کا آغاز

حُسن کا ہر روپ دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ ان میں عورت کا حُسن سب سے آنی جانی ہے جو لقول "دے گول" گلاب کی طرح ورق ورق کھلتا اور اسی طرح مرجھاتا جاتا ہے۔ آرٹ، کردار اور فطرت کے حُسن کو دوام ہے۔ جب کبھی انسانوں سے مجھے دکھ درد ملا، تو سکون کی تلاش میں پہاڑ کے دامن یا سمندر کے ساحل پر چلا گیا۔ برف پوش پہاڑ میں میرے لیے خاص کشش ہے۔ یوں تو مجھے بعد میں بارہا سوئٹزرلینڈ جانے کا موقع ملا، مگر پہلی نظر کی بات اور ہے۔ وہاں کا سب سے اونچا پہاڑ ٹینگ فرو ہے جو گرمیوں میں بھی برف سے ڈھکا ہوتا ہے۔ اس کے نظارے نے ایسا مسحور کیا کہ ہفتہ بھر انٹرلاکن نامی بستی کے باہر ایک چھوٹے سے ہوٹل میں صبح سے شام اُس کا طواف کرتا رہا۔ پھر میں نے زیورخ کا راستہ پکڑا، جہاں دوست عزیز، نامبیار میرا منتظر تھا۔

نامبیار مالابار کے ایک مشہور برہمن گھرانے کا فرد ہے۔ اوّل جنگ عظیم کے بعد وہ تعلیم کی خاطر انگلستان گیا اور وہیں مسز سروجنی نائیڈو کی سب سے چھوٹی بہن سہاشنی سے شادی کرلی۔ غیر برہمن سے شادی کی پاداش میں باپ نے اسے عاق کردیا اور ستم یہ کہ جلد ہی بیوی سے طلاق ہوگئی۔ اس کے بعد نامبیار ملک واپس نہیں آیا۔ انگلستان سے فارغ التحصیل ہوکر وہ مدّتوں جرمنی میں رہا۔ ہٹلر کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد چیکوسلوویکیا میں رہ پڑا۔ لیکن جب وہاں بھی نازیوں کا قبضہ ہوا تو بھاگ کر پیرس آگیا۔ یہاں جو اس سے دوستی کا رشتہ قایم ہوا آج تک باقی ہے۔ نامبیار کے ذاتی مراسم پنڈت نہرو اور سُبھاش چندر بوس دونوں سے تھے۔ جنگِ عظیم کے دوران بوس نے جب آزاد ہند حکومت بنائی تو اس کا سفیر جرمنی میں نامبیار ہی تھا اور آگے چل کر پنڈت نہرو کے دور میں بھی اس نے یہی فرائض انجام دیے۔

نازی دشمن تحریک میں دو بہنوں کا نام اکثر آتا تھا جن میں سے بڑی "لوئیں" مشہور

ہندوستانی انقلابی ایم۔این۔رائے کی پہلی بیوی تھی۔ دوسری نے ایک فوٹوگرافر والٹر سے شادی کرلی تھی۔ یہ خانوادہ زیورخ میں آباد ہوگیا تھا اور نامبیار سے اس کی ایسی قربت تھی کہ مجھے بھی ہفتوں مہمانی کا شرف حاصل ہوا۔ ان صحبتوں میں نہ صرف جرمنی کی سیاستِ حاضرہ بلکہ اس کی فکری و ادبی عظمت کے بہت سے نکات سامنے آئے۔

سیر و تفریح میں وقت پلک جھپکتے گزر گیا کہ اگست کے آخری ہفتے میں ریڈیو پر یک بیک جرمنی کے وزیرِ خارجہ کے ماسکو میں نازل ہونے اور روس سے معاہدے کی خبر آئی۔ ہم سب دم بخود رہ گئے اور دیر تک کسی سے کچھ نہ کہا گیا۔ یہ وہ موقع تھا جب پولینڈ پر حملے کی تیاری ہٹلر نے مکمّل کرلی تھی اور اس کی سلامتی کی ضمانت انگلستان اور فرانس دے چکے تھے۔ جنگ یا امن کا دارومدار روس کے رویّہ پر تھا۔ اگر مغربی ممالک روس سے بروقت معاملہ کرلیتے تو شاید پولینڈ پر حملہ نہ ہوتا اور جنگ ٹل جاتی۔ لیکن وہ جرمنی کو روس سے لڑانے کے جتن میں یہ بھول گئے کہ سیاست میں کوئی کسی کا مستقل دشمن یا دوست نہیں ہوتا۔ فارسی کی مثل ہے "سیاست حساب ندارد"۔ جرمنی اور روس کے اس سمجھوتے کے اسباب و نتائج پر مخالف و موافق زاویۂ نظر سے بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ تاہم اس وقت نازی ازم اور کمیونزم میں کسی قسم کی وقتی مفاہمت بھی ناممکن سمجھی جاتی تھی، اور اس نے جو انتشار پیدا کیا اس کا تصوّر آج مشکل ہے۔

کسی نے کہا، اب پولینڈ میں جرمن فوجیں فوراً داخل ہوجائیں گی، اور مغربی اتحادی کچھ نہ کرسکیں گے۔ لیکن ہمارے سیاسی شعور نے اس امکان کو قبول نہیں کیا۔ نامبیار نے فوراً پیرس لوٹنے کا مشورہ دیا۔ مبادا جنگ چھڑتے ہی سرحدیں بند کردی جائیں اور ہم سوئٹزرلینڈ میں پھنس کر رہ جائیں۔ چنانچہ ہمارے پیرس پہنچنے کے تین دن بعد یکم ستمبر کو جرمنی نے پولینڈ پر حملہ کردیا اور جوابی کارروائی کے طور پر فرانس اور برطانیہ نے اس کے خلاف اعلانِ جنگ کردیا۔

اس اعلان کے ساتھ ہی فرانس میں فوجی قانون نافذ ہوگیا۔ بلیک آؤٹ کا سلسلہ ایسا شروع ہوا کہ چھ سال جاری رہا، جبری لام بندی اس طرح عمل میں آئی کہ اکیس سال سے

پچاس سال تک کے سب مرد مورچے پر بھیج دیے گئے۔ پولینڈ پر جرمنی کی بے پناہ ہوائی بمباری کے پیشِ نظر عام خیال تھا کہ فرانس کے شہروں کا بھی یہی حشر ہو گا۔ اس خوف سے پیرس کے باشندے اس طرح بھاگے کہ بیان نہیں ہو سکتا۔ اعلانِ جنگ کے بعد ہی ہر رات گئے جرمن بم باروں نے شہر پر پرواز شروع کر دی تھی (گو بم نہیں گرائے) اور طیارہ شکن توپوں کی گھن گرج سے حوصلہ بلند ہونے کی بجائے پست ہو جاتے تھے۔ میں نے ایسی بھگدڑ زندگی میں نہیں دیکھی کہ دن رات ریلوں اور موٹروں کے قافلوں پر لاکھوں آدمی گھر بار چھوڑ کر اس طرح بھاگے کہ ہفتہ بھر میں شہر خالی ہو گیا۔ ہُو کا ایسا عالم ہوا کہ سب دوکانیں بند، گھر بار مقفل بس، موٹر ندارد۔ سڑک ناپ جاؤ تو مشکل سے کسی آدم زاد کی شکل نظر آئے گی۔ البتہ ہر موڑ اور نکڑ پر پولیس والے ہم جیسے بچے کھچے غیر ملکیوں کی جانچ پڑتال میں مستعد ملتے تھے۔ سب جرمن بلا استثنا، گرفتار ہو گئے۔ کمیونسٹ پارٹی غیر قانونی قرار دی گئی اور اس کے سرغنہ روپوش ہو گئے۔ کیونکہ فرانسیسی فوج کے لاکھوں سپاہی ان کے ہم خیال تھے اور وہ اسے سامراجی جنگ کہنے لگے تھے۔ لہٰذا مئی میں مغربی محاذ پر جرمن یلغار کے وقت بڑی افراتفری ہوئی اور اس امر کو فرانس کی شکست کا ایک سبب قرار دیا گیا ہے۔

اور سب کے ساتھ میرے پروفیسر بھی فوج میں بھرتی ہو کر محاذ پر بھیج دیے گئے۔ الفانسو اور نامبیار کے علاوہ تقریباً سب دوست احباب منتشر ہو گئے۔ ابتدائی چند مہینوں میں ہندوستان سے خط و کتابت کا سلسلہ منقطع رہا اور آمدنی کے سب سوتے خشک ہو گئے۔ میرا دماغ اس طرح شل ہوا جیسا ۱۹۴۷ء اور ۱۹۷۱ء میں ہوا تھا۔ الفانسو نے کہا کہ ان ہنگامی حالات میں الگ الگ رہنا ٹھیک نہیں۔ چنانچہ میں اپنے ہوٹل سے اور نامبیار اپنے فلیٹ سے اس کی رہائش گاہ پر اٹھ آئے۔ نامبیار جیسا خوش گفتار دوست مجھے نہیں ملا۔ بڑی سے بڑی مشکل کو بھی ہنسی میں ٹال لینے کا وصف اس میں ہے اور دوسروں سے زیادہ اپنی غلطیوں پر دل میں ہنسنے کا انداز میں نے اس سے ہی سیکھا ہے۔

الفانسو نے اپنے آتش دان کو روشن کیا اور دو بڑے بڑے صندوقوں کو ان کے قریب رکھ کر مجھ سے کہا کہ ان میں جتنے کاغذات ہیں انھیں جلا ڈالو اور خود راشن کی

تلاش میں نکل گیا، کیونکہ ریستوراں اور دوکانیں بند تھیں۔ ایک صندوق میں صرف پاسپورٹ بھرے ہوئے تھے۔ تقریباً سبھی خالی اور دوسرے میں رپورٹ اور خطوط کے انبار۔ میں سمجھ گیا کہ ان کا تعلق اسپین کے مجاہدوں سے تھا۔ تھوڑی دیر میں یہ خس و خاشاک ہو گئے لیکن پاسپورٹ کے پٹھوں کو جلانے میں دقت پیش آئی۔ چمٹوں سے ان کی خردہ کاری میں گھنٹوں لگ گئے۔ غرض، چند روز کھاتے پکاتے اور ہنستے بولتے گزر گئے۔ سیر کو نکلتے تو وہی گلی کوچے بھائیں بھائیں کرتے، جہاں کچھ وقت پہلے عیش و نشاط کی محفلیں سجتی تھیں۔ شب گاہیں تیرہ و تار، خراباتوں میں جام و سبو الٹے ہوئے، کیفے سنسان۔ شام سے صبح بلیک آؤٹ کی وہ ہیبت ناک فضا کہ کیا مجال کسی کھڑکی سے روشنی کی کوئی کرن باہر آجائے۔ ہر چوراہے پر پولیس والا بغور دیکھتا تھا کہ "گیس ماسک" دربغل ہے یا نہیں، اور شناختی کارڈ صحیح ہے یا نہیں؟

ستمبر کے آخر میں الفانسو نے باخبر حلقوں کی اطلاع سنائی کہ مغربی محاذ میں آیندہ بہار میں جنگ ہو گی اور معمر سپاہیوں کو جلد مورچے سے گھر لوٹا دیا جائے گا، بلکہ باشندوں کی خاص تعداد رفتہ رفتہ واپس آجائے گی۔ بنابریں، ہم بھی اپنے اپنے ٹھکانوں پر آگئے۔ خیر سے میرے پروفیسر دسمبر کے آغاز میں رزم گاہ سے دانش گاہ آگئے تو انھوں نے جنوری کے آخر میں میرے زبانی امتحان کی تاریخ مقرر کی اور اس طرح ڈگری کے حصول کا مرحلہ طے ہو گیا۔

اس دوران حمیدہ کو میرے خط نہ ملے۔ اور اگر ملے بھی تو یہ سمجھ میں نہ آیا کہ میں پیرس میں پڑا کیا کر رہا ہوں۔ سر عبدالقادر لندن سے یہاں وائسرائے کی کونسل کے رکن ہو کر آچکے تھے مگر انھوں نے میری خیریت سر فیروز خاں نون سے دریافت کی جو برطانیہ میں ہندوستان کے ہائی کمشنر تھے۔ انھوں نے پیرس کے انگریز قونصل کو میرے سراغ میں لگایا جو مجھے فرانس سے نکالنے کے درپے ہو گیا۔ جب اُسے یقین آگیا کہ جنوری کے آخر میں مجھے ڈگری مل جائے گی تو بلا کر کہا "فروری کے آخر میں اطالیہ کی بندرگاہ جنیوا سے کاؤنٹ بیانکا مانو نامی جہاز ایشیا کے لیے روانہ ہو گا۔ اس پر تمھارے سفر کا انتظام کیا گیا ہے۔ اس کے بعد غالباً کوئی اور جہاز نہ ملے، کیونکہ اطالیہ کی غیر جانب داری مشتبہ ہے۔" اس کا خیال بالکل صحیح نکلا۔

میں نے بادلِ ناخواستہ اس کے مشورے پر عمل کیا۔ اور بارِ غم لیے ہوئے رات کی ٹرین پر اطالیہ روانہ ہوگیا۔ اس دور کی یاد "جسم کی پکار" اور "دل کا اندھیرا" نامی میرے دو افسانوں میں تحریر ہے۔ ان کا شمار میرے کامیاب افسانوں میں ہوتا ہے اور یہ دوسری زبانوں میں بھی منتقل ہو چکے ہیں۔

صبح جب گاڑی جنیوا پہنچی، تو شہر کا وہ نقشہ نہ تھا جو میں نے سوا سال پہلے دیکھا تھا۔ یورپ سے ہجرت کرنے والوں کے لیے یہی ایک راہ فرار رہ گئی تھی کیونکہ غیر جانب دار اطالیہ کے جہاز تارین دم بے خطر سمندر پار کر سکتے تھے۔ پریشان حال تارکینِ وطن کا ایک انبوہ گلی کوچوں میں سرگرداں نظر آتا تھا۔ ہوٹل کے کمرے اور جہاز کے کیبن میں شرکت کے لیے جو سوغات پیش ہوتی تھی اس کا مذکور نہیں۔

کلکتہ چھوڑتے ہوئے میری حالت صیاد دیدہ آہو کی تھی۔ لیکن اب کیفیت ایسی تھی جیسے کوئی جلتے ہوئے جنگل سے بھاگ رہا ہو، جہاں ایک عہد کے ساتھ ایک نسل کے خواب و ارمان خس و خاشاک ہو رہے ہیں۔ میرے دل میں وہ خوشی نہ تھی جو وطن لوٹتے ہوئے ہوتی ہے، بلکہ وہ خلش تھی جو وطن کو لٹتے ہوئے دیکھ کر ہوتی ہے۔ جس مسلک کی پرورش نوعمری سے میری روح نے کی تھی، وہ نیم مُردہ ہو چکا تھا کیونکہ حقیقت اور اصلیت کے ازلی تضاد کو یہ سادہ مزاج کسی طرح قبول نہیں کرتا تھا۔

تاریخ کا ایک نیا دور شروع ہو چکا تھا اور میری کتابِ زندگی کا ایک باب ختم ہو چکا تھا۔ بمبئی سے یورپ جاتے وقت مجھ میں کتنی امنگ تھی، کتنا حوصلہ تھا۔ لیکن اب جو بمبئی کا ساحل نظر آیا تو دل ڈوب گیا اور محسوس ہوا کہ ایک نیا سفر درپیش ہے جس کی منزل کا پتا نہیں۔

یورپ سے واپسی کے بعد

(۶)

جب میں مارچ ۱۹۴۰ء میں ہندوستان لوٹا تو وہاں کی زندگی جنگِ عظیم سے متاثر ہو چکی تھی۔ اس کا نزلہ سیاست پر یوں گرا کہ کانگریس نے یہ کہہ کر صوبائی وزارتوں سے استعفیٰ دے دیا کہ فاشسزم کی مخالفت کے باوجود وہ مرکزی حکومت میں فیصلہ کن شرکت کے بغیر برطانیہ سے تعاون نہیں کر سکتی۔ ان وزارتوں نے تین سال کی مدت میں مسلم رائے عامّہ کو ایسا برافروختہ کر دیا تھا کہ وہ مسلم لیگ کی حلقہ بگوش ہو گئی تھی اور ان وزارتوں سے گلو خلاصی کے موقع پر لیگ نے دعائے نجات مانگی تھی۔ اب بات اکثریت اور اقلیت کی حد سے گزر کر قومیت تک پہنچ گئی تھی۔ چنانچہ ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو لاہور میں مسلم لیگ نے دو قومی نظریے کی بنیاد پر وہ تاریخ ساز قرارداد منظور کر لی جو چند سال میں پاکستان کو وجود میں لے آئی۔

مجھے وہ دن یاد آیا جب سب سے پہلے میں نے پاکستان کا نام سنا تھا۔ یہ ۱۹۲۹ء کا واقعہ ہے۔ میں کلکتہ کے ہندی روزنامہ "وشوامتر" میں کام کرتا تھا۔ اخبار کے ایڈیٹر پنڈت ماتا سیوک پاٹھک نے غیر ملکی ڈاک کے بنڈل سے ایک کتابچہ برآمد کیا اور اس

کی ورق گردانی کرتے کرتے ان کی شہ رگ پھولی، مونچھوں کے بال اینٹھے اور میری طرف گھور کر موٹی آواز میں پوچھا۔

"آپ نے پاکستان کا نام کبھی سنا ہے؟"

میں نے حافظہ میں کرۂ ارض کو گھمایا، لیکن پاکستان کا نشان نہ پایا۔ جب لاعلمی کا اظہار کیا تو پنڈت پاٹھک نے چودھری رحمت علی کا پمفلٹ میری طرف بڑھایا۔ دیکھنے کو تو اسے دیکھ گیا لیکن نام کے سوا اس کا کوئی نکتہ ذہن نشین نہ ہوا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کی سماجی علیحدگی ایک مسلّمہ حقیقت تھی اور ذات پات کے تعصّبات نے اس دیوار کو سدِّ سکندر بنا دیا تھا۔ لیکن مذہب کی بنا پر ملک کی سیاسی تقسیم کا خیال اس وقت بالکل نیا تھا۔ شاید لالہ لاجپت رائے پہلے قابلِ ذکر سیاسی لیڈر تھے جنھوں نے چند سال پہلے یہ بات کہی تھی۔ اُس وقت وہ کانگریس سے نکل کر ہندو مہا سبھا کے داعی اور بھائی پرمانند جیسے کٹّر آریہ سماجی کے ہم نوا تھے، لہٰذا ان کی لن ترانی کسی نے نہ سُنی۔ مگر جب ۱۹۳۰ء میں علّامہ اقبال نے الہ آباد میں مسلم لیگ کے پلیٹ فارم پر مسلم اکثریتی علاقوں میں آزاد مملکت کی صدا بلند کی، تو یہ مطالبہ تحریک کی شکل اختیار کر گیا۔ مسلم سیاست جو شتر بے مہار کی طرح کبھی خلافت اور کبھی ہجرت کی طرف چل پڑی تھی، اب ایک معیّن مقصد کی طرف متوجہ ہو گئی۔

پاکستان کے تصوّر کو مغرب سے متعارف کرنے کا سہرا خالدہ ادیب خانم کے سر بندھا۔ ان کی انگریزی کتاب INSIDE INDIA کا نام پہلے آ چکا ہے جس کا اردو ترجمہ جامعہ ملّیہ دہلی نے "اندرونِ ہند" کے عنوان سے شایع کیا تھا۔ جب ۱۹۳۸ء میں کتاب کا نیا ایڈیشن لندن میں چھپنے لگا تو اس کی پریس کاپی خانم نے مجھے پڑھنے کے لیے دی۔ مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ اس کا ایک باب چودھری رحمت علی کے منصوبے اور پاکستان کے بیان کے لیے وقف تھا۔ میرے سوال پر خالدہ ادیب خانم نے جو کچھ کہا، وہ ذہن پر نقش رہ گیا۔

"ہندوستان کی سب سے بڑی سیاسی حقیقت اشتراکیت نہیں قومیت ہے اور اس کا خمیر کسی وحدت سے نہیں بنا ہے، بلکہ یہ ہندو مسلم تہذیبوں کی کشمکش کی مظہر ہے۔ اگر ہندوستانی مسلمان اس انجام سے بچنا چاہتے ہیں جو سات سو

سال کی حکومت کے بعد اسپین میں عربوں کا یا چار پانچ سو سال کی حکومت کے بعد بلقان میں ترکوں کا ہوا، تو آزاد مملکت کی تشکیل کے سوا ان کے پاس کوئی چارۂ کار نہیں۔"

اس موقع پر میں نے ان سے پوچھا۔

"کیا مذہب پر قومیت کی تعمیر ہو سکتی ہے؟"

خانم نے دو ٹوک جواب دیا۔ کوئی ضروری نہیں کہ فقط رنگ، نسل اور زبان کی وحدت پر قومیت کا قیام ہو۔ ان سے جو نفرت اور عداوت انسانوں میں پیدا ہوتی ہے، کیا وہ مذہبیت کی انسانی اور اخلاقی قدروں سے بہتر ہے؟

یہ مکالمہ مجھے یاد تھا اور تاریخ کے جس تجربے کی یہ صدائے بازگشت تھی، اس کا بھی مجھے احساس تھا۔ لیکن ملک کی تقسیم کا تصور میرے لیے اُس وقت دُور از قیاس تھا۔ ہندو مسلم نفاق کی بڑھتی ہوئی خلیج کے مابین رواداری اور بے تعصبی کے چھوٹے سے جزیرے میں منھ ڈھانک کر میں لیٹ گیا۔

درمیان قعرِ دریا تختہ بندم کردۂ
باز می گوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش

بقول انجیل مقدس، خدا کو آدم کی گندم پسندی اتنی ناگوار گزری کہ اسے زمین پر پھینک کر حکم دیا کہ آیندہ تجھے اور تیری نسل کو گاڑھے پسینے کی روٹی کھانا ہوگا۔ اس پر مستزاد کارل مارکس کا یہ ارشاد "جو کام نہیں کرے گا، اُسے روٹی نہیں ملے گی۔" کام کے زُمرے میں اس زمانے میں علمی یا ادبی کام کا شمار نہیں ہوتا تھا، ان معنوں میں کہ یہ ذریعۂ معاش نہیں تھا۔ اردو میں نشر و اشاعت کے ادارے اب سے بہتر تھے۔ اس لحاظ سے کہ کتاب چھاپتے وقت مُصنّف سے رقم طلب نہیں کرتے تھے۔ تاہم اقبال اپنی کتابیں خود چھاپتے تھے اور پریم چند نے مجھ سے کہا کہ ان کی ماہانہ اوسط آمدنی کبھی دو سو روپے سے زیادہ نہیں ہوئی اور یہ بھی ہندی کا طفیل تھا۔ غرض اردو میں تصنیف و تالیف سے اس "خشک شہرت" کے علاوہ اور کچھ نہیں مل سکتا تھا، جس کا ذکر غالب نے ترش روئی سے کیا تھا۔

تین مہینے تک میں اسی ادھیڑ بن میں رہا کہ کیا کروں، کیا نہ کروں۔ اس وقت اہلِ قلم کی دست گیری فلم اور ریڈیو کے سوا کوئی نہ کرتا تھا، اور ان دونوں نے میری قدر دانی میں دریغ نہیں کیا۔ بمبئی ٹاکیز کو فلم کمپنیوں میں بڑا اعزاز حاصل تھا کیونکہ اس کی باگ ڈور ہمانسو رائے جیسے صاحبِ نظر ہدایت کار اور دیوکا رانی جیسی اداکارہ کے ہاتھ میں تھی۔ اسے ایک ایسے مکالمہ نگار اور افسانہ نویس کی ضرورت تھی جو بیک وقت ہندی اور اردو پر قادر ہو اور یورپ کا تعلیم یافتہ ہو۔ دیوکا رانی کو جیسے ہی میری وطن واپسی کی خبر ملی، مجھے اس اسامی کی پیش کش کی۔ لیکن فلمی ماحول سے مجھے دلچسپی نہ تھی، لہٰذا تنگ دستی کے باوجود اسے قبول نہیں کیا۔

پروفیسر احمد شاہ بخاری آل انڈیا ریڈیو کے ڈپٹی کنٹرولر (بعد ازاں ڈائرکٹر جنرل) نے سمجھایا کہ فی الحال ریڈیو کو غنیمت سمجھو کہ یہاں پڑھے لکھوں کا اجتماع ہے، سرکاری دفتروں کی پابندی نہیں ہے اور فاشسزم کے خلاف جو چاہو کہو۔ البتہ انگریز کو اچھا نہیں تو برا بھی نہ کہو۔ سول لائن کی علی پور روڈ کے دو کرائے کے بنگلوں میں ریڈیو کے دفتر اور اسٹوڈیو تھے۔ ایک میں دہلی اسٹیشن تھا جس میں ن۔م۔ راشد، کرشن چندر، سعادت حسن منٹو وغیرہ کارپرداز تھے۔ دوسرے میں نیوز ڈپارٹمنٹ ابھی ظہور میں آیا تھا۔ اس کا مدیر ایک انگریز صحافی تھا جس کے تین معاون تھے، اور چوتھی جگہ پر میرا تقرر ہوا۔ مختلف ہندوستانی اور غیر ملکی زبانوں کے مترجم اور اناؤنسر صبح سے رات تک جنگ ناموں کی ترتیب و اعلان میں مشغول تھے۔ میرا کام انگریزی میں خبروں کے بلیٹن کی تدوین اور ہندوستان میں خبروں پر تبصرے کے علاوہ اس لغت کمیٹی کی صدارت بھی تھی، جو انگریزی اصطلاحوں کے آسان مترادف وضع کرتی تھی۔ اس کمیٹی کے اردو رکن چراغ حسن حسرت اور ہندی رکن دانسا ین تھے جو کبھی دہلی سازش کیس میں ماخوذ ہو چکے تھے اور اب ایم۔ این۔ رائے کے رفیق تھے۔ رہنے کے لیے مجھے دفتر کے پاس ہی ایک مکان مل گیا جس کے پہلو میں قدسیہ باغ اور پشت میں جمنا ندی تھی۔ اس قرب و جوار میں میری تھکی ہوئی روح کو کچھ سکون ملا اور چند روشن ضمیر ہم نشینوں کی صحبت میں ڈھائی سال گزر گئے۔

آزاد نظم اور ن۔ م راشد

راشد سے میرا تعلق دہلی سے شروع ہو کر تہران تک باقی رہا۔ دو سال بعد ریڈیو سے ہم سب کا دل اس طرح اُچاٹ کر کرشن چندر، منٹو وغیرہ کو فلم کی کشش بمبئی لے گئی۔ راشد اور حسرت فوج میں کپتان بن گئے اور میں نے ایم۔اے۔او کالج امرتسر کی راہ لی۔ راشد سے تعلق کی تجدید طویل مدت کے بعد ۱۹۵۹ء میں کراچی میں ہوئی جب وہ اقوام متحدہ کے دفتر اطلاعات کے نائب ڈائرکٹر (اور بعد میں ڈائرکٹر) تعینات ہوئے اور میں پیرس سے یونیسکو کے علاقائی دفتر کا ڈائرکٹر مقرر ہو کر آیا۔ پھر جب میں ۱۹۶۷ء میں ایران میں یونیسکو کا ناظم الامور تھا، تو وہ اقوام متحدہ کے دفتر اطلاعات کے نگراں رہے اور تقریباً چار سال یہ ساتھ رہا۔ فکر و مزاج کے اختلاف کے باوجود ہم میں باہمی احترام کا جو رشتہ تھا اس میں کبھی فرق نہ آیا۔ اُن کی زندگی کے آخری دور کے کئی پہلو میری نظر میں ہیں۔ لیکن ان سے ہٹ کر یہاں صرف اس تاثر کا اظہار کروں گا جو ان کی شاعری کے مطالعے سے حاصل ہوا۔

گزشتہ صدی کے اواخر میں جب مغربی شاعری میں آزاد نظم کا اسلوب مقبول ہوا، تو مشرق میں اس کا اثر سب سے پہلے بنگالی نے قبول کیا، اور وہ بھی ٹیگور جیسے قادر الکلام کے وسیلے سے جو زبان کی موسیقی کا ماہر تھا۔ یہ تحریک کلاسیکیت اور رومانیت سے ردِّ عمل کے طور پر اثریت اور اشاریت کے جلو میں آئی تھی۔ اور اس کا منتہا محض ردیف و قافیہ کی پابندی سے لفظ و معنی کی رہائی نہیں بلکہ لفظ و معنی میں نئے رشتوں کی تلاش تھی۔ جب بنگالی میں یہ روایت عام ہو گئی تو پہلی جنگِ عظیم کے بعد ہندی میں اس کا تجربہ شروع ہوا اور سالہا سال کی مزاحمت کے بعد اس کے قدم جمے۔

ہر فنی اور ادبی اسلوب کسی نہ کسی وقت اپنے امکانات کے عروج کو پہنچ کر مائل بہ زوال ہو جاتا ہے۔ جب غالب کو اس امر کا احساس ہوا تو اس نے تنگ نائے غزل کا شکوہ کیا۔ اس موقع پر داغ کی غزل سرائی نے وہی کام کیا جو ہماری موسیقی میں ٹھمری کی ایجاد نے کیا تھا۔ بڑے گائک ٹھمری کو قابلِ توجہ نہیں گردانتے۔ کیونکہ اگر اسے "بتلا" کر نہ گایا جائے تو

گانے کا لطف آدھا رہ جاتا ہے۔ یہی حال داغ کی غزل کا ہے۔ یہ غمزہ و عشوہ و ادا کی شاعری ہے جسے موٹی آواز میں نہیں سنانا چاہیئے۔

داغ کو جب اقبال نے "جہان آباد کا آخری شاعر" کہا تو مدّعا یہ تھا کہ وہ آخری بڑا غزل گو تھا۔ لیکن اسی موقع پر غزل کی نشاۃ ثانیہ کا وہ دور شروع ہوا جسے نو کلاسیکی NEO - CLASSIC کہنا چاہیئے۔ حسرت موہانی کو اس تحریک کا امام کہا گیا ہے۔ حالانکہ انصاف یہ مرتبہ شاد عظیم آباد کو دے گا۔ وہ عمر میں حسرت سے کہیں بڑے تھے اور وہ جس قافلے کے پیش رو تھے، اس میں بڑے بڑے سخن ور شامل ہوئے۔ پچھلی جنگ عظیم تک یہ کارواں بھی نڈھال ہو گیا اور بحیثیت صنفِ غزل جو انحطاط فارسی میں پہلے ہی ہو چکا تھا، اب اردو میں رونما ہوا۔

قافیہ بند نظم کے امکانات کو اقبال جیسے باکمال استاد نے وہ عروج بخشا کہ اس میں کسی اضافے کی گنجایش نہ رہی۔ اردو غزل کی توانائی ڈھائی سو سال باقی رہی، لیکن مقفیٰ نظم پر آدھی صدی میں خزاں آگئی۔

اسی زمانے میں (۱۹۳۰ء - ۱۹۳۵ء) کے لگ بھگ آزاد نظم کا تجربہ شروع ہوا۔ اور چالیس سال کے دوران اردو شاعری میں اس نے جو ہمہ جہت اضافہ کیا ہے، اس میں راشد کا سب سے بڑا حصّہ ہے۔ ۱۹۴۱ء میں اپنے پہلے مجموعہ "ماورا" کا نسخہ مجھے دے کر انھوں نے تذبذب کے انداز میں کہا "اسے اس نظر سے دیکھیں کہ یہ ایک تجربے کی ابتدا ہے، انتہا نہیں"۔ مجموعہ کا آدھا حصّہ اختر شیرانی کے رنگ کا غماز تھا، لیکن آگے ایک نئی آواز سنائی دی، جس میں ابہام کے باوجود دل فریبی تھی اور نامعلوم سمتوں میں گونجنے کی صلاحیت تھی۔ ان کا فن ترقی کرتے کرتے "لا - انسان" کی منزل پر پہنچا، جس کا نسخہ راشد نے تہران میں ۱۹۶۱ء میں دیا۔ یہ مجموعہ ان کا شاہکار ہے۔ ان کے مقدمے کو تنقیدی نثر کا عمدہ نمونہ کہا جائے گا اور اس کی بعض طویل اور مختصر نظموں کو اردو شاعری ہمیشہ یاد رکھے گی۔

یہ مشاعروں اور محفلوں کی شاعری نہیں ہے۔ اور اسی وجہ سے قبولِ عام سے محروم رہی۔ اس میں وہ مضمون بھی کم ہیں جو جسم و جاں کو دن کے اُجالے میں معرکۂ کارزار میں پیش

آتے ہیں۔ اس میں وہ رمز اور اشارے ہیں جو شبِ زندگی کی تاریکی یا چاندنی میں تحت الشعور بیان کرتا ہے۔ یہ سرگوشی الفاظ میں نئے معنی پیدا کرتی ہے اور اس کا حُسن زبان کو نیا آہنگ عطا کرتا ہے۔ شاعری کی یہ صنف مشکل ہے اور اگر راشد نے اس میں کمال حاصل کیا تو یہ ان کے ریاض کا اعجاز تھا۔ اسلامی اور مغربی شاعری کا انھوں نے غائر مطالعہ کیا تھا اور آخر وقت تک ان میں تلاش و تجسّس کی صلاحیت باقی تھی۔ وہ طبعاً شدّت پسند تھے۔ جب مذہب کا غلو ہوا تو خاکسار بن گئے اور کعبہ سے پلٹے تو الحاد کے علم بردار بن گئے، لیکن صحیح معنوں میں وہ انسانیت اور انفرادیت کے معتقد تھے۔ ان کے کلام میں اگر مردُم بیزاری کا رنگ جھلکتا ہے تو اس کی وجہ عہدِ حاضر میں انسانی قدروں کی تباہی اور فرد کی زبوں حالی ہے۔ ان کے لہجے کی تلخی کو تباہ حال انسانیت کا نوحہ سمجھنا چاہیے۔

سعادت حسن منٹو

منٹو میرے بھائی کے خاص دوست تھے، اور اسی وجہ سے ہم عمری کے باوجود، وہ مجھ سے ایک قسم کا محبّت آمیز تکلّف برتتے تھے۔ ادبی حلقوں میں ان کا نام سب سے پہلے ۱۹۳۵ء میں رسالہ "ہمایوں" کے "روسی ادب نمبر" کے مدیر کی حیثیت سے سنا گیا۔ رسالہ اردو میں جب میں نے اس پر سخت سا ریویو لکھا تو منٹو سے زیادہ شمیم صاحب کو ملال ہوا۔ دو سال بعد یورپ جاتے ہوئے جب بمبئی میں سنا کہ منٹو مصوّر اخبار میں کام کر رہے ہیں، تو میں اُن سے خود جا کر ملا۔ لیکن ان سے دلی تعلق اس وقت پیدا ہوا جب پیرس میں کسی اخبار کے لیے مضمون لکھتے وقت مجھے ہندوستان سے کچھ مطبوعہ مواد کی فوری ضرورت پیش آئی۔ میں نے منٹو کو لکھا، تو انھوں نے بلا تاخیر وہ کاغذات ارسال کر دیے۔ مجھے معاوضے میں سَو پونڈ ملے تو میں نے بلا طلب پندرہ پونڈ منٹو کی نذر کیے۔ اس اقدام کو انھوں نے کبھی فراموش نہیں کیا اور ان کے دل میں میری جگہ ہمیشہ محفوظ رہی۔

جب وہ بمبئی سے آ کر دہلی ریڈیو اسٹیشن سے وابستہ ہو گئے، تو اُن سے ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ وہ بلا کے صاف گو تھے اور زبان و قلم میں زیادہ فاصلہ نہ رکھتے تھے۔ طبیعت

ایسی رواں تھی کہ ایک نشست میں افسانہ یا ریڈیو ڈرامہ لکھ ڈالتے تھے۔ پریم چند کی طرح وہ بھی سیدھی بات کو سیدھے سادے انداز میں لکھنے کے قائل تھے، اور اسلوب کی نزاکتوں پر وقت ضائع نہیں کرتے تھے۔ مختصر افسانہ کے استادوں میں وہ صرف سمرسیٹ ماہم کے گرویدہ تھے۔ متوسط طبقے کے اندرونِ خانہ سے انھیں خاصی دلچسپی تھی اور اس کی ریاکاری کو اس طرح بے نقاب کیا کہ فحش نگاری کی تہمت بے جا میں ماخوذ ہوئے۔

جدید اردو ادب کی تعمیر میں ترقی پسند تحریک کے علاوہ اُن رجحانوں کو بھی دخل ہے جن کے نقیب راشد اور منٹو تھے۔ انھوں نے معاشرے کے ظاہری تضاد کو نہیں، فرد کی داخلی کشمکش کو اپنے فن کا موضوع بنایا اور منافقت کے بہروپ کا پردہ چاک کیا۔

ایک بار رات گئے حسرت اور منٹو کے ساتھ میں جامع مسجد کی طرف چلا تو سامنے کے میدان میں کسی گشتی تھیٹریکل کمپنی کا ڈیرا نظر آیا جو "لیلیٰ مجنوں" کا تماشہ اسٹیج کر رہی تھی۔ حسرت نے کہا "بہت دنوں سے یہ تماشہ نہیں دیکھا، چلیں دیکھیں کیا واردات گزرتی ہے" میں نے جتنا منع کیا، وہ اتنے ہی مُصر ہوئے اور منٹو نے یہ کہہ کر لاجواب کر دیا "اگر یہ باور کر لیں کہ فن کی داد نہیں بلکہ دو گھڑی ہنسنے کا موقع مل جائے گا تو مایوسی نہیں ہوگی" اور ہوا بھی یہی۔ صحرا میں اونٹ کی نکیل تھامے مجنوں جا رہا تھا کہ محمل سے مُنھ نکال کر لیلیٰ نے ڈرامائی انداز میں کہا۔ پیارے مجنوں مجھے بھوک لگی ہے۔ مجنوں نے جواب دیا لیلیٰ یہاں کھانا نہیں مل سکتا۔ لیکن لیلیٰ نے اصرار کیا۔ بھوک بدستور باقی ہے۔ مجنوں بولا۔ دل و جگر حاضر ہیں۔ اب ثابت ہوا کہ عورت دراصل مردم خور ہوتی ہے، کیونکہ لیلیٰ نے یہ پیش کش قبول کر لی۔ اور پھر کہا۔ پیارے مجنوں مجھے پیاس لگی ہے۔ بیچارے مجنوں نے فصد کھول کر اپنا خون نکالا، جس کا پیالہ لیلیٰ پی گئی۔ پھر دونوں نے مل کر گایا ؏

فراقِ جاناں میں ہم نے ساقی لہو پیا ہے شراب کر کے

پبلک پر رقّت کا عالم طاری تھا، اور ہم لوگوں کا ہنسی کے مارے بُرا حال تھا۔ لوگوں نے ہم پر ایسے آوازے کسے کہ اگر خود نہ اٹھ آتے تو ضرور نکال دیے جاتے۔

کئی سال پہلے ایسا ہی ایک تلاق کلکتہ میں ہوا تھا۔ وہاں کے مشہور میڈن تھیٹر

میں "پریم لتا" نامی تماشہ ہو رہا تھا۔ کچھ دوست وہاں کھینچ لے گئے۔ عاشق ناکام نے الوداعی نغمہ سُنا کر سینے میں خنجر گھونپا اور زمین پر گر پڑا۔ پبلک کو گانا اتنا پسند آیا کہ "ونس مور" کا نعرہ بلند ہوا۔ "ونس مور" کا بونس ایکٹر کو سو روپیہ ملتا تھا۔ وہ کس طرح اس حق سے دستبردار ہو جاتا۔ چنانچہ اس کے مُردہ جسم میں جان پڑ گئی۔ اٹھ کر اُس نے دوبارہ وہی گانا سنایا اور از سرِ نو خودکشی کر کے ڈھیر ہو گیا۔

یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ ایسے واقعات اُسی زمانے میں ہوتے تھے۔ پاکستانی فلموں میں وہ روایت باقی ہے اور پبلک کے ذوق میں بھی کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔

ہندوستان میں بورژوا طبقے کا عروج

۱۹۴۰ء کا موسم بہار مغربی یورپ کے لیے ایسا پُرآشوب ثابت ہوا کہ چند ہفتوں کے اندر برق رفتار جرمن فوجوں نے فرانس اور اس کے اتحادیوں کو شکست فاش دے کر پیرس کے قلب میں اپنے جھنڈے گاڑ دیے۔ برطانوی فوجیں میدان چھوڑ کر "ڈنکرک" کی راہ گھر بھاگ گئیں اور وہاں فصیل بند ہو گئیں۔ یہ واقعہ ہے کہ اگر ہٹلر کو برطانیہ سے معاہدے کی خوش فہمی نہ ہوتی اور وہ فیصلہ کُن جارحیت سے کام لیتا تو ان بھگوڑوں کا نام و نشان نہ رہتا۔ اس غلطی کا خمیازہ اسے بھگتنا پڑا، کیونکہ بے سر و سامانی کے باوجود انگریز نے ہتھیار نہ ڈالے اور سال بھر تنہا سینہ سپر رہا حتیٰ کہ روس پر ہٹلر کے حملے نے جنگ کا نقشہ بدل دیا۔ تاریخ کے عوامل بڑے پیچیدہ ہوتے ہیں، اور ان کی تفسیر ویسی آسان نہیں، جیسی بیان کی جاتی ہے۔ جب اسٹالن سے پوچھا گیا کہ تاریخ کی فیصلہ کن قوت کیا ہے؟ تو اس نے جواب دیا۔ "انسان کی قوتِ ارادی"

بہر صورت برطانوی سامراج کو دن میں تارے نظر آنے لگے اور ہندوستان نے اتنے وسیع پیمانے پر لام بندی اور جنگ کی تیاری شروع کی کہ جس کی مثال نہیں ملتی۔

پڑھے لکھے بے روزگاروں کا مسئلہ یوں حل ہوا کہ سیکڑوں نئے دفتر کھُل گئے اور یہ ان میں سما گئے یا فوجی افسر بن گئے۔ بھرتی کھڑے گھاٹ ہوتی تھی۔ چھوٹے بڑے بے شمار کارخانے چالو ہو گئے جو ہر قسم کا سامان بنانے لگے، جن میں سے کچھ باہر محاذِ جنگ کے لیے اور کچھ اپنی

ضرورت کے لیے تھا۔ ٹھیکہ داروں، دلالوں اور بقالوں کی بن آئی۔ کروڑوں روپے کا سامان منہ مانگے داموں، سرکاری اہل کاروں کے جنبشِ قلم سے ادھر اُدھر ہونے لگا۔ سرمایہ کاری کاغذی نوٹوں سے ہونے لگی اور افراطِ زر کے ساتھ گرانی نے گل کھلائے۔ وہ متوسط طبقہ جو اب تک شرافت اور قناعت کا مدّعی تھا، اس بہتی گنگا میں اخلاق کا لبادہ اُتار کر کود پڑا۔ اس کے بعد موقع پرستی کے سوا کوئی مسلک نہیں رہا۔ پُرانے معاشرے میں بھائی چارہ اور مروّت کے لیے جگہ تھی۔ لیکن اب مارکس کے قول کی صداقت ثابت ہوئی کہ سرمایہ داری نظام میں انسانی رشتہ، رشتۂ زر میں بدل جاتا ہے۔ چند سال کی مدّت میں ایسی کایا پلٹ ہوئی کہ روحانی، انسانی اور اخلاقی قدروں کا نام ہی نام رہ گیا اور جب جنگ ختم ہوئی تو اسی طبقے کا ملکی کاروبار اور نظم و نسق میں عمل دخل ہو گیا۔ اس کے کرتوت کا خمیازہ بیشتر تو آزاد دنیا بھگت رہی ہے۔ اس زر پرستی کو فروغ اس امریکی نظریے سے بھی ہوا کہ ترقی کی شاہراہ CONSUMER SOCIETY (بیٹو سماج) کی تشکیل ہے۔

اِسی موقع پر مجھے ادب کی بے اثری کا گہرا احساس ہوا۔ مجموعی طور پر ادیبوں نے بیدار مغزی اور جرأت کا ثبوت دیا۔ انھوں نے سامراج، فاشسزم اور منافقت کے خلاف دفتر کے دفتر سیاہ کر دیے۔ لیکن ان کے بیش تر پڑھنے والے اسی طبقے کے افراد تھے۔ اسی زمانے میں حکومت اور سیٹھوں کے مقبوضہ پریس، سرکاری ریڈیو اور فلمی تجارت کے شور و غوغا — ابلاغ کی مبالغہ آرائی کا مظاہرہ شروع ہوا۔ جس کے مقابلے میں ادبی تحریر کا دائرۂ اثر محدود ہے۔

ہندوستان کی سیاست میں کچھ وقت ایسی خاموشی رہی جیسی طوفان کی آمد سے پہلے فضا پر طاری ہو جاتی ہے۔ ملک کی دونوں بڑی سیاسی جماعتیں، کانگریس اور مسلم لیگ، الگ کھڑی دیکھ رہی تھیں کہ انگریز ان کے مطالبوں کو کس حد تک اور کب تسلیم کرتا ہے۔ سبھاش چندر بوس کلکتہ سے بھاگ کر جرمنی پہنچے اور آزاد ہند حکومت کے نام سے انھوں نے جو تحریک شروع کی اس نے برطانوی ہند کی سیاست کا رُخ بدل دیا۔ جون ۱۹۴۱ء میں جرمنوں نے روس پر حملہ کیا اور چند مہینوں میں اس کے بہت بڑے علاقے پر قبضہ کر کے لینن گراڈ اور ماسکو

کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ اسی سال کے آخر میں جاپان نے امریکہ کے بحریہ کو تباہ کر کے جنوب مشرقی ایشیا کے تمام یورپی مقبوضات کو زیر کر لیا۔ تو اگلے سال اُن کی فتح یقینی نظر آنے لگی۔ جب سبھاش چندر بوس کی آزاد ہند فوج نے رنگون میں بہادر شاہ ظفر کے مزار پر "دلّی چلو" کا نعرہ لگایا تو ملک میں جوش کی لہر دوڑ گئی۔

گاندھی جی نے چند سال قبل سبھاش چندر بوس کو کانگریس سے نکال پھینکا تھا۔ اب وہ خود اس کی پامردی سے ایسے مجبور ہوئے کہ انگریز کے خلاف "ہندوستان چھوڑو" کی تحریک شروع کرنے پر مجبور ہو گئے۔ کہنے کو تو انگریز نے اسے کچل دیا۔ لیکن اس کے دوررس اثرات ہوئے۔ کانگریس کی ہوسِ حکمرانی بڑھ گئی۔ ہندوستانی فوجیوں میں بغاوت کا جذبہ اُبھر پڑا۔ حکومت کا رُعب اٹھ گیا۔ دن رات خون خرابے کی خبریں سنتے سنتے عوام کے دل سے امن اور انسانیت کا احترام اُٹھ گیا۔ خواص کے دل سے تو خوفِ خدا ہی اُٹھ چکا تھا۔

فرقہ بندی ہر مسلک کا لازمہ ہے۔ چنانچہ مغرب کی طرح ہندوستان میں بھی اشتراکی خیال کے لوگ اپنے اختلاف کا اظہار مذہبی لُغت میں کرنے لگے تھے اور تکفیر و فتویٰ بازی میں سرگرم تھے۔ کمیونسٹوں کے لیے جنگ کا پہلا مرحلہ فاشسٹ دشمن نہیں بلکہ سامراجی تھا۔ مگر ایم۔ این۔ رائے کے حامی ان سے متفق نہ تھے اور کانگریس سوشلسٹ آزادیٔ ملک کو فوقیت دیتے تھے۔ دہشت پسندی کا دور ختم ہو چکا تھا، اور اس کے جاں باز یا تو عملی سیاست سے الگ ہو گئے تھے اور یا مختلف سیاسی گروہوں میں شامل ہو گئے تھے۔

ایک دن میں چاندنی چوک سے گزرا تو کپڑے کی دوکان پر پھول سنگھ کو فروکش پایا۔ کبھی ان کا تعلق دہشت پسندوں سے تھا۔ لیکن ۱۹۳۷ء میں دہلی کے مختصر قیام میں جب جمال الدین بخاری نے اس سے ملایا تو یہ اشتراکیت کا ہم نوا ہو چکا تھا۔ پھول سنگھ مدقوق ساجوان گویا آپ اپنے خلوص کی آگ میں جل رہا تھا۔ انسانیت کی راہ میں تن من دھن وار کر کچھ مدت بعد وہ اس دنیا سے چل بسا۔ اسے مجھ سے ایسا تعلق خاطر تھا کہ کبھی اس کی دوکان کی طرف جا نکلتا تھا۔ ایک دن پھول سنگھ نے کہا کہ میں اپنے چند دہشت پسند دوستوں کو راہ راست پر لانا چاہتا ہوں، لیکن ان کی ضد کے آگے میری منطق نہیں چلتی۔ میں نے کہا، بھائی،

میں کسی گروہ یا پارٹی سے سروکار نہیں رکھتا، مجھے اس جھمیلے میں نہ ڈالو۔ لیکن پھول سنگھ نے اصرار کیا کہ ان میں سے ایک آپ کا پرانا شناسا ہے اور ملاقات کا آرزومند ہے۔ غرض رات کی تاریکی میں ہم شہر سے باہر نامعلوم راستوں سے گزر کر کسی بستی کے پاس پہنچے۔ اور موٹر چھوڑ کر پیدل چلتے ہوئے ایک گھر کے پاس ٹھہر گئے۔ پھول سنگھ نے بند دروازے میں منہ لگا کر کچھ کہا اور جب دروازہ کھلا تو ہم ایک نیم تاریک کمرے میں داخل ہوئے جہاں دس بارہ آدمی جمع تھے، جو لالٹین کی روشنی میں ایک دوسرے کی شکل بھی مشکل سے پہچان سکتے تھے۔ ایسے موقعوں پر تعارف نہیں ہوتا تھا۔ چنانچہ نہ پھول سنگھ نے کسی سے مجھے ملایا اور نہ میرا نام لیا۔ البتہ ان میں سے ایک نے اُٹھ کر گرم جوشی سے میرا ہاتھ تھام لیا، اور میں نے پہچانا کہ یہ وہی کندن لال ہے جو کبھی کلکتہ میں اخبار کے دفتر میں میرے ساتھ کام کرتے کرتے یک بیک روپوش ہو گیا تھا۔ گھنٹوں میں دہشت پسندی کے خلاف دلائل دیتا رہا، اور وہ لوگ میری تردید کرتے رہے۔ بعد میں ان میں بعض لوگ ۱۹۴۲ء میں کانگریس کی تحریک میں سرگرمِ عمل ہو گئے اور کچھ نے تقسیم ہند کے زمانے میں راشٹریہ سیوک سنگھ کا جھنڈا اٹھایا۔ اس جماعت کا سرغنہ گولوالکر نازی جرمنی کا تربیت یافتہ تھا اور نازی عسکری جماعت "ایس، ایس" کے طرز پر اس نے "آر، ایس، ایس" کی تنظیم کی مسلم کشی میں یہ فاشسٹ جماعت پیش پیش رہی ہے۔

آل انڈیا ریڈیو میں جن لوگوں سے واسطہ پڑا ان میں سے ایک ایرانی کا واقعہ قابلِ ذکر ہے ——— جس سے مدتوں بعد تہران میں واسطہ پڑا اور خدا کرے وہ زندہ و سلامت ہو۔ مصلحتاً اس کا نام بدل کر میں نے آقائے تکریمی کر دیا ہے۔ جنگِ عظیم کی ابتدا کے وقت وہ امریکہ سے انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کر کے اپنے وطن لوٹا اور جبری فوجی خدمت انجام دینے کے لیے زاہدان میں قیام پذیر ہوا۔ ایک بار رضا خان کے استبداد کے خلاف احتجاج کی پاداش میں اسے سزائے قید ملی تو وہ بھاگ کر کوئٹہ کی طرف چل پڑا۔ جاسوسی کے شبہ میں انگریزوں نے اسے گرفتار کر کے دہلی بھیج دیا لیکن جب وہ بے قصور ثابت ہوا تو اسے آل انڈیا ریڈیو کے فارسی پروگرام سے منسلک ہونے کے لیے مجبور کیا گیا۔ اُسے سول لائن میں نظر بند کر دیا

گیا اور سال بھر تک وہ شہر میں داخل نہ ہو سکا۔ بالآخر میری کوشش سے یہ پابندی ختم ہوئی۔ آقائے تکریمی سے میرے تعلقات اتنے استوار ہوئے کہ عرصۂ دراز کے بعد تہران میں اس کی تجدید ہوئی جس کا ذکر آگے کہیں آئے گا۔

برِّصغیر کی سیاست کے ہر واقف کار کو ایم این رائے کا نام یاد ہوگا۔ ۱۸۹۰ء کے لگ بھگ یہ بنگال میں پیدا ہوئے اور اوّل جنگ عظیم سے پہلے وہاں کی خفیہ دہشت گرد تحریکوں سے وابستہ رہ کر امریکہ نکل گئے۔ دوران جنگ جرمنی میں آزادیٔ ہند کے لیے جو تنظیم قایم ہوئی امریکہ میں ایم۔ این رائے نے اس کا کام سنبھالا۔ انقلابِ روس کے بعد وہ ماسکو پہنچ گئے اور لینن، اسٹالن وغیرہ کا اعتماد اس حد تک حاصل کر لیا کہ ہندوستان اور دیگر ایشیائی ممالک کے امور میں سالہا سال ان کے مشیرِ خاص رہے۔ اسٹالن کے دورِ حکومت میں سب کے ساتھ ان کی قسمت بھی گردش میں آئی اور ۱۹۳۰ء میں جب یہ ہندوستان لوٹے تو کئی سال قیدِ فرنگ میں بتائے۔ رہائی کے بعد کمیونسٹ پارٹی سے ان کا کوئی تعلق نہ رہا اور بیشتر وقت تصنیف و تالیف میں گزارا۔ مجھے دہلی میں اُن سے ملنے کا بارہا اتفاق ہوا۔ میری رائے ہے کہ اشتراکیت کے مطالعے و مشاہدے میں برِّصغیر میں ایم این رائے کو اوّلیت حاصل ہے۔

امرت سر کا قیام

جون ۱۹۴۲ء میں میں ایسا بیمار پڑا کہ مرتے مرتے بچا۔ روبصحت ہوتے وقت اپنی ذات میں بنیادی تبدیلی کا احساس ہونے لگا۔ میرا ذہنی وطن فرانس پامال ہو چکا تھا۔ روس حیات و ممات کی کش مکش میں مبتلا تھا اور میرا جنم بھوم ہندوستان، تاریخ کے دوراہے پر شش و پنج کی حالت میں کھڑا ہوا تھا ؎

امید و بیم نے مارا مجھے دوراہے پر
کہاں کے دیر و حرم گھر کا راستہ نہ ملا

جب میں نے ملازمت سے استعفیٰ دیا تو سب کو تعجب ہوا۔ بچپن سے لوح و قلم کے سوا اور کسی چیز سے خاص دلچسپی نہ تھی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ ذریعۂ معاش نہیں، شوق کا شغل

ہے۔ ادبی ماہنامہ نکالنے کا ارادہ کیا اور حمیدہ کے نام سے "جہاں نما" کا ڈکلریشن حاصل کیا۔ کاغذ خرید کر مضامین جمع کرنے شروع کیے۔ لیکن جس بہی خواہ نے سُنا، یہی کہا۔ یہ بیل منڈھے نہیں چڑھنے کی۔ کاغذ اور قلم تفریحی دوست ہیں، ان پر زیادہ ذمہ داریاں نہ ڈالو، بہتر سرکاری ملازمتوں کے امکان نظر آئے، لیکن دل مائل نہ ہوا۔ قاضی عیسیٰ، جن سے سسرالی رشتہ داری تھی ڈان اخبار کے معاون ایڈیٹر کی پیش کش لائے جو ابھی پوتھن جوزف کی ادارت میں نکلا تھا۔ اتنے میں ایم۔اے۔او کالج امرت سر کی انتظامیہ نے وائس پرنسپل کی جگہ میں تقرر کیا، جس کے ساتھ تاریخ کی پروفیسری وابستہ تھی۔ اسے بوجوہ میں نے ترجیح دی۔ ایک تو پڑھنے لکھنے کی وافر فرصت ملنے کا یقین تھا۔ دوسرے اگست کے مہینے میں اسیرِ فرنگ ہوتے وقت پنڈت سندر لال اپنے رسالہ "دشودانی" کی اعزازی ادارت میرے سپرد کر گئے تھے۔ اس واقعے کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ میرا اخلاقی فرض تھا کہ ان کی غیر حاضری میں اس اعتماد کا احترام کروں اور یہ سرکاری ملازمت کے ساتھ ممکن نہ تھا۔ پہلے اس کالج کے پرنسپل ڈاکٹر تاثیر اور وائس پرنسپل محمود الظفر رہ چکے تھے۔ سال کے اواخر میں دہلی سے امرت سر چلا گیا۔

درس و تدریس کے بعد جو وقت بچ رہتا، وہ ادبی مشاغل کے لیے وقف ہوتا۔ "گورکی کی آپ بیتی" کی تینوں جلدوں کے ترجمے کا کام دہلی سے شروع ہو کر یہاں ختم ہوا۔ "ادب اور انقلاب" کی ترتیب اور اشاعت بھی اسی زمانے میں تکمیل میں آئی۔ کئی افسانے جو "زندگی کا میلہ" نامی مجموعے میں شامل ہوئے، یہیں قلم بند ہوئے۔ ہندی رسالہ "دشودانی" کی ایڈیٹنگ بھی باقاعدگی سے جاری رہی۔ لاہور اور امرت سر میں گھر آنگن کا واسطہ تھا، صرف ۳۵ میل کا فاصلہ تھا۔ مہینے میں ایک آدھ بار اُدھر جا نکلتا تھا۔ تجارتی شہر ہونے کے باوجود امرت سر کی زندگی میں دلچسپی کے کئی پہلو تھے۔ سول لائن میں میرے مکان کے عین مقابل ڈپٹی کمشنر پنڈرل مون کا بنگلہ تھا۔ ان سے اچھی خاصی ملاقات تھی۔ میری موجودگی میں سیاسی قیدیوں سے بدسلوکی کے خلاف بطور احتجاج انھوں نے استعفیٰ دیا اور STRANGERS IN INDIA نامی کتاب لکھی۔ یہ ان روشن ضمیر انگریزوں میں تھے جنھیں ہندوستانی عوام سے دلی ہمدردی تھی۔ چند فرلانگ دور ڈاکٹر سیف الدین کچلو کی قیام گاہ تھی۔ اُن سے بارہا ملنے کا موقع ملا، اور ہر بار ان کے خلوص و ایثار کا اثر دوبالا

ہوا جس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔

دونوں شہروں کے مابین پریت نگر نامی اقامتی درس گاہ تھی جسے کینیڈا سے لوٹے ہوئے سکھ دانشوروں نے کمیون کے انداز پر قایم کیا تھا۔ ان کے پیش رو سکھ انقلابیوں نے "کیرتی" کے نام سے جو اردو رسالہ نکالا تھا، وہ بند ہو چکا تھا۔ اور اب "پریت لڑی" کے نام سے اردو اور گرمکھی میں جو جریدہ شایع ہوتا تھا، وہ جدید تعلیمی اصولوں کا آئینہ دار تھا۔ ہندوستان میں یہ ادارہ اپنی مثال آپ تھا، اور اس سے مجھے خاص تعلق تھا۔ خود ایم۔ اے۔ او کالج میں لایق استادوں کا اجتماع تھا جن میں خادم محی الدین (ضیا محی الدین کے والد) کرامت حسین، صدیق کلیم، حمید نسیم اور رشید قابلِ ذکر ہیں۔ پروفیسر رشید سے دوستی کا جو رشتہ قایم ہوا اب تک باقی ہے۔ میرے شاگردوں میں سیف الدین سیفؔ اور عبدالمتین عارف نے شعر و ادب کی دنیا میں نام پیدا کیا۔

امرت سر کی مٹی نے جیسے پہلوان پیدا کئے، ان کا جواب سارے ملک میں نہ تھا۔ "رستمِ ہند" کا خطاب گاما اور ان کے خانوادہ کی میراث تھی۔ میرے خسر نے کبھی لکھنؤ کی نمایش میں انھیں مدعو کیا اور ایسی خاطر مدارات کی کہ وہ مجھے بھی ماننے لگے۔ اس کا مظاہرہ جس دلچسپ طریقے سے ہوا اس کا حال آگے آئے گا۔

شہر میں موسیقی کے ذوق کی کمی نہیں تھی اور ہولی کے موقع پر دور دور سے استادِ فن دینے جمع ہوتے تھے۔ مجھے وہ محفل یاد ہے جس میں سلامت علی اور نزاکت علی نے کم عمری کے باوجود اپنے گھرانے کی گائیکی کا ایسا سکہ بٹھایا کہ پنڈت اونکار ناتھ جیسے سنگیت کے گیانی نے اپنی شال ان کے کاندھوں پر ڈال دی۔ مغربی موسیقی کا شوق مجھے پہلے سے تھا۔ اب ہندوستانی موسیقی کی سوجھ بوجھ ہوئی۔ اس کن رس نے تلخابۂ حیات میں راحت کا کچھ سامان کیا۔

کوہ نوردی کا شوق

اسی زمانے میں فطرت سے مجھے وہ لگاؤ پیدا ہوا، جو سیاحت کے شوق سے بڑھ کر میرے جمالیاتی حس کی تسکین کا وسیلہ بن گیا۔ موسیقی کی محفلوں، قدرت کے مناظر اور تاریخ کی تماشا گاہوں

سے جو لطف حاصل ہوا وہ سرمایۂ حیات ہے۔ ابھی اس کوہِ ندا کا ذکر مقصود ہے جس نے مجھ پر سحر سامری کا سا اثر کیا۔

جولائی ۱۹۴۲ء میں دہلی میں جب بیماری اور ریڈیو کی ملازمت سے نجات ملی تو جی چاہا کہ تبدیلیٔ آب و ہوا کے لیے کسی پہاڑ کا رُخ کروں۔ ایسے میں چترال کے نواب ناصر الملک کا دعوت نامہ موصول ہوا۔ وہ خود فارسی کے شاعر اور علم و ادب کے شائق تھے اور اس نسبت سے انھیں مجھ سے غائبانہ تعارف تھا۔ اس زمانے میں چترال کے دور دراز اور دشوار گزار علاقے میں کون جاتا تھا لیکن نئی باتوں اور نئی جگہوں میں میرے لیے ایسی کشش ہے کہ بلا پس و پیش رختِ سفر باندھ لیا بلکہ اپنے نسبتی بھائی شوکت عمر کو بھی آمادہ کر لیا جو میری طرح مہم جو تھے ؎

نہ سُدھ بُدھ کی لی، اور نہ منگل کی لی
اُٹھا اور اُٹھ راہ جنگل کی لی

میں نے کہیں کافرستان کا حال پڑھا تھا، جس کا ایک حصّہ چترال میں شامل ہے۔ اور سُنا تھا کہ آسمان بوس برف پوش، ترچ میر کی چوبیس ہزار فیٹ چوٹی کا جیسا نظارہ چترال سے ہوتا ہے وہ اپنے جلال و جمال میں بے نظیر ہے۔ اس سفر کی یادگار میرا افسانہ "کافرستان کی شہزادی" ہے۔ مجھ سے پہلے کسی ادیب کا گزر ادھر نہ ہوا تھا۔

سوئٹزرلینڈ میں "ینگ فرو" (جوان عورت) کے حُسن نے میری خفتہ روح کو جگا دیا تھا۔ "ترچ میر" نے میرے کمزور جسم کو حوصلہ بخشا اور معصوم کافر خوش اداؤں نے بتلایا کہ سچا حسن وہی ہے، جو شہوت کو نہ اُکسائے جسے عرفِ عام میں عشق کہتے ہیں۔

کوہ نوردی اور دشوار گزاری کا یہ چسکا ۱۹۴۲ء اور ۱۹۴۳ء میں کشمیر کی وادیوں اور پہاڑیوں میں لے گیا۔ ۱۹۴۳ء میں ہم سری نگر اور سون مرگ سے آگے "زوجی لا" کے درّے تک چڑھ گئے، جہاں لداخ —— اور تبّت کی طرف راستے نکلتے ہیں۔ وہاں سے چل کر سولہ ہزار فیٹ اونچے "کولاہائی گلیشر" کے دامن میں خیمہ زن ہوئے لیکن راتوں رات برف کا ایسا طوفان آیا کہ اسے سر نہ کر سکے۔ تین ہفتے بعد رات کو جب سری نگر میں نواب جعفر علی خاں اثر کی کوٹھی پر وارد ہوئے تو حلیہ ایسا بگڑ گیا تھا کہ ان کے ملازموں کو ہمیں شناخت کرنے میں دشواری ہوئی۔ اثر لکھنوی

ریاست کشمیر میں وزارت کے عہدے پر فائز تھے اور آتے جاتے والوں کو اس اطمینان سے اپنا کلام سناتے تھے کہ دیر تک اردو شاعری سے دل اُچٹ جاتا تھا۔ ۱۹۴۴ء میں عزیز عمر (مرحوم) اور رشید کے ساتھ سری نگر اور پہل گام کی وادی سے پرے امرناتھ کے پہاڑ پہنچا، جہاں ہندو زائرین برف کے شولنگ کے درشن کے لیے جاتے ہیں۔ اور وہاں سے جب ہم نے سب کی تنبیہ کے باوجود ایک ٹوٹے ہوئے سلسلۂ کوہ کو پار کیا، تو جان بال بال بچی۔ دو بار سنگریزوں پر میں اس طرح پھسلا کہ ہزاروں فیٹ نیچے کھائی میں جاتے جاتے بچا۔

اس قسم کی سیر و سیاحت میں جو لطف آتا ہے اس کا اندازہ وہ لوگ نہیں کر سکتے جو ہوائی جہازوں اور موٹروں کی تن آسانی کے عادی ہیں۔ سفر کی اصل دلچسپی منزل پر پہنچ کر ختم ہو جاتی ہے، اس کا ماحصل رہ نوردی کے نشیب و فراز ہیں۔

دو ادبی معرکے

مارچ ۱۹۴۳ء میں مراد آباد میں سر رضا علی کی صدارت میں ادبی جلسہ اور مشاعرے کا اہتمام ہوا جس تعداد میں ادیب اور شاعر جمع ہوئے اور جس فراخ دلی سے ان کے اخراجات کی کفالت ہوئی، اس سے اندازہ ہوا کہ یہ حکومت کی جنگی مساعی کا کرشمہ ہے۔ ضیاء الاسلام (مرحوم) محکمۂ تعلقات عامہ کے ناظم کی حیثیت سے جلسے کے منتظم تھے۔ میں نے "جنگ اور ادب" کے عنوان سے جو مقالہ پڑھا، وہ "ادب اور انقلاب" میں شامل ہے۔ اس میں فاشسزم کے ساتھ سامراج سے قلمی جنگ کی تلقین کی گئی تھی اور شاید اس سے پہلے ہمارے یہاں کسی نے یہ پیش بینی نہ کی تھی کہ آیندہ خطرہ امریکہ کی اُبھرتی ہوئی بین الاقوامی سامراجیت سے ہے۔ جلسے میں ایسا سناٹا چھایا کہ کئی سرکاری عہدہ دار کرسیوں سے کھسک گئے۔

ہمارے کالج کے طلبہ نے رسم بنا رکھی تھی کہ سال میں ایک بار دھوم دھام سے مشاعرے کا انتظام کرتے تھے جس میں باہر کے نامی گرامی شاعر جمع ہوتے تھے۔ ۱۹۴۴ء کے وسط میں جب میری صدارت میں یہ سالانہ مشاعرہ ہوا تو خواہ مخواہ ہنگامے کی شکل پیدا ہو گئی۔ مجید لاہوری نے بنگال کے حالیہ قحط پر نظم پڑھی ؎

خدا سے کچھ نہ کہو ہاں، خدا سے کچھ نہ کہو

اس المیہ پر انگریزی کے مشہور شاعر ANTHONY LEWIS نے جو نوحہ لکھا تھا GOD CANWAIT مجید کی نظم اسی کی صدائے بازگشت تھی۔ اتنے میں کچھ لوگوں نے اعتراض کیا کہ اس نظم میں خدا کی شان میں گستاخی کی گئی ہے۔ میں نے کہا کہ اقبال سمیت بہت سے شاعروں نے خدا سے انسان کی بدحالی سے بے اعتنائی کا شکوہ کیا ہے اور اسے گستاخی سے تعبیر نہیں کرنا چاہیے۔ بہر صورت اگر انھیں سخن کا فہم نہیں، پند و وعظ سے دلچسپی ہے، تو محفل کو بدمزہ نہ کریں، تشریف لے جائیں۔ جب انھوں نے زیادہ شور مچایا، تو رضاکاروں نے انھیں باہر نکال دیا۔ پھر کیا تھا۔ شہر کے دقیانوس میرے پیچھے پڑ گئے، اخباروں اور پوسٹروں میں علماء نے کفر و الحاد کے فتوے چھاپے اور کالج کی انتظامیہ نے ایک محتاط قرارداد میں کالج کے اساتذہ کو نصیحت کی کہ وہ تقریر اور تحریر میں دل آزاری سے پرہیز کریں۔ میں نے اسے عدم اعتماد پر محمول کر کے استعفیٰ دے دیا، اور گو رشید کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہ تھا، لیکن دوست داری میں انھوں نے بھی ملازمت سے استعفیٰ داخل کر دیا۔ طلبہ نے ہماری تائید میں پُرجوش مظاہرہ کیا اور جب گاما پہلوان کو خبر ہوئی تو انھوں نے اپنے پٹھوں کو انتظامیہ کے ارکان کی مزاج پرسی پر مامور کیا۔ پھر تو ان کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ ہم دونوں سے استعفیٰ واپس لینے کی درخواست کریں۔

کہنے کو تو یہ ہنگامہ ختم ہو گیا، مگر امرت سر سے دل اُچٹ گیا۔ سال کے آخر میں جب پنڈت سندر لال نے جیل سے نکل کر اپنے رسالہ کی ذمہ داری سنبھال لی تو میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ ذاتی حالات ایسے نہ تھے کہ باقی زندگی کو تجربہ گاہ بناتا، بہر صورت یہ سمجھ میں آ گیا کہ تعلیمی مشاغل افتادِ طبع کے مطابق ہیں اور اب اس راستے سے نہیں ہٹنا چاہیے، البتہ امرت سر سے اوّلین فرصت میں کوچ کر دینا چاہیے۔

اگلے سال (۱۹۴۵ء) کے شروع میں گاندھی جی کو ہندی اردو کے قضیہ سے نپٹنے کا خیال آیا تو ہندوستانی لٹریچر بورڈ کی طرح ڈالی مگر میں نے اس کے معتمد کی جگہ قبول نہیں کی، اور بات وہیں کی وہیں رہ گئی۔

اسی وقت وہ موڑ آیا جس نے میری عملی زندگی کو مستقلاً تعلیم سے وابستہ کر دیا۔ برطانوی حکومتِ ہند کا نظریہ تھا کہ زراعت، صحت اور تعلیم کا سروکار صوبوں سے ہے، اور صلاح مشورہ کے علاوہ اسے براہِ راست ان سے تعلق نہیں رکھنا چاہیے۔ چنانچہ مرکز میں ان تین شعبوں کا ایک مشترکہ محکمہ تھا۔ شعبۂ تعلیم کے مشیر سر جان سارجنٹ تھے۔ نہ ان کے پاس اختیار تھا۔ نہ عملہ، نہ بجٹ، لیکن وہ بصیرت اور ذہانت سے مالا مال تھے۔ انھوں نے وہ مشہور، سارجنٹ رپورٹ تیار کی جو بعد از جنگ ہندوستان کی تعلیمی ترقی کے منصوبے پر مشتمل تھی۔ برِصغیر کی تعلیمی تاریخ میں اس رپورٹ کی حیثیت بنیادی ہے۔ جو کام آثارِ قدیمہ کے لیے، کننگھم اور مارشل نے یا لسانیات کے لیے گریرسن نے کیا، وہی سارجنٹ نے تعلیم کے لیے انجام دیا۔

اب انگریز کا رویّہ بدل رہا تھا۔ جنگ ختم ہو چلی تھی اور فاشسزم کے ساتھ سامراجیت کا دور تمام ہونے کو آگیا تھا۔ انگریز نے اپنی نیک نیتی کے ثبوت کے بطور مرکز کی توجہ تعلیم کی طرف مبذول کی اور سارجنٹ رپورٹ کی سفارشات پر عمل درآمد کے لیے شعبۂ تعلیم میں چند معاون مشیروں کی اسامیوں کا اضافہ کیا۔ اس وقت اس کا دفتر شملہ میں تھا۔ فیڈرل پبلک سروس کمیشن نے جب اس کا اشتہار دیا تو میں نے بھی درخواست گزاری۔ اپریل میں جب انٹرویو ہوا تو میرا انتخاب عمل میں آیا اور جولائی ۱۹۴۵ء سے شملہ میں زندگی کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ تنخواہ اور دیگر مراعات کے اعتبار سے یہ جگہ بہتر تھی۔ امرت سر کے مقابلے میں شملہ مجھے کہیں زیادہ پسند تھا۔ یہ خطرہ ضرور تھا کہ سرکاری ملازمت کی مصروفیت اور پابندی تصنیف و تالیف میں حائل نہ ہو جائے۔ لیکن یہ بھی ممکن تھا کہ عنقریب زمامِ حکومت قومی عناصر کے ہاتھ میں آجائے اور ہم جیسے لوگوں کے لیے تعمیری اور تخلیقی کاموں کے نئے راستے نکل آئیں۔

پاکستان ناگزیر تھا

۷

خاتمۂ جنگ اور سامراجیت کی جاں کنی

میں جب شملہ پہنچا، تو جنگ ختم ہونے کو آگئی تھی۔ جرمنی تو پہلے ہی (مئی ۱۹۴۵ء میں) ہتھیار ڈال چکا تھا۔ اگست میں امریکہ کے ایٹم بم کی تاب نہ لاکر جاپان نے بھی ہار مان لی۔ اب تاریخ کے اس دور کا آغاز ہوا جس میں ہم زندگی بسر کرتے ہیں۔ وہ زمانہ بیت گیا جب یورپ کے چھوٹے چھوٹے ملکوں نے بحری قوت اور صنعتی پیش رفتی کے بل پر دنیا میں بڑی بڑی سلطنتیں قایم کی تھیں اور ان کی لوٹ پر دولت و ثروت کے رنگ محل کھڑے کیے تھے۔ اگر روس اور امریکہ جیسے دیو پیکر جرمنی اور جاپان کا گلا نہ پکڑ لیتے تو دنیا استحصال اور استبداد کی مہیب ترین گرفت میں آجاتی۔ پرانے سامراجی ملک کیا فاتح، کیا مفتوح۔ جنگ میں ایسے بے دم ہوئے کہ نوآبادیوں کا تسلط تو دور، اپنے مستقبل کی خیر منانے لگے۔ ان کی پسپائی سے جو خلا پیدا ہوا اسے پُر کرنے کے لیے روس اور امریکہ رہ گئے۔ ان کے اپنے وسائل لامحدود تھے۔ رقبہ اور آبادی میں بڑی وسعت تھی۔ فوجی قوت بے پناہ تھی۔ دو بڑی طاقتوں میں لازمی

رقابت کے علاوہ، وہ دو متضاد معاشروں اور نظریوں کے مدّعی تھے۔

امریکہ کے سیاسی و سرمایہ دارانہ مفاد کا تقاضہ تھا کہ ایک طرف تو وہ مغربی یورپ اور جاپان کی ایسی مرہم پٹّی کرے کہ وہ انقلاب کے آپریشن سے بچ جائیں اور اپنی بقا کے لیے اس پر انحصار کریں۔ دوسری طرف ان کی نوآبادیوں کی سیاسی بیداریوں کو اس طرح رام کریں کہ حکومت کی ظاہری ذمّہ داری غیر ملکیوں کی بجائے ایسے دیسی عناصر کو منتقل کر دی جائے جو مغربی مفاد پر تکیہ کرے۔ سیاسی آزادی، اس کے سوا کچھ نہیں کرتی کہ ملک کا انتظام ملکی حاکموں کے سپرد کر دے اور وہ پس ماندگی کے سدّباب کے ضامن قرار دیے جائیں۔ اب ثابت ہوتا ہے کہ تمام ارضی و سماوی مصائب کی ذمّہ داری فقط غیر ملکی سامراج پر عاید نہیں کی جا سکتی بلکہ اصل خرابی قبائلی اور جاگیر داری سماج کی پیدا کی ہوئی ہے۔ جب تک چند نسلیں منظم طریقے سے ہوش مند اور بے لوث قیادت کی نگرانی میں اَن تھک محنت نہ کریں۔ صدیوں کی پس ماندگی دعا تعویذ اور پدرم سلطان بود کی نعرہ زنی سے دور نہیں ہوتی۔ گھوم پھر کر ترقی کے خواہاں نوآزاد ملک اشتراکیت کی راہ پکڑنے پر مجبور ہوتے ہیں خواہ اس کے عنوان جدا ہوا کریں۔

یہ انقلابِ روس کا کرشمہ ہے کہ دنیا کا ایک تہائی حصّہ انسانیت کو استحصال سے نجات دلا چکا ہے اسی کا براہِ راست اثر ہے جس نے مغربی سرمایہ داری کو فعالی ریاست کا تصوّر قبول کرنے پر مجبور کیا اور نوآبادیوں کو پہلے سامراج کی غلام گردش سے نکلنے اور بعد ازاں اقتصادی آزادی کی جدوجہد کا راستہ سجھایا۔

برطانیہ کی دانشمندی کا دوست دشمن سب نے اعتراف کیا ہے۔ اسے یہ سمجھتے دیر نہ لگی کہ جنگ کے بعد وہ اس قابل نہ رہے گا کہ اپنی عالمگیر سلطنت کا بارِ گراں زیادہ دیر سنبھال سکے۔ چنانچہ اس نے ایسا پینترا بدلا جس کی مثال سامراج کی تاریخ میں نہ ملے گی۔ پہلے ایشیا اور بعد ازاں افریقہ میں اس نے اپنا بستر اس طرح تہ کیا کہ سب اس کی چیرہ دستی کو بھول گئے بلکہ نوآزاد ملک "کامن ویلتھ" کی رکنیت پر ناز کرنے لگے۔ اس کی زبان و تہذیب کے گن گانے لگے، اس کے مال کی تلاش کرنے لگے، اس کے ماہروں سے تربیت حاصل کرنے لگے اور لندن

کو زیارت گاہ سمجھنے لگے۔ وجہ یہ تھی کہ ان نوآبادیوں کے حکمراں طبقے کو انگریزوں نے تعلیم دی تھی۔ (اس کی مثال بقول لارڈ ماؤنٹ بیٹن یہ ہے کہ نہرو اور پٹیل نے ۱۹۴۷ء میں اسے آزاد ہندوستان کی گورنر جنرلی پیش کرتے ہوئے کہا کہ آپ ہمیں حکومت کے کاروبار سکھلائیے)

اس حکمت عملی میں ہندوستان کی حیثیت کلیدی تھی کیونکہ یہ سب سے بڑا ملک تھا۔ یہاں جو کچھ ہوگا، اس کا ردِ عمل تمام نوآبادیوں پر ہوگا اور برطانوی پالیسی کی کامیابی یا ناکامی یہیں ظاہر ہوگی۔ اس میں کیا شک ہے کہ ہندو مسلم نفاق کو ہوا دے کر برِّصغیر میں برطانوی سامراج پھولا پھلا تھا، لیکن یہ امر ناقابلِ تردید ہے کہ جب انگریز (دراصل مجبوراً بظاہر بہ رضا و رغبت) انتقالِ اختیار کے لیے آمادہ ہوا، تو وہ ہر قیمت پر برِّصغیر کی وحدت کو برقرار رکھنا چاہتا تھا اور یہ کوشش اس نے آخر دم تک کی۔ اس لحاظ سے برطانیہ اور کانگریس کے نصب العین میں مکمل یکسانیت تھی۔

شملہ میں اس کانفرنس کی بڑی دھوم تھی جس میں شرکت کے لیے جولائی میں وائسرائے لارڈ ویول کی دعوت پر مسلم لیگ اور کانگریس کے زعما جمع ہوئے تھے۔ وہاں کی اونچی نیچی سڑکوں پر موٹر کا گزر ممکن نہ تھا۔ عام سواری رکشا تھی۔ ورنہ پیدل تو سب چلتے تھے۔ دفتر سے نکل کر جب میں شام کو مال روڈ پر چہل قدمی کرتا تو کبھی قائداعظم اپنی ہمشیرہ کے ساتھ رکشا پر نظر آتے اور پنڈت نہرو گھوڑے پر سوار ملتے۔ لارڈ ویول کی کوشش تھی کہ کانگریس اور مسلم لیگ کو مخلوط عبوری حکومت بنانے پر رضامند کیا جائے۔ لیکن یہ کوشش بے سود ثابت ہوئی اور کانفرنس ناکام ہوگئی۔ دراصل وجہ مجوزہ کابینہ میں مسلم نمایندگی کا مسئلہ تھا۔ مسلم لیگ کا موقف تھا کہ وہ مسلمانوں کی نمایندہ جماعت ہے۔ کانگریس کا اصرار تھا کہ وہ قومی جماعت ہے اور فی الحال اس کے صدر مولانا آزاد تھے، لہٰذا کابینہ میں وہ اپنی نشستوں میں مسلمانوں کو شامل کرنا چاہتی تھی۔

یہ بات ختم ہوئی تھی کہ انگلستان میں عام انتخابات ہوئے جن میں خلاف توقع مسٹر چرچل

کی قدامت پسند پارٹی کو شکست ہوئی اور عنانِ حکومت لیبر پارٹی کے ہاتھ آگیا۔ اس نے سال کے آخر میں ہندوستان میں عام انتخاب کرائے تو یہ ظاہر ہو گیا کہ مسلمانوں کی بہت بڑی اکثریت مسلم لیگ کے ساتھ ہے اور عملاً کانگریس کو فقط ہندو قوم کی تائید حاصل ہے۔ HODSON نے GREAT DIVIDE میں لکھا ہے:

"انتخاب نے یہ ثابت کر دیا کہ کانگریس کے ساتھ نوّے فی صدی ہندو ہیں اور مسلم لیگ کے ساتھ نوّے فی صدی سے بھی زیادہ مسلمان۔"

جب یہ نتیجہ برآمد ہوا تو مارچ ۱۹۴۶ء میں برطانوی وزیر اعظم اٹلی نے ایک اعلیٰ سطحی کابینہ مشن ہندوستان بھیجنے کا فیصلہ کیا، جس کے ارکان تین وزیر تھے جن میں وزیر ہند کے علاوہ ممتاز لیبر لیڈر اسٹیفورڈ کرپس بھی شامل تھا۔ انھیں ہدایت کی گئی تھی کہ کانگریس اور مسلم لیگ کو آمادہ کیا جائے کہ قانون ساز اسمبلی میں باہمی اتفاق سے آزاد مملکت کا آئین تیار کریں اور عبوری دور میں مخلوط حکومت قایم کریں۔ تفصیل غیر ضروری ہے کیونکہ واقعات کا علم ہر باخبر کو ہے۔ برطانوی کانگریس اور مسلم لیگ کے نقطۂ نظر کی وضاحت بہت سی تحریروں میں ہو چکی ہے۔ اس زمانے کی سیاسی گفت و شنید میرے سامنے دہلی اور شملہ میں ہوئی اور تاریخی شواہد و ذاتی مشاہدے کی بنا پر میں یہی کہوں گا کہ پاکستان کا قیام ۱۹۴۶ء میں ناگزیر ہو گیا۔ اس سلسلے میں چند مستند نکات کا ذکر ذیل میں دیا جاتا ہے:۔

(۱) لیبر پارٹی علانیہ نوآبادی نظام کی مخالف، ہندوستان کی آزادی کی موافق اور کانگریس کی مدّاح تھی۔ دونوں سیاسی جماعتوں کے کئی اکابر میں پرانی رسم و راہ تھی۔ نہرو کا رفیق وجلیس کرشنا مینن مدّتوں سے لندن میں مقیم اور لیبر پارٹی میں سرگرم عمل تھا۔ گاندھی جی کے معتمد سدھیر گھوش اور اسٹیفورڈ کرپس میں دیرینہ مراسم تھے۔ چنانچہ لیبر حکومت کے قیام کے بعد کانگریس کو گمان ہوا کہ وہ اپنی شرائط برطانیہ اور مسلم لیگ دونوں پر مسلّط کر سکے گی۔ گوکھلے کا مقولہ تھا "ہندوستان کی سیاست انگریز، ہندو اور مسلمان پر مشتمل مثلّث ہے جس کے دو پہلو تیسرے سے لامحالہ بڑے ہوں گے۔" برطانیہ اور کانگریس

بہر صورت ہندوستان کی سیاسی وحدت کے موئید تھے۔ یہ تب ہی ممکن تھا جب اقلیت پر اکثریت کی حکومت قایم ہو۔

(۲) لیکن یہ عام سیاسی اصول برِّصغیر پر یوں منطبق نہیں ہوتا تھا کہ یہاں دو سیاسی جماعتوں کی پُشت پر دو قومیں تھیں، جن میں سے ایک حقِ خود ارادیت کے نام پر اپنی آزاد مملکت پر اصرار کر رہی تھی۔ یہ موقع کسی میعادی انتخاب کا نہ تھا بلکہ جنگِ وراثت کا تھا جب برطانیہ کے اخراج کے ساتھ اس امر کا فیصلہ ہونا تھا کہ برِّصغیر میں ایک آزاد مملکت ہوگی یا دو۔

مذہبی اختلاف کی بنا پر انگلینڈ سے آئرلینڈ الگ ہوا تھا اور یہ اختلاف اب بھی باقی ہے۔ لہٰذا پاکستان کے موقف پر لیبر حکومت کا اعتراض دوغلے پن سے تعبیر کیا جائے گا، کیونکہ اگلے سال (۱۹۴۸ء میں) اسی نے اقوام متحدہ کے وسیلے سے آدھا فلسطین عربوں سے چھین کر یہودیوں کی مذہبی اور نسلی ریاست قایم کی۔ یہی نہیں بلکہ ایتھوپیا کی عیسائی حکومت کے سپرد صومالیہ کا "اوگدن" نامی صوبہ کر دیا۔

(۳) بہر صورت مارچ ۱۹۴۶ء میں دہلی وارد ہو کر کابینہ مشن نے مہینوں کی ان تھک گفت و شنید کے بعد سیاسی بحران کا جو حل پیش کیا وہ "کیبنٹ مشن پلان" کے نام سے مشہور ہوا۔ اس کا مقصد ہندوستان کی وحدت اور پاکستان کے مطالبہ میں ہم آہنگی پیدا کرنا تھا۔ منصوبے کا لبِ لباب یہ تھا۔ مرکز کا اختیار دفاع، امور خارجہ اور رسل و رسائل تک محدود رہے۔ باقی تمام اختیارات کما حقہ صوبوں کے سپرد ہوں گے جو تین حلقوں میں تقسیم کیے جائیں۔ ایک میں غیر منقسم بنگال اور آسام، دوسرے میں غیر منقسم پنجاب، سندھ، صوبہ سرحد اور بلوچستان کیے جائیں۔ ان دونوں حلقوں میں اکثریت مسلمانوں کی ہوگی۔ باقی ملک تیسرے حلقے میں شامل ہو، جہاں واضح ہندو اکثریت ہوگی۔ ان اصولوں کے تحت قانون ساز اسمبلی آزاد مملکت کا آئین تیار کرے۔ دریں اثنا مرکز میں عبوری حکومت قائم ہو، جس میں مسلم لیگ اور کانگریس کو مساوی طور پر چھ چھ نشستیں دی جائیں گی۔ مسلم لیگ نے اس منصوبے کو منظور کر لیا۔ کانگریس نے بھی منظوری دے دی۔ لیکن اس موقع پر (جون میں) پنڈت نہرو نے اس کی صدارت سنبھالتے ہی اعلان کیا کہ منصوبے کی تاویل کا حق ان کی جماعت کو ہوگا

اور گاندھی جی نے بیان دیا کہ آسام کو بنگال سے الگ رکھا جائے۔ مسلم لیگ کے احتجاج کے باوجود کابینہ مشن کی کانگریس دوستی کے پیشِ نظر وائسرائے نے کانگریس کے رویّے سے چشم پوشی کی بلکہ عبوری حکومت کے قیام کا فیصلہ کرتے وقت مجوزہ کابینہ میں کانگریس کی چھ نشستوں کے مقابلے میں مسلم لیگ کی نشستوں کی تعداد کم کر کے پانچ کر دی۔ اب مسلم لیگ کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ کابینہ مشن کے منصوبے کی منظوری کو منسوخ کر دے اور مسلمانوں کو عوامی جدوجہد کی دعوت دے۔ اس غرض سے اس نے ۱۶ر اگست ۱۹۴۶ء کو "یومِ سیاہ" منانے کا اعلان کیا۔

لارڈ ویول نے اپنی یادداشت میں لیبر حکومت، کانگریس جماعت اور گاندھی جی پر اس سلسلے میں سخت نکتہ چینی کی ہے۔ تمام غیر جانب دار مبصّروں نے، حتیٰ کہ مولانا آزاد تک نے، کابینہ مشن کے منصوبے کو غرقاب کر کے ملک کو تقسیم کرنے کی ذمّہ داری کانگریس کی قیادت اور بالخصوص پنڈت نہرو پر عاید کی ہے۔

(۴) ۱۶ر اگست کو کلکتہ میں جو خوں ریز فرقہ وارانہ ہنگامہ شروع ہوا، اس کی آگ تمام شمالی ہند میں پھیل گئی۔ بے حساب بے گناہ تلوار کے گھاٹ اتر گئے جن میں مسلمانوں کی تعداد بہت زیادہ تھی، کیونکہ نہ وہ منظم تھے اور نہ مدافعت کے لیے تیار۔ نومبر میں بہار میں ایسے وسیع پیمانے پر مُسلم کُش فسادات ہوئے کہ گاندھی جی کے پرائیویٹ سکریٹری پیارے لال کے بقول "ہندوستان کی سیاسی وحدت کا تصوّر ختم ہو گیا"۔ پیارے لال کے بقول "تمام شہادتوں کی جانچ پڑتال کے بعد گاندھی جی اس نتیجے پر پہنچے کہ بہار کے ہندوؤں کی غارت گری کی ذمّہ دار وہاں کی کانگریسی وزارت اس لحاظ سے قرار پاتی ہے کہ وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے تماشا دیکھتی رہی"۔ بہار کے فسادات میں کم از کم بیس اور زیادہ سے زیادہ پچاس ہزار مسلمان مارے گئے۔ ان میں میری بوڑھی چچی بیگم اصغر حسین بھی تھیں جو شوہر کے انتقال کے بعد پٹنہ کے قریب نیمی نامی قصبہ میں رہتی تھیں۔ وہ شوق نیموی کی بھانجی تھیں۔ ان فسادات کا اثر پایۂ تخت دہلی پر اس طرح پڑا کہ تقریباً ایک سال شہر میں بدامنی کی وجہ سے مسلسل کرفیو رہا۔ روز کہیں

نہ کہیں قتل و غارت گری برپا رہی۔ سب سے مخدوش محلّہ قرول باغ تھا جو راشٹریہ سیوک سنگھ کا اڈّا اور سکھ پناہ گزینوں کا مرکز تھا۔ میری سکونت وہیں ایک سرکاری فلیٹ میں تھی۔ بیوی بچّوں کو علی گڑھ بھیج کر ملازم کے ساتھ تن تنہا ایک سال میں اس کلبۂ احزاں میں پڑا پڑا رات رات بھر "اللہ اکبر" اور "ہر ہر مہادیو" کے نعرے سُنتا رہا۔

(۵) جب کانگریس نے بلا شرکت غیرے عبوری حکومت بنالی اور مسلم نشستوں پر موقع پرستوں کو فائز کر دیا (شفاعت احمد خاں، علی ظہیر وغیرہ) تو مسلم لیگ نے مصلحتاً اس میں شرکت قبول کرلی، لیکن قانون ساز اسمبلی میں شرکت سے انکار کر دیا۔ بداعتمادی اتنی بڑھ چکی تھی اور فضا ایسی مکدّر تھی کہ روزمرّہ کے انتظامی کاروبار میں بھی دونوں جماعتوں کے وزیروں میں تعاون ناممکن ہوگیا۔ اب کانگریس نے لارڈ ویول کو دبانا شروع کیا کہ یا تو اس کا استعفیٰ قبول کر دیا مسلم لیگ کو حکومت سے نکال دو۔ بیچارے وائسرائے کی جان ضیق میں آگئی اور اس نے برطانوی حکومت سے صاف کہہ دیا کہ ہندوستان کا مسئلہ لاینحل ہے۔ مناسب یہی ہے کہ پچاس ہزار برطانوی باشندوں کو جلد از جلد یہاں سے نکال کر ہم حکومت سے سبک دوش ہو جائیں، پھر اہلِ ہند جو چاہے کریں۔ دسمبر میں خطرے کا یہ الارم جیسے ہی وزیر اعظم ایٹلی کے کان میں بجا، اس نے قائد اعظم اور پنڈت نہرو کے ساتھ وائسرائے کو لندن آنے کی دعوت دی۔ لیکن چند روز کی مغز پاشی کے بعد جب کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا تو اس نے اپنی حکمت عملی بدل دی۔ لارڈ ویول کو برطرف کر کے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو وائسرائے مقرر کیا۔ فروری ۱۹۴۷ء میں ایٹلی نے برطانوی پارلیمنٹ میں اعلان کیا کہ جون ۱۹۴۸ء تک برطانیہ برّصغیر کو چھوڑ دیگا۔ دریں اثنا وائسرائے، کابینہ مشن کے منصوبے یا اور کسی قابلِ قبول منصوبے پر فریقین کو آمادہ کرے۔

سدھیر گھوش نے اپنی کتاب GANDHI'S EMISSARY میں لکھا ہے:۔

"کرپس نے نہرو سے کہا کہ لارڈ ویول سے تمھاری نہیں بنتی تو ہم اس کی جگہ ماؤنٹ بیٹن کو وائسرائے بناتے ہیں جو تمھارے کام کا آدمی ہے۔" ماؤنٹ بیٹن مارچ میں دہلی پہنچا۔ مئی میں

اس نے انتقال اختیار کا پہلا مسودہ قائداعظم اور نہرو کو رازدارانہ دکھلا کر لندن بھیجا۔ جب ترمیم کے ساتھ منظور ہو کر یہ آگیا تو ماؤنٹ بیٹن نے شملہ میں اپنے مشیروں کے احتجاج کے باوجود اسے نہرو کو دکھلا دیا (اور قائداعظم کو اطلاع بھی نہ دی)، نہرو نے جو اعتراضات اس پر کیے انھیں وی۔ پی مینن کے قلم سے دستاویز میں شامل کر کے چپ چاپ لندن لے گیا اور وہاں کی حکومت نے اس پر مہر تصدیق ثبت کی، تو یہ جون ۱۹۴۷ء کا وہ فرمان ٹھہرا جس کے تحت برِّصغیر کی تقسیم ہوئی۔ تمام مورّخوں نے ان واقعات کی تفصیل لکھی ہے۔ البتہ ان مسوّدوں کا متن شایع نہیں ہوا تاکہ دیکھا جا سکے کہ پنڈت نہرو کے ارشاد اور وی۔ پی۔ مینن کی محرّری کے کیا عنوان تھے۔ اہم نکتہ یہ ہے کہ کانگریس نے اس فرمان کو اس شرط کے ساتھ منظور کیا کہ تقسیم کا کام دو مہینے کے اندر یعنی اگست میں ختم ہو جائے اور اس کے عوض ہندوستان ڈومینن کی حیثیت قبول کرے گا اور ماؤنٹ بیٹن کو ایک سال کے لیے آزاد ہند کا گورنر جنرل مقرر کرے گا۔ مسلم لیگ نے بھی اس میعاد کو منظور کر لیا۔ البتہ ماؤنٹ بیٹن کو پاکستان کا گورنر جنرل بنانے سے انکار کر دیا۔ اس کا ردِّعمل کتنا شدید تھا، اس کا اظہار اس کی ڈائری کے حوالے سے HODSON نے یوں درج کیا ہے "میں نے (ماؤنٹ بیٹن نے) مسٹر جناح سے کہا کہ اس کی قیمت پاکستان کو ادا کرنا ہوگی"۔ جذبۂ انتقام میں ماؤنٹ بیٹن نے پاکستان کو جیسا نقصانِ عظیم پہنچایا وہ سب کو معلوم ہے۔

مولانا آزاد کے ساتھ چند ماہ

جنگ سے پہلے حکومتِ ہند کا دائرۂ کار اتنا محدود تھا کہ پانچ سو افسر اور پانچ ہزار کارندے کافی تھے۔ یہ سب گرمیوں میں شملہ اور سردیوں میں دہلی میں رہتے تھے، لیکن دورانِ جنگ کی بے پناہ توسیع نے یہ آوا جائی بند کر دی۔ ضروری دفاتر مستقلاً دہلی میں اور غیر ضروری شملہ میں رکھے گئے اور ان کے اہل کار ڈاک، فون یا ریل کے ذریعے سے رابطہ برقرار رکھتے تھے۔ ان غیر ضروری دفاتر میں وہ شعبۂ تعلیم بھی تھا جس کی خدمت پر میں مامور ہوا۔ جولائی میں محکمۂ زراعت، صحت و تعلیم کا ایک شعبہ تھا اور فقط آٹھ دس افسروں اور تیس چالیس کے

عملے پر مشتمل تھا۔ پھر اکتوبر میں ان تینوں کو الگ الگ محکمہ بنایا گیا اور سال بھر بعد عبوری حکومت کے قیام کے وقت ہر محکمے کو وزارت کا لقب ملا۔ پہلے وزیر کو وائسرائے کی کونسل کا ممبر کہتے تھے۔ ہمارے ممبر سر جوگندر سنگھ تھے، جو فارسی و اردو کے شائق اور اقبال کے بے تکلف دوست تھے۔ انھیں مخاطب کر کے اقبال نے موٹر کے عنوان سے ایک نظم کہی تھی جس کا پہلا مصرعہ ہے ع

کیسی پتے کی بات جوگندر نے کل کہی

جیسے ہی حکومت کی توجہ ترقی اور منصوبہ بندی کی طرف گئی، محکمۂ تعلیم میں تیزی سے توسیع ہوئی۔ ہماری خوش قسمتی تھی کہ سر جان سارجنٹ جیسا بیدار مغز رہبر ملا۔ ان کی ہدایت پر میں نے تعلیمی منصوبہ بندی کا شعبہ قایم کیا۔ نیز تعلیمی معلومات و مطبوعات BUREAU OF EDUCATION کی طرح ڈالی۔ جس کی حیثیت عہدِ حاضر میں ہر تعلیمی محکمے کی سنگِ بنیاد کی ہے۔ کیونکہ تعلیم کی ذمّہ دار صوبائی حکومتیں تھیں۔ مرکز کا کام انھیں مشورہ اور مدد دینا اور ان کی پالیسی میں رابطہ پیدا کرنا تھا۔ اس غرض سے مرکز نے ایک مشاورتی بورڈ بنایا تھا، جس میں تمام صوبوں کے وزیرانِ تعلیم، یونیورسٹی کے وائس چانسلر اور سربرآوردہ ماہرینِ تعلیم تھے۔ اس کی سالانہ میٹنگ باری باری کسی صوبے یا ریاست میں ہوتی تھی اور اس کی ذیلی کمیٹیوں کے اجلاس دہلی میں منعقد ہوتے تھے۔ یہ سب کام جس دفتر میں ہوتا تھا، اس کی نگرانی میرے سپرد تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ دو سال کی مدّت میں میں نے جو تجربہ حاصل کیا وہ عمر بھر کام آیا۔ یوں تو کئی ناقابلِ فراموش مباحث ذہن پر نقش ہیں لیکن طوالت کے خوف سے فقط ایک کا ذکر کرتا ہوں۔ مذہبی تعلیم کی غرض و غایت پر غور کرنے کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دی گئی جس کے صدر ڈاکٹر رادھا کرشنن (بعد ازاں صدر جمہوریۂ ہند) تھے اور ارکان میں نوبل پرائز یافتہ سر سی۔ پی۔ رمن جیسے عالی دماغ تھے۔ سکریٹری کی خدمت میں نے انجام دی۔ کئی بار نشست و برخاست کا سلسلہ جاری رہا اور نتیجہ کچھ برآمد نہ ہوا۔ رپورٹ لکھتے وقت مشکل پیش آئی کہ یہ کیسے کہیں کہ کمیٹی کسی بات پر متفق نہیں ہوئی۔ میں نے صدرِ محترم کو سمجھایا کہ یہ کہیں کہ ہر روز اسکول کے بچے چند منٹ دل ہی دل میں اپنے اپنے انداز سے اللہ کو یاد کریں۔ انھوں نے یہ کہہ کر اس تجویز کو منظور کیا کہ اختلاف زبان کھلنے پر ہوتا ہے۔ جب بات دل میں ہو تو اختلاف کی کیا گنجایش ہے؟

جنوری ۱۹۴۶ء میں ہمارا محکمہ شملہ سے دہلی منتقل ہوا اور سکریٹریٹ کے نارتھ بلاک میں قائم ہوا۔ البتہ گرمیوں میں دو سال تک وزیر اور سکریٹری کے ساتھ میرا دفتر شملہ منتقل ہوتا رہا۔ جب آدھا سال گزر گیا اور عبوری حکومت بنی، تو چند ماہ کے لیے برِصغیر کے ممتاز مدبّر راج گوپال اچاریہ (راجہ جی) وزیرِ تعلیم مقرر کیے گئے۔ مجھے مختلف ملکوں کے درجنوں وزیروں کے ساتھ کام کرنے کا اتفاق ہوا ہے لیکن میں نے راجہ جی جیسی عملی صلاحیت اور تیز نظری کسی میں نہیں دیکھی۔ دھان پان سا جسم، کھادی کا کرتا دھوتی، ماتھے پر تلک، گلے میں زنّار، کاندھے پر گاڑھے کا انگوچھا، لوہے کی کمان کی عینک، پاؤں میں چپّل اور ہاتھ میں موٹی سی چھڑی۔ اپنے کمرے میں اونچی کرسی اور مخملی صوفہ ہٹا کر تخت بچھوا لیا تھا، جس پر گاؤ تکیہ کے سہارے بیٹھے بڑی بڑی مسلوں کو آن کی آن میں دیکھتے اور گھڑی بھر میں فیصلہ صادر کر دیتے تھے۔ وہ ضابطہ ختم ہو چکا تھا کہ ممبر صرف سکریٹری سے واسطہ رکھتا تھا۔ اب وزیر براہِ راست متعلقہ افسر کو بلا کر اس کی بات سنتا اور اپنی رائے دیتا تھا۔ چنانچہ چند بار راجہ جی نے مجھے بھی یاد فرمایا۔

دسمبر میں سر جارج سارجنٹ کے ساتھ میں دورے پر بمبئی گیا، تو اچانک دو خبریں دہلی سے ملیں۔ ایک دن اخبار میں چھپا کہ دہلی کی انجمن ترقی پسند مصنّفین کے سالانہ اجلاس میں مجھے اس کا صدر منتخب کیا گیا ہے۔ اگلے دن فون پر اطلاع آئی کہ راجہ جی کا تبادلہ کسی اور وزارت میں ہو رہا ہے، ان کا قلم دان مولانا آزاد کو ودیعت ہوا ہے۔ بنا بریں، ہم فوراً دہلی لوٹ آئے۔

کلکتہ میں میں چند بار مولانا ابوالکلام آزاد کی خدمت میں حاضر ہو چکا تھا مگر آخری ملاقات کو بارہ سال کا عرصہ گزر چکا تھا۔ وہ زمانہ میری طالب علمی کا تھا، اور کوئی وجہ نہ تھی کہ ان جیسا کثیر الملاقات اور عدیم الفرصت مجھے یاد رکھتا۔ چنانچہ ان کے حافظہ کا میں قائل ہو گیا۔ جب رسمی تعارف کے وقت سکریٹری نے ڈاکٹر اختر حسین، کا نام پکارا تو مولانا نے اس پر "رائے پوری" کا اضافہ کر دیا۔ جب میں لفظِ شکریہ زبان پر لایا، تو مولانا نے کہا "مجھے ۱۹۳۴ء کی ملاقات یاد ہے جب تم علی گڑھ سے کلکتہ آئے تھے اور تمھارے ہندو دوستوں کی کوشش کے باوجود مالک مکان نے کمرہ کرایہ پر دینے سے انکار کر دیا تھا۔ میں سوچتا رہ گیا کہ ایسی حقیر سی تفصیل مولانا کو کیسے یاد رہ

گئی۔ حافظے کا ایسا ہی کمال سر راس مسعود میں دیکھنے میں آیا۔ جب مولوی عبدالحق نے ان سے میرا تعارف کرایا، تو وہ بولے: "میں نے انھیں ۱۹۳۲ء میں پہلی بار دیکھا تھا، جب یہ کلکتہ سے علی گڑھ داخلے کے لیے آئے تھے۔ جب یہ اپنی اسناد دکھلانے میرے کمرے میں آئے تو کوئی کرسی خالی نہ ملی، اور یہ بلا تکلف کھڑکی کی سل پر بیٹھ گئے۔"

مولانا آزاد نے اپنی وزارت میں میری موجودگی کو اس طرح سراپا کہ نادانستہ میری زندگی کا رُخ بدل دیا۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے:۔

دورانِ جنگ جب حکومتِ ہند نے لوگوں کو حرفتی تربیت کے لیے امریکہ بھیجنا شروع کیا تو اس پروگرام کی نگرانی کے لیے محکمۂ تعلیم کا ایک افسر واشنگٹن میں تعینات کیا۔ تین سال بعد جب اس تقرر کی میعاد ختم ہوئی تو اپریل میں اس کا تبادلہ دہلی ہونے لگا اور اس کی جگہ اور کسی کو بھیجنے کا سوال درپیش ہوا۔ مارچ کے مہینے میں سر جان سارجنٹ نے اس جگہ کے لیے جسے تعلیمی اتاشی سے موسوم کیا گیا، میرا نام تجویز کیا اور منظوری کے لیے فائل کو مولانا کو پیش کر دیا۔ مولانا مجھ پر ایسے مہربان تھے کہ ان کی منظوری قطعی تھی۔ سکریٹری نے مجھ سے کہا کہ تم اپریل میں چل پڑو کیونکہ ملک کے حالات مخدوش ہیں اور آیندہ خدا جانے کیا گزرے۔ جب یہ خبر مشتہر ہوئی تو خیر خواہوں نے مبارکباد دینا شروع کر دیا۔ اتنے میں مولانا نے مجھے بلایا اور اس فائل کی طرف اشارا کر کے اپنے مخصوص انداز میں کہا "میرے بھائی، ابھی میں نے وزارت میں قدم رکھا، اور آپ نے جانے کی تیاری کر لی۔" یہ سنتے ہی میں سہم گیا تو فرمایا "وزارت کی تنظیم کا جو نقشہ میرے ذہن میں ہے اس میں آپ کے لیے ایک خاص جگہ ہے۔ اگلے مہینے یعنی اپریل میں آپ کو میرے ساتھ شملہ جانا ہے۔ تب تک میں اس فائل پر حکم صادر نہیں کرتا۔ پھر اگر میری تجویز آپ کو پسند نہ آئی تو امریکہ چلے جائیے گا۔ حکمِ حاکم مرگِ مفاجات، میں خاموش ہو رہا اور اپریل میں تین ماہ کے لیے شملہ چلا گیا۔ وہاں کے دفتر کی نگرانی میرے سپرد ہوئی۔ اور ہر روز کا وظیفہ یہ قرار پایا کہ دوپہر کو جو ڈاک دلّی سے آتی اس میں سے حسبِ ضرورت کاغذات لیے تین بجے سیسل ہوٹل سکریٹری کے پاس جاتا اور اُن میں سے جو وہ مولانا کو پیش کرتے، وہ ان کی خدمت میں لے جاتا۔ کیونکہ مولانا انگریزی میں گفتگو سے گریز کرتے تھے، دونوں کو ایک دوسرے پر اعتماد نہ تھا، لیکن میری نیک نیتی

پر اعتبار تھا، لہٰذا یہ حاضر باشی میرے حصّے میں آئی۔ شام کے پانچ بجے تک اس کاروبار سے فارغ ہو کر مولانا چائے کی میز پر آ بیٹھتے تھے۔ وہ دن کا کھانا نہ کھاتے تھے اور رات کے کھانے پر نہ کہیں جاتے تھے، نہ کسی کو بلاتے تھے۔ ملنا ہوتا، شام کی چائے پر آ جاتا اور سیاست، تاریخ، علم و ادب پر مولانا کی گوہر افشانی سے بہرہ مند ہوتا جس کا موقع اور کہیں ملنا مشکل تھا۔ تین مہینے تقریباً ہر روز مجھے یہ سعادت حاصل ہوئی اور ان صحبتوں کا لطف اب تک نہیں بھولا۔

خلوت، جلوت میں مولانا کی گفتار و رفتار میں فرق نہ آتا تھا۔ وہ جس طرح تول کر قدم رکھتے تھے، اسی طرح تول کر بات کرتے تھے۔ اس رچاؤ اور رکھ رکھاؤ پر تصنّع کا بھی شبہ ہو سکتا تھا۔ خطابت ان کی عادتِ ثانیہ بن گئی تھی اور گھر باہر وہ ایک ہی انداز میں گفتگو کرتے تھے۔ وہ طبعاً فیاض اور نفاست پسند تھے۔ ہمیشہ کھادی کی شیروانی پہنی لیکن اسے سیتا تھا کلکتہ کا انگریز درزی ریلکن۔ ساغر نظامی سے سُنا تھا کہ ۱۹۳۵ء کے لگ بھگ وہ مولانا کے مہمان ہوئے۔ جب جانے لگے تو مولانا نے کہا کہ پرانے رواج کے مطابق چھوٹوں کو سفر خرچ دیا جاتا ہے۔ اس وقت جو میسّر ہے لے لو۔ یہ کہہ کر مٹھی بھر اٹھنّی، چونّی انھیں دے دی۔ یہ مولانا کی تنگ دستی کا وقت تھا۔ پھر جب وہ وزیرِ تعلیم ہوئے، تو میرا اردلی حاجی محمد ان کی خدمت پر مقرر ہوا۔ اس کا بیان تھا کہ مولانا ہر روز سو روپے کا نوٹ باورچی کو دے دیتے تھے اور حساب نہیں لیتے تھے۔

اپنے دور کی سیاست اور اخبار نویسی پر مولانا کے نام کی مہر ثبت ہے۔ تاہم انھیں اس امر کا ہمیشہ غم رہا کہ علم و ادب کی خاطر خواہ خدمت نہ کر سکے۔ "ترجمان القرآن" اُن کا سرمایۂ حیات قرار پائے گا اور ان کی بصیرت و حکمت کی شہادت دیتا رہے گا۔ البتہ ان کے "تذکرہ" اور "غبار خاطر" میں متن کا وزن کم اور انشا کی گرانی زیادہ ہے۔ ان کے خطوط کا اندازہ کاروباری زیادہ ہے اور ادبی کم۔ البتہ تقریر میں ان کا جوہر ایسا کھلتا تھا کہ کوئی موضوع ہو، یکساں روانی اور استدلال سے گھنٹوں خوش کلامی کرتے تھے۔ سامعین میں کوئی نکتے کی بات کہے تو توجہ سے سُنتے اور داد دیتے تھے۔ ایک بار مغرب و مشرق کی شاعری کا مقابلہ ہونے لگا تو میں نے کہا جب میں سنسکرت کی شاعری کا مطالعہ کرتا ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ کسی گھنے جنگل میں پھر رہا ہوں جس میں طرح طرح کے درخت ہیں اور بھانت بھانت کے چرند و پرند کلیلیں کر رہے ہیں۔ یورپ کی

شاعری برف وباراں اور ہرے بھرے میدانوں میں لے جاتی ہے۔ فارسی و اردو کی شاعری شہر کے گلی کوچوں یا صحرا کے ریگ زاروں کی یاد دلاتی ہے۔ یہ سُن کر مولانا ذرا دیر کے لیے خاموش ہو گئے اور پھر خوشی کے انداز میں کہا "یہ نیا خیال ہے اس پر تفصیل سے لکھیے۔ معاشیات کے علاوہ جغرافیہ کا بھی اثر فن و ادب پر ہوتا ہے۔"

شملہ جاتے وقت مولوی عبدالحق نے مجھ سے کہا تھا کہ انجمن ترقی اردو کی عمارت کے لیے زمین کا انتظام ہو گیا ہے۔ اور وزارتِ تعلیم کی سفارش پر نواب زادہ لیاقت علی خاں کی وزارتِ مالیات پانچ لاکھ کی گرانٹ منظور کر لے گی۔ مولانا کو رضامند کرنے کا کام مولوی صاحب نے میرے سپرد کیا۔ چنانچہ ایک دن جب میں نے یہ بات چھیڑی تو مولانا نے برہم ہو کر کہا "مولوی عبدالحق نے ایسی سنگین لسانی بحث انجمن کے ڈائرکٹروں سے پوچھے بغیر شروع کر دی۔ مجھ سے ان کا ذکر نہ کرو۔" میں نے عرض کیا "قبلہ یہ مولوی صاحب کا نہیں، ادارے کا معاملہ ہے۔" غرض جب مولانا کی خفگی کم ہوئی تو انھوں نے کہا کہ مولوی صاحب کو بلاؤ تو میں خود بات کروں۔ میری اطلاع پر مولوی صاحب اپریل کے آخر میں دن بھر کے لیے شملہ آئے۔ جب میں انھیں مولانا آزاد کے پاس لے گیا تو ظاہر ہوا کہ دونوں میں مدّتوں کے بعد ملاقات ہوئی ہے، گو کہ مولانا انجمن کی مجلس عاملہ کے رکن رہ چکے تھے۔ جب مولانا نے شکایت کی کہ "ساہتیہ پرشد" کے جلسے کو آپ نے خواہ مخواہ اتنا اُچھالا تو مولوی صاحب نے میری طرف اشارہ کیا اور کہا کہ سب کچھ ان کی موجودگی میں ہوا تھا، ان سے پوچھ لیجیے۔ اس واقعے کی روداد سُن کر مولانا نے کہا کہ کاش اس وقت (۱۹۳۶ء میں) آپ مجھے آگاہ کرتے تو میں گاندھی جی کو راہِ راست پر لے آتا۔ قصّہ مختصر، مولانا نے اپنی وزارت کو ہدایت کی کہ انجمن کے لیے گرانٹ کی سفارش کی جائے اور کاغذات اُن کے دستخط سے وزیر مالیات کو پیش کیے جائیں۔ دہلی سے سفارش نامہ مئی کے وسط میں آیا اور مولانا کے دستخط کے بعد دہلی روانہ کر دیا گیا۔ جب تک وزیر مالیات اسے ملاحظہ کریں، ۳ر جون کو تقسیم ملک کے ساتھ حکم تعطل ....

STANDSTILL ORDER صادر ہوا جس کے تحت ہر نئے خرچ، تقرر، ترقی اور تبادلہ کی ممانعت کر دی گئی۔ اس کے ساتھ مولانا نے میری ترقی کی جو تجویز کی تھی وہ بھی باطل ہو گئی اور امریکہ کے تبادلے کا فائل بھی ان کی تحویل میں دھرا رہ گیا۔

تقسیم کے اعلان کے ساتھ مرکزی حکومت کے ہر ملازم کو اختیار OPTION دیا گیا کہ ہندوستان یا پاکستان دونوں میں سے کسی کی خدمت کا فیصلہ جون کے آخر تک کرے۔ قائداعظم اور نواب زادہ لیاقت علی خاں نے اپیل کی کہ مسلمان ملازمین، بلا استثنار پاکستان کی ملازمت کا تہیہ کریں۔ جب میں نے مولانا آزاد سے یہ ذکر چھیڑا تو انھوں نے جواب دیا۔ ہمیشہ کی طرح میں اب بھی کہتا ہوں کہ مسلمانوں نے غلط فیصلہ کیا ہے لیکن کیونکہ پاکستان بن رہا ہے، لہٰذا ہر تجربہ کار مسلمان کو چاہیے کہ وہاں جائے اور اس کی تنظیم میں ہاتھ بٹائے۔ مولانا کی کتاب INDIA WINS FREEDOM میں جو کہا گیا ہے کہ ان کی وزارت کے مسلم عہدہ دار کسی دباؤ کے تحت پاکستان جانے پر مجبور ہوئے۔ یہ بیان صحیح نہیں ہے۔ ہم میں سے کسی پر پاکستان کے اربابِ اختیار نے کوئی "دباؤ" نہیں ڈالا، یا تو اپنی خوشی سے آئے اور یا جان بچانے کے لیے۔

تحریکِ پاکستان کی حمایت کی وجہ سے آزاد ہند میں جب مسلمان معتوب ہوئے، تو مولانا آزاد کا سیاسی اثر ختم ہو گیا۔ البتہ ان کی شخصیت کا احترام باقی رہا اور ان کی خوش تدبیری نے تعلیم کو بہت فروغ دیا۔ حکومتِ پاکستان کی جانب سے دوبارہ ان کی خدمت میں حاضر ہونے کا مجھے اتفاق ہوا، تو مجھے ان کی بے بسی کا اندازہ ہوا۔ تقسیم کے وقت (میرے مشورے کو مسترد کر کے) چودھری محمد علی اس امر پر رضامند ہو گئے تھے کہ مرکزی حکومت کے متعدد کتب خانوں کو بانٹا نہیں جائے گا۔ البتہ ان میں جن کتابوں کے دو دو نسخے ہوئے ان میں سے ایک ایک کو پاکستان کے حوالے کر دیا جائے گا۔ ہندوستان کی وزارتِ تعلیم نے بعد میں کہہ دیا کہ ایسی کتابوں کی فہرست اس کے پاس نہیں ہے۔ چنانچہ اس فہرست کی تکمیل کے لیے پاکستان سے ایک افسر عملے کے ساتھ دہلی بھیجا گیا اور لاکھوں روپے کے خرچ اور سالہا سال کی دوڑ دھوپ کے باوجود کچھ نہ کر سکا۔ ۱۹۵۲ء میں مجھے دہلی بھیجا گیا کہ مولانا آزاد سے کہہ سن کر تصفیہ کراؤں۔ مولانا نے کہا کہ میں لاکھ کہتا ہوں، لیکن ہندو اہل کار تعاون نہیں کرتے۔ اپنے عملے کو واپس لے جاؤ کیونکہ اس کوشش کا حاصل کچھ نہ ہو گا۔ ہاں اگر دونوں حکومتیں مل کر برطانیہ سے کہیں کہ انڈیا آفس لائبریری کو لندن سے منتقل کر کے برِصغیر میں لے آئیں تو پاکستان کا خسارہ پورا ہو جائے گا۔ کراچی لوٹ کر جب میں نے اپنی حکومت کو رپورٹ پیش کی، تو مولانا کے مشورے پر عمل کا فیصلہ کیا گیا۔ انڈیا آفس کے

ذخیرے کی تحقیق میں مدّتوں میں سرگرداں رہا اور بالآخر ۱۹۵۵ء میں جب وزیر اعظم محمد علی بوگرا مختلف امور پر پنڈت نہرو سے گفتگو کے لیے دہلی گئے تو اپنے ساتھ وزیر تعلیم (کرنل عابد حسین) اور مجھے لیتے گئے۔

جب مولانا آزاد سے رسمی ملاقات ہوئی، تو انھوں نے ایسا رویّہ اختیار کیا کہ ہمیں سخت مایوسی ہوئی۔ کہنے لگے کہ انڈیا آفس سے جو کتابیں وغیرہ ہمارے حصّے میں آئیں وہ ہندوستان میں رہیں، البتہ اُن میں پاکستان کی دلچسپی جن چیزوں سے ہوگی اُن کی نقل آپ کو دے دی جائے گی۔ ہم نے کہا کہ اپنی کم مائیگی کے باوجود تقسیم کے وقت ہم نے کتب خانوں کے بٹوارے پر اصرار نہیں کیا تھا۔ اس کے پیشِ نظر مناسب یہی ہوگا کہ انڈیا آفس کا جو بھی حصّہ منتقل ہو وہ پاکستان میں رہے اور اس کی نقلیں آپ لے لیں۔ غرض یہ بات آگے نہ بڑھی۔ یہ ثابت ہوگیا کہ مولانا کسی معاملے میں مختار نہ رہے تھے اور پاکستان کے کسی جائز مطالبے کی حمایت سے بھی وہ اجتناب کرتے تھے، مبادا اغیار اُن پر الزام نہ لگا دیں۔

کسی کے وہم و گمان میں نہ تھا کہ تقسیم کے اعلان پر اتنی جلدی عمل ہوگا۔ جوش و جذبے کا یہ عالم تھا کہ اس کے فوری اور دور رس نتائج کا جائزہ لینے کی نہ ضرورت سمجھی گئی اور نہ مہلت ملی۔ ماؤنٹ بیٹن کا یہ قول اس کے افسر امور عامہ CAMPBELL JOHNSON نے نقل کیا ہے۔ انتظامی نقطۂ نظر سے نئی حکومت پختہ مکان، کچّے گھر یا ڈیرہ کے اندر قایم کی جاسکتی ہے۔ ہم پاکستان کے لیے ڈیرہ ڈال رہے ہیں۔ کانگریس نے انتقال اقتدار کے لیے دو ماہ کی شرط اسی لیے لگائی تھی کہ پاکستان کو متحدہ ملک کے اثاثے کا حصّہ نہ ملے اور ایسا انتشار پیدا ہو کہ اسے پاؤں جمانے کی فرصت نہ ملے۔

جون کے آخر میں شملہ سے دہلی لوٹا تو آپشن دینے کی تاریخ ختم ہوگئی تھی اور میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کروں۔ ۱۹۴۵ء تک میں اس خوش فہمی میں مبتلا تھا کہ کانگریس مسلمانوں کے جائز مطالبات کو تسلیم کرنے میں دریغ نہ کرے گی لیکن اس کی بے اصولی نے اس فریب کو ختم کردیا اور ۱۹۴۶ء کے واقعات نے سب پر ثابت کردیا کہ پاکستان کا قیام ہی مسلمانوں کی

سیاسی نجات کا واحد حل ہے۔ اس کے بعد ہندوستان میں باقی ماندہ مسلم اقلیت کا حشر کیا ہوگا؟ اسے ہندو اکثریت کے انتقام و غضب کا سامنا لامحالہ کرنا ہوگا۔ یہ بھی ممکن نہیں کہ پاکستان کا محدود رقبہ اور قلیل وسائل ان سب کو پناہ دے سکیں۔

چودھری محمد علی اس وقت "پارٹیشن کونسل" میں پاکستان کے نمایندہ نامزد وزیر اعظم لیاقت علی خاں کے مشیر خاص اور مجوزہ حکومتِ پاکستان کے متوقع سکریٹری جنرل تھے۔ انھوں نے مجھے بلا کر کہا "آپ نے اب تک پاکستان کے لیے آپشن کیوں نہیں دیا؟" میں نے کہا "ترکِ وطن کا فیصلہ آسان نہیں۔ مزید برآں، پاکستان کو شروع میں اتنے مسائل کا سامنا ہوگا کہ تعلیم کی توسیع کی طرف توجہ نہ ہوگی اور مجھ جیسا آدمی وہاں کچھ نہ کر سکے گا۔" چودھری صاحب نے وثوق سے کہا "آپ کا یہ اندیشہ صحیح نہیں۔ پاکستان مسلم عوام کی پس ماندگی دور کرنے کے لیے بنا ہے اور یہ تعلیم کے بغیر ممکن نہیں۔" اُدھر کئی مخلص غیر مسلم دوستوں نے خبردار کیا کہ ۱۵ اگست کے بعد مشرقی پنجاب اور دہلی میں مسلمانوں کے قتلِ عام کا وسیع پیمانے پر انتظام ہو رہا ہے۔ لہٰذا جان کی خیر چاہتے ہو تو بلا پس و پیش پاکستان چلے جاؤ۔ جب میں نے پاکستان کی ملازمت کا عہد نامہ لکھ دیا تو قاضی عبدالغفار، ڈاکٹر ذاکر حسین وغیرہ نے منع کیا۔ اور مولانا آزاد نے مایوسی کا اظہار کیا، مگر ستمبر کے ہنگاموں میں جب قرول باغ اور اس کے اطراف میں سب مسلمان چُن چُن کر مارے گئے یا لُٹ پِٹ کر بھاگے، تو بعد کی ملاقاتوں میں ان حضرات نے کہا "میاں اچھا ہوا کہ بروقت نکل گئے ورنہ بے موت مارے جاتے۔" ان ہنگاموں میں قرول باغ کے جامعہ ملیہ کے عملے کی جان مشکل سے بچی اور ان میں کئی مثلاً مولانا اسلم جے راجپوری، حامد علی خاں وغیرہ بھاگ کر چند ماہ کے لیے کراچی آ گئے۔

۲۲ جولائی کو دہلی میں پاکستان کی انتظامیہ کی باقاعدہ تشکیل ہوئی اور ہر وزارت یا محکمے کے انچارج کا تصفیہ ہوا۔ پاکستان کونسل کے اجلاس میں مجھے طلب کر کے چودھری محمد علی نے اعلان کیا کہ فی الحال محکمۂ تعلیم کا چارج انھیں دیا جائے گا کیونکہ یہ اس عہدے کے مستحق ہیں جس کے لیے حکومتِ ہند نے انھیں تجویز کیا ہے اور جس پر حکم تعطلی کی بنا پر ہنوز عمل نہیں ہو سکا۔ ابھی مبارک سلامت کی آواز دھیمی نہ پڑی تھی کہ اگلے دن چودھری صاحب نے کسی اور کو اس عہدے

کے لیے انتخاب کیا۔ ان صاحب کا براہِ راست تعلق وزارت تعلیم سے نہ تھا، البتہ انھیں چودھری صاحب سے قرابت داری کا امتیاز ضرور حاصل تھا۔ مجھے جتنا صدمہ ہوا، دوسروں کو اس سے زیادہ تعجب ہوا۔ مولانا آزاد نے تمسخر سے کہا کہ یہ پہلی ٹھوکر ہے۔ اب بھی سنبھل جاؤ۔ تو میں یہ شعر پڑھ کر پاکستان کے لیے روانہ ہو گیا ؎

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس
برق سے کرتے ہیں روشن شمعِ ماتم خانہ ہم

پاکستان کے سفر میں جان کا جوکھم

دہلی سے ۱۰ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستانی افسروں کی جو اسپیشل ٹرین کراچی روانہ ہوئی اس کا ایک ڈبہ میرے لیے مخصوص ہوا، جس میں اہل و عیال کے ساتھ کچھ ضروری سامان کی جگہ نکل آئی۔ باقی ماندہ سامان بعد میں کچھ آیا اور کچھ ضایع ہو گیا۔ رات کے ساڑھے نو بجے پٹیالہ ریاست کی سرحد سے گذرتے ہی، ایک ایسا دھماکہ ہوا کہ انجن الگ کٹ گیا، چند ڈبوں کے گرنے کی آواز آئی اور میرا ڈبہ لرز کر کھڑا ہو گیا۔ بجلی کٹ گئی اور ہر طرف اندھیرا تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ موت کے سے سناٹے میں پاس کے جنگل میں پوشیدہ دشمن شب خون مارنے کو تیار تھے۔ بند کھڑکی کی جھلمل سے اُن کی گاڑیوں کی روشنی نظر آتی تھی اور ان کی بندوقوں کے منہ ہماری طرف کھلے ہوئے تھے۔ وہ تو خیر ہوئی کہ ہماری حفاظت کے لیے جو چند فوجی تھے، انھوں نے اپنی مشین گنوں کا منہ اسی طرف موڑ دیا، اور قاتلوں کو حملے کی جرأت نہ ہوئی۔ جب وہ فرار ہو گئے تو معلوم ہوا کہ انھوں نے ریل کی پٹری ہٹا کر ٹائم بم رکھا تھا۔ ایک عورت بچّی کے ساتھ جاں بحق ہوئی، چند لوگ زخمی ہوئے اور ہم سب رات بھر اس بیابان میں اللہ کو یاد کرتے رہے۔ قُرب و جوار میں انگریزی فوج کا کوئی دستہ باقی رہ گیا تھا۔ جب اُسے اس حادثے کی اطلاع ہوئی تو اس نے کوئی چھوٹی سی ٹرین مہیا کی، جس میں بمشکل تمام سوار ہو کر بھوکے پیاسے سماسٹہ کے راستے دوسرے دن بھادل پور پہنچے۔ پھر باقاعدہ ٹرین میں بیٹھ کر ۱۳ تاریخ کی رات کو کراچی میں دم لیا۔ اس حادثے کا ذکر ساری دنیا میں ہوا، کیونکہ پاکستان آنے والی سرکاری ٹرین

پر یہ پہلا مُسلح حملہ تھا۔ سو پھر تو یہ آئے دن کی بات ہو گئی خدا جانے کتنے بے گناہ اکالی سکھوں سیوا سنگھ کے قاتلوں، ماؤنٹ بیٹن کی بے رُخی اور پٹیل کی سرد مہری کے شکار ہوئے۔

دہلی کے پرانے باشندوں کو وہ مجذوبہ یاد ہوں گی جو "اللہ والی" کہلاتی تھیں۔ ہمارے پڑوس میں پرنسپل مشتاق احمد زاہدی کی بیگم کے پاس ان کا آنا جانا تھا، اور اس نسبت سے وہ میری بیوی کے پاس بھی آ بیٹھتی تھیں۔ اُن کی باتوں کو میں مجذوب کی بڑ کہہ کر ٹال دیتا تھا۔ جب مارچ میں میرے امریکہ جانے کا چرچا ہوا تو یہ بولیں "اے ابھی مدراس، حیدرآباد، بھاول پور اور کراچی جانا ہے۔ پھر یہ امریکہ جائے گا، بلکہ اتنا سفر کرے گا کہ تھک جائے گا۔" اس وقت تو یہ بات بے معنی لگی۔ لیکن پھر مجھے یک بیک دورہ پر مدراس اور حیدرآباد جانا پڑا۔ اور اب بھاول پور کے راستے کراچی پہنچا۔ بعد ازاں وہی ہوا جو "اللہ والی" نے کہا تھا۔

اُنھیں دنوں ایک چلتا پھرتا دست شناس احاطے میں گھس آیا اور بلا معاوضہ ہاتھ دیکھ کر کہنے لگا کہ چھ ماہ بعد دورانِ سفر تمھاری اور تمھارے خانوادے کی جان کو خطرہ پیش آئے گا۔ یہ مصیبت آئی اور خیر سے ٹل گئی۔

پاکستان کا ابتدائی دور

بہت سے سادہ لوح یہ سمجھے ہوئے تھے کہ ۱۵ اگست کو آزادی کا پرچم بلند ہوتے ہی سارا فتنہ و فساد ختم ہو جائے گا۔ ہندوستان میں رام راج اور پاکستان میں خلافتِ راشدہ کا دَور شروع ہو جائے گا۔ گویا انگریز کی عدالت میں ایک مقدمہ پیش تھا، جس کا فیصلہ فریقین بے چون و چرا تسلیم کر لیں گے۔ لیکن یہ فریب فوراً ہی ٹوٹ گیا۔ ۱۶ اگست کو ماؤنٹ بیٹن نے دہلی سے پنجاب اور بنگال کی حد بندی کا وہ اعلان کیا جو "ریڈکلف ایوارڈ" کہلاتا ہے ——— ریڈکلف کو ان صوبوں کی تقسیم کے لیے ثالث مقرر کیا گیا تھا۔ اس امر کے بیّن ثبوت موجود ہیں کہ ماؤنٹ بیٹن کے مہمان خانہ میں اس نے ۹ اور ۱۳ اگست کے درمیان اپنا کام ختم کیا اور ایوارڈ کا مُسودّہ اس کے سپرد کر کے انگلستان رفو چکر ہو گیا۔ اُس نے گُرداس پور کا مُسلم اکثریتی ضلع اور کئی تحصیلیں ہندوستان کے حوالہ کر دیں۔ اس طرح ہندوستان کی سرحد کشمیر سے مل گئی اور نہروں

کا مخزن بھی اُس کے قبضے میں آگیا۔ کشمیر کے قضیے اور نہروں کے پانی پر جھگڑے کا راستہ کھل گیا۔ کئی مبصّرین نے "ایوارڈ" میں ردّ و بدل کی ذمّہ داری ماؤنٹ بیٹن پر عاید کی ہے۔ ستمبر ۱۹۶۵ء کی ہند پاک کی جنگ کے موقع پر لندن کے مشہور اخبار منڈے ٹائمز نے جب ریڈ کلف سے پوچھا کہ گرداس پور کا ضلع ہندوستان کو دینے کا جواز کیا تھا، تو اس نے جواب دیا۔ بات اتنی پرانی ہو گئی کہ تفصیل مجھے یاد نہیں رہی۔ ع

چہ دلاور است دُزدے کہ بکف چراغ دارد

اس اعلان کے ساتھ مشرقی پنجاب کے مسلمانوں پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ لاکھوں تو اکالی سکھوں کے ہاتھوں تہ تیغ ہوئے اور چالیس پچاس لاکھ لٹ پٹ کر پاکستان کی سرحد میں دھکیل دیئے گئے۔ انگریزوں کی سرحدی فوج اور کانگریس کی حکومت تماشا دیکھتی رہ گئی۔ اتنے میں دہلی اور اس کے اطراف میں قتلِ عام شروع ہوا اور پناہ گزینوں کا ریلا کراچی اور اندرونِ سندھ پر چڑھ آیا۔

اس تباہ کاری کے ساتھ ہندوستان نے جونا گڑھ پر یہ کہہ کر فوج کشی کر دی کہ پاکستان سے الحاق کا جو فیصلہ نواب نے کیا ہے، وہ اس کی ہندو رعایا کو منظور نہیں اور کشمیر پر یہ کہہ کر حملہ کیا کہ وہاں کے مہاراجہ نے ہندوستان سے الحاق کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اس اقدام کی پرزور حمایت شیخ عبداللہ نے کی۔ اُدھر خان عبدالغفار خاں کو پاکستان سے ایسی کد تھی کہ جولائی میں کابل جا کر وہاں کے حاکموں سے یوں ساز باز کی کہ وہ روزِ اوّل سے اس کے مخالف بن بیٹھے۔ غرض اندر باہر مصائب، مسائل اور مشکلات کے سوا کچھ نہ تھا۔ اثاثے کا حصّہ کیا ملنا تھا۔ جو پچھتر کروڑ روپے کی رقم پاکستان کے حساب میں آئی تھی۔ اس کی پہلی قسط بیس کروڑ روپے منتقل ہوئی اور باقی رقم دینے سے حکومتِ ہند نے انکار کر دیا۔ اگر گاندھی جی بھوک ہڑتال نہ کرتے تو یہ رقم نہ ملتی۔ سچ تو یہ ہے کہ مسلمانوں سے ہمدردی کے الزام میں انھیں راشٹریہ سیوا سنگھ نے قتل کیا۔ شہید ہو کر انھوں نے اپنی گم شدہ عظمت واپس حاصل کر لی۔

۱۶ اگست ۱۹۴۷ء کو حکومت پاکستان نے کراچی میں باقاعدہ کام شروع کیا۔ میری طرح اور لوگ بھی اس شہر میں نو وارد تھے۔ صبح دفتر کی تلاش میں نکلے تو کسی مقامی آدمی نے آگاہ کیا کہ

پاکستان پیراڈائز سینما کے پیچھے ملے گا۔ اس طرف جا کر دیکھا تو نیم پختہ بیرکیں زیرِ تعمیر نظر آئیں اور ایک کوٹھری پر "استقبالیہ" کا بورڈ آویزاں پایا۔ جب اس کے منشی کو اپنا شناختی کارڈ دکھایا تو اس نے چابیوں کا گچھا تھما کر اشارہ کیا کہ اس دو منزلہ عمارت کو سندھ پی ڈبلو ڈی بلڈنگ کہتے ہیں۔ اس کے نچلے حصے کے فلاں فلاں کمرے "محکمۂ تعلیم" کے لیے مخصوص ہیں۔ کمروں کو کھولا تو ان میں کرسیوں اور میزوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ ہم نے دہلی سے ایک ہراول بھیج دیا تھا، جس نے کسی تدبیر سے جگہ گھیر لی تھی۔ ابھی کرسی سنبھالی تھی کہ معلوم ہوا کہ وہ مال گاڑی جو سرکاری فائلوں کا انبار لیے پاکستان چلی تھی، دہلی کے باہر نذرِ آتش کر دی گئی۔ کتابوں کا حال تو میں سنا چکا ہوں، فائلوں کا حشر یہ ہوا۔ اب سارا کام ہمیں اپنی سوجھ بوجھ سے کرنا تھا۔ بازار سے کاغذ خرید کر اور پن کے بدل ببول کے کانٹے سامنے رکھ کر ہم اپنے حالات کا جائزہ لینے لگے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس بے سروسامانی نے ہم میں جو جوش و جذبہ پیدا کیا، وہ بے مثال تھا۔ یہ دفتر گویا محاذِ جنگ کا پُشتہ تھا جہاں ہم تلوار کی بجائے قلم لیے اس امانت کی حفاظت کے لیے آمادہ تھے جو ہمیں ودیعت ہوئی تھی۔ یہ جذبہ بہتوں کے سینے میں پاکستان کے ابتدائی دور میں روشن رہا۔

کراچی اس زمانے میں بڑا صاف ستھرا شہر تھا۔ آبادی چار پانچ لاکھ سے زیادہ نہ تھی۔ کشمیر روڈ اور لیاری ندی سے پرے ریت کے تودوں کے سوا کچھ نہ تھا، اور گورا قبرستان کے آگے ہُو کا ایسا عالم تھا کہ اس کے پڑوس کے بنگلے میں رہنے سے میں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ گورِ غریباں کی چوکیداری مجھے قبول نہیں۔

نیپیئر بیرک کے ایک گھر میں بستر کھول کر میں بے خبر سویا تھا کہ گیدڑوں کی ہانے توبہ نے جگا دیا اور معلوم ہوا کہ پولو گراؤنڈ میں ان کا مستقل بسیرا ہے۔ شروع شروع میں شہر میں بڑا امن چین تھا اور اہلِ سندھ نے مہاجروں کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ بات تب بگڑی، جب لوگ جان بچانے نہیں بلکہ مال بنانے کے لیے دندناتے ہوئے آئے اور تارکینِ وطن و مقامی باشندوں کے مفاد میں رسّہ کشی شروع ہوئی۔

بصد مشکل حکومت کا ابتدائی ڈھانچا کھڑا ہی ہوا تھا اور نصف کروڑ ہندو اور سکھ اپنی منقولہ ملکیت لے کر سرحد پار ہوئے تھے اور ان کی جگہ اتنے ہی شکستہ حال مسلم مہاجروں نے

سنبھالی تھی کہ سال بھر بعد قائداعظم انتقال فرما گئے۔ ملک کی بنیاد رکھی گئی تھی کہ معمار اُٹھ گیا۔ لیاقت علی خاں نے اُن کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کی اور اس سفر میں جب وہ جاں بحق ہوئے تو پاکستان اس بحران میں مبتلا ہو گیا جو بیس سال بعد اُس کی تقسیم کا باعث ہوا۔

اس بحران کے اسباب صاف ظاہر ہیں۔ ایک تو یہ کہ مسلم لیگ کے پاس آزاد پاکستان کی تعمیر کا کوئی منصوبہ نہیں تھا۔ دوسرے یہ کہ پاکستان اتنی جلدی اور ان حالات میں بنا کہ اس کا بچ رہنا معجزے سے کم نہیں۔ آزادی کے وقت ہندوستان کو پاکستان پر کئی لحاظ سے سبقت حاصل تھی۔ لیکن اندرونی خلفشار کی کمی نہیں تھی۔ وقت کے ساتھ اگر وہاں سیاسی بحران پر قابو پا لیا گیا، تو اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ عنانِ حکومت ۳۰ سال تک (۱۹۴۷ء سے ۱۹۷۷ء تک) کانگریس کے ہاتھ میں رہی جس نے پالیسی میں تسلسل اور مرکز اور صوبوں میں رابطہ برقرار رکھا۔ مسلم لیگ کا دارومدار قائداعظم کی شخصیت اور مسلمانانِ ہند کے اس سیاسی شعور پر تھا جو ۱۹۴۳ء سے ۱۹۴۷ء تک غیر مسلم تسلط سے نجات کا طالب رہا۔ تنظیمی اعتبار سے پاکستانی علاقے میں مسلم لیگ کی جڑیں کمزور تھیں اور یہ کمزوری لیاقت علی خاں کی شہادت کے بعد ہی ظاہر ہو گئی۔ اب جو سیاسی خلا پیدا ہوا اسے نوکر شاہی اور فوجی آمریت نے پُر کرنے کی کوشش کی، اور بے چارے ملک کی حالت اُس یتیم کی ہو گئی جو والدین کے انتقال کے بعد چیرہ دست ملازموں کے رحم و کرم کا محتاج ہو جائے۔

لیاقت علی خاں کے دورِ حکومت میں اگر آئین بن جاتا، جائدادِ متروکہ کا قضیہ بلا تاخیر ختم کر دیا جاتا اور سرکاری ملازمتوں میں صوبائی تخصیص کے اصول کو ختم کر دیا جاتا، تو ملک اس سیلابِ بلا سے بڑی حد تک محفوظ رہ جاتا جس سے وہ دوچار ہوا۔ ان تینوں مرحلوں کو ہندوستان نے ابتدائی دور میں بلا دقت طے کر لیا تھا۔ جنگِ عظیم کی ہولناک تباہ کاری کے باوجود یوگوسلاویہ نے قلیل مدت میں آئین مرتب کر لیا تھا جو لسانی اور مذہبی اختلافات کے باوجود تیس سال سے بحسن و خوبی کارفرما ہے اور مغربی جرمنی نے مشرقی جرمنی کے ایک کروڑ جرمن مہاجروں کو اپنے دامن میں سمو لیا تھا۔ اگر پاکستان اس آزمائش میں ناکام رہا تو اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ ملک پر مفاد پرستوں کی گرفت شروع ہی میں مضبوط ہو گئی تھی۔ متروکہ جائداد

زہرِ قاتل کی طرح معاشرے میں داخل ہوگئی اور حرص وہوس کا بازار ایسا گرم ہوا کہ لوگوں کا حلیہ بدل گیا۔ نو دولتیوں، شعبدہ بازوں اور گرہ کٹوں کی بن آئی۔ بارہا وحشت کے عالم میں اس اجنبی شہر کی سڑکوں پر آوارہ گردی کرتے ہوئے میں اکڑی ہوئی گردنوں، ریش نما تزویر کی کمندوں اور بیگموں کو چھبیلی بھٹیاریوں کے روپ میں رواں دواں دیکھتا رہتا تھا۔ اس طلسمِ نظر کو آغا اشرف (مرحوم) نے یہ کہہ کر توڑا۔ جب یہ مان لوگے کہ ۱۹۴۷ء میں سب کا نیا جنم ہوا ہے تو بات صاف ہو جائے گی۔

یہ قول کئی لحاظ سے صحیح تھا۔ صوبائی عصبیت کا جن بوتل سے یوں نکلا کہ قومی وحدت خواب وخیال ہوگئی۔ اور دھرتی کے سپوت SON OF THE SOIL کی شورفشانی کے آگے ہم جیسوں کی آواز سست پڑ گئی۔ پھر یہ ظاہر ہونے لگا کہ مسلمانوں کا تہذیبی ورثہ وہ نہیں تھا جو تحریکِ پاکستان کے وقت بیان کیا گیا تھا، اور اسلامی قدریں وہ نہیں تھیں جن کی تشریح علامہ اقبال اور قائداعظم نے کی تھی۔ گویا ان کی تفسیر قبائلی سرداروں، جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے پاس تھی اور جو بھی ان کے مفاد کا مخالف تھا، وہ قوم وملک کا مخالف ٹھہرایا گیا۔

قیامِ پاکستان کے چند ماہ بعد سجاد ظہیر سے کراچی میں ملاقات ہوئی۔ یہ وہ وقت تھا، جب کمیونسٹ سیاست نے متحدہ محاذ کی پالیسی ترک کرکے وہ روش اختیار کی تھی جو زیڈنوف لائن کہلائی۔ اس کے مطابق وہ اہلِ قلم اب ترقی پسند نہیں رہے جو اس سیاست سے بے تعلق ہوں۔ میں نے انھیں سمجھایا کہ اس نوزائیدہ ملک کو استحکام کی ضرورت ہے اور یہاں قبائلی اور جاگیرداری نظام ایسا مضبوط ہے کہ پیش بیں اور روشن خیال عناصر کا اتحاد ترقی پسندی کا ضامن ہو سکتا ہے۔

بات کہاں سے کہاں چلی گئی۔ شملہ کے گارٹن کاسل اور نئی دہلی کے نارتھ بلاک، کو چھوڑ کر میں ایک بوسیدہ عمارت کے خالی کمرے میں بیٹھا ہوا تھا کہ ۲۶ اگست کو مسٹر فضل الرحمٰن کا تقرر وزیرِ تعلیم و داخلی امور کی حیثیت سے ہوا۔ چند ماہ بعد امورِ داخلہ کی بجائے تجارت کا شعبہ ان کے سپرد ہوا۔ تقریباً ساڑھے پانچ سال ان سے سابقہ رہا۔ ان کا تعلق مشرقی بنگال سے تھا۔ لیکن وہ

صحیح معنوں میں محبِّ وطن تھے اور تعلیم سے انھیں از حد شغف تھا۔ پہلے ہی دن انھوں نے مجھے طلب کیا اور دیر تک پاکستان کے تعلیمی مسایل پر گفتگو کرتے رہے۔ نتیجہ برایں نومبر میں وہ تاریخی تعلیمی کانفرنس منعقد ہوئی جسے ملک کی تعلیمی تاریخ کا حرفِ آغاز کہنا چاہیئے۔ اس میں پاکستان کے سربرآوردہ ماہرینِ تعلیم نے شرکت کی تھی اور سکریٹری کے فرایض میں نے انجام دیے تھے۔ اس کی مفصل مطبوعہ رپورٹ کو کوئی دیکھے تو اس میں ہر نہج سے تعلیمی پالیسی کے نقوش نظر آئیں گے۔ کانفرنس کی سفارش پر صوبائی تعلیمی وزارتوں اور یونیورسٹیوں میں ہم آہنگی کے لیے دو الگ الگ بورڈ بنے جن کی تشکیل میں نے ہی کی اور ان کے سالانہ جلسوں کا انتظام میرے ہی سپرد ہوتا تھا۔ یونسکو سے تعاون کے کمیشن اور تاریخ و ملفوظات کے کمیشن کی تشکیل بھی میرے ہی ذمّہ ہوئی۔ کراچی میں نظامتِ تعلیم، ثانوی تعلیم کے بورڈ اور یونیورسٹی کے ابتدائی مراحل سے گہرا سروکار رہا۔ مختلف ثقافتی انجمنوں کے قیام، علمی و ادبی انجمنوں کی گرانٹ وغیرہ خدا جانے کتنے کاروبار میرے سپرد ہوئے۔ کراچی کے ساتھ بلوچستان اور سرحد کے قبائلی علاقوں کی تعلیمی ذمّہ داری براہ راست ہماری وزارت کے سپرد تھی۔ ہم مٹھی بھر افسر چھوٹے سے عملے اور محدود وسائل کے بوتے کس طرح ان امور سے عہدہ برآ ہوتے تھے۔ یہ خدا ہی جانتا ہے۔ سالہا سال صبح سے شام اور کبھی رات تک، اکثر اتوار کی تعطیل کو خیرباد کہہ کر ہم لوگوں نے یہ خدمت انجام دی۔ لیکن اس وقت کی وزارتِ مالیات کی نظر میں تعلیم کی کوئی حقیقت نہ تھی۔ حکّام بالادست آزادی اور ترقی کے تقاضوں کو کیا سمجھتے، انگریزوں کی ذہنیت ان میں بسی ہوئی تھی۔ ہمارے پہلے سکریٹری سول سروس کے رکن تھے۔ جب کوئی تعلیمی مسئلہ درپیش ہوتا تو چپراسی سے کہتے۔ ایجوکیشن والوں کو بلاؤ اور وہ مردِ معقول مجھ سے کہتا۔ "حضور کی طلبی ہوئی ہے"۔ جب میں عذر کرتا کہ ایجوکیشن والے اور لوگ بھی ہیں، تو وہ مُصر ہوتا، مراد آپ سے ہی ہے ؎

یوں پکاریں ہیں مجھے کوچہ جاناں والے
ادھر آ بے ابے او چاک گریباں والے

غلام محمد نے ۱۹۵۳ء میں جب خواجہ ناظم الدین کی کابینہ اور قومی اسمبلی کو برطرف کیا تو پاکستان کی بنیاد ہل گئی۔ پھر اس نے مغربی پاکستان کے صوبوں کو مدغم کر دیا تو اس کے پہلو نشین

کہنے لگے کہ مشرقی پاکستان کی متوقع علحدگی کے پیشِ نظر یہ اقدام کیا گیا ہے۔ اس انتظامی تبدیلی کی وجہ سے ہماری وزارت کا دائرہ کار محدود ہو گیا اور جب آئین مرتب ہوا جسے سکندر مرزا نے کالعدم قرار دیا تو وزارت کی حیثیت ہی ختم ہو گئی۔ ۱۹۵۵ء تک میرے ذہن میں خیال بھی نہ آیا تھا کہ کسی غیر ملکی ادارے کی ملازمت اختیار کروں۔ امریکہ کی کولمبیا یونیورسٹی نے کچھ وقت کے لیے پروفیسری پیش کی۔ اور پروفیسر بخاری نے اقوام متحدہ کے محکمہ اطلاعات میں اسامی نکالی لیکن میں نے انکار کر دیا۔ وزارتِ تعلیم میں ڈپٹی سکرٹری، نیز ثانوی تعلیمی بورڈ کے صدر کے فرائض انجام دیتا رہا لیکن ۱۹۵۵ء کے آخر میں ایسا لگتا تھا کہ برادرانِ وطن اس تیزی سے خلافتِ راشدہ کی طرف لپکے کہ دو قدم آگے بڑھ گئے یعنی ابوجہل کو غلبہ حاصل ہو گیا۔ چنانچہ یونیسکو نے جب میری خدمات طلب کیں تو میں پیرس چل پڑا۔ اس وقت یہی طے پایا تھا کہ دو تین سال کے بعد وزارت میں لوٹ آؤں گا۔ لیکن لگ بھگ ۱۷ سال یونیسکو کی ملازمت میں گزار دیے اور اب اسی کا وظیفہ خوار ہوں۔

برِصغیر کی تقسیم دورِ جدید کا ایک ایسا اہم واقعہ ہے کہ اس کے اسباب و جواز پر مؤرخ مدتوں بحث کرتے رہیں گے۔ یوں ہوتا تو کیا ہوتا۔ قوم یا فرد کی کتابِ زندگی کا ایک مستقل عنوان ہے۔ جب ہم پیچھے مڑ کر دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں کہ اگر فلاں غلطی نہ ہوتی تو پہلی جنگِ عظیم نہ ہوتی اور فلاں ترکیب کی جاتی تو گزشتہ جنگِ عظیم ٹل جاتی۔ لیکن تجزیہ بتلاتا ہے کہ اجتماعی زندگی کا کوئی بڑا بحران کسی ایک نکتہ یا واقعہ پر شروع یا ختم نہیں ہوتا۔ یہی تاریخی منطق برِصغیر کی تقسیم پر عاید ہوتی ہے۔ اس کے اثرات کو افراد نے عموماً ذاتی نفع و نقصان کے مطابق قبول کیا۔ لیکن ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں تھی، جن کے لیے پاکستان الاٹ منٹ کا دفتر یا مالِ غنیمت کا انبار خانہ نہیں تھا۔ وہ اسے ان قدروں کا امین سمجھتے تھے جو اسلام کے اوّلین دور پر نقش تھیں۔ یہ لوگ ان قدروں کی روشنی میں قومی زندگی کی تعمیر کے خواہاں تھے لیکن استعمار اور رجعت کی سازش نے اس مشعل کو بجھا دیا۔

دُنیا بدل گئی

۸

عصرِ قدیم کی دیومالا میں ایک پرندے کا ذکر آیا ہے۔ جو آگ میں جل کر حیاتِ تازہ حاصل کرتا تھا۔ جس فرد یا قوم میں یہ صلاحیت نہ ہو کہ آگ میں پک کر جھلسنے کی بجائے نئی آب و تاب میں سرخرو ہو جائے اُس کی قسمت فنا کے سوا کچھ نہیں۔ شمالی یورپ کے وحشی قبیلوں کے ہاتھوں سلطنتِ روما ایسی دفن ہوئی کہ پھر نہ اُبھر سکی اور وہ برِّاعظم صدیوں اس قعرِ مذلّت میں پڑا رہا جسے "دورِ ظلمت" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ یہی حال منگولوں کی یلغار کے بعد عرب معاشرے کا ہوا تھا لیکن گزشتہ جنگِ عظیم کی تباہ کاری کے بعد ہم نے مغرب و مشرق کے ممالک کو قلیل مدّت میں تعمیر و ترقی کی منزلیں طے کرتے دیکھا۔ یہ جدید انسان کے عزم اور حوصلے کا کرشمہ اور سائنس و صنعت سے استفادے کا اعجاز ہے۔ اس کی پہلی مثال مجھے جرمن شہر میونخ میں نظر آئی۔

۱۹۴۸ء کے وسط میں مَیں حکومت پاکستان کے نمائندے کی حیثیت سے جنیوا کی بین الاقوامی تعلیمی کانفرنس میں شرکت کے لیے جا رہا تھا کہ پین امریکن طیارہ انجن کی خرابی کی وجہ سے ناگہاں دوپہر کے وقت میونخ رُک گیا۔ اتحادیوں کی بمباری نے شہر کو تقریباً نیست و نابود کر دیا تھا اور ہر طرف شکستہ مکانوں اور ملبے کے انبار میں سرگرداں برہنہ پا بوڑھی اور تار تار پیراہن میں نیم عریاں

عورتوں کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا۔ دس سال بعد جب مجھے دوبارہ میونخ جانا پڑا تو شہر بڑی حد تک آباد ہو چکا تھا اور اس کی عمارتوں اور سڑکوں پر ایسی رونق تھی گویا یہاں کوئی آفت نازل نہ ہوئی ہو۔ میرے لیے یہ باور کرنا مشکل تھا کہ ایک شکست خوردہ حکومت اور بے سروسامان قوم نے اتنی سرعت سے شہر کی تعمیرِ نو کر لی ہو۔ اتفاق سے میری ملاقات ایک امریکن سے ہوئی جس نے اپنا تعارف اس طرح کرایا "اپریل ۱۹۴۵ء کا ذکر ہے جب ہٹلر نے خودکشی کر لی اور اس کی باقی ماندہ فوج نے ہتھیار ڈال دیے۔ اس وقت جس امریکی فوج نے میونخ پر قبضہ کیا میں اس کا ایک افسر تھا۔ جنگ کی بربادی کے باوجود شہر کا خاصا حصہ ابھی باقی تھا اور اس میں باشندوں کی اچھی خاصی تعداد تھی۔ اتنے میں ہمارے جنرل نے حکم دیا کہ جنگ ختم ہو چکی مگر یہ گولہ بارود واپس کہاں لے جائیں کیوں نہ اسے اس شہر کی نذر کر دیں۔ اس کے حکم کی دیر نہ تھی کہ ہزاروں توپوں کے دہانے کھل گئے اور چند گھنٹوں میں میونخ کی اینٹ سے اینٹ بج گئی۔ یہ غارت گری اس قدر لاحاصل تھی کہ میرا ضمیر تاب نہ لا سکا اور فوج کی ملازمت سے علیحدگی کے بعد میں نے تہیہ کیا کہ باقی زندگی میونخ کی تعمیرِ نو پر صرف کر دوں گا۔ کئی سال قبل میں اس غرض سے یہاں آ کر بس گیا تاکہ اس گناہ کا کفارہ ادا کروں۔ جس شہر کو ہم نے اجاڑا تھا اُسے دوبارہ بسانے میں ہاتھ بٹاؤں۔" اُس نے مجھے بتایا کہ جرمنی کا ہر فرد فرصت کے وقت رضاکارانہ یہ خدمت انجام دیتا تھا۔ یہی جذبہ تھا جس نے نہ صرف جرمنی بلکہ جنگ کے زخم خوردہ ہر ملک کو نئی زندگی بخشی۔

اس موقع پر مجھے اپنے ملک کا ایک واقعہ یاد آیا جو ۱۹۵۰ء کے لگ بھگ اُس وقت پیش آیا جب مہاجروں کے قافلے کراچی کی سڑکوں پر بڑے فرشتوں کی آمد کا انتظار کر رہے تھے۔ انگلستان کے چند رضاکار انھیں یہ بتلانے کی کوشش کر رہے تھے کہ خود اپنی محنت سے برائے نام خرچ پر وہ معمولی قسم کے رہائشی مکان بلا دقت بنا سکتے ہیں۔ لیکن اس کارِ خیر میں نہ اُنھیں کوئی رضاکار ملے اور نہ کسی نے ان سے تعاون کیا۔ ہماری پستی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ خدا اور حکومت پر ساری ذمہ داریاں ڈال کر ہم آسانی سے بری الذمہ ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ جمود، بے حرکتی اور بے حسی کا جو تماشا یہاں نظر آتا ہے وہ شاید و باید کہیں اور دکھائی دے گا۔

اس میں شک نہیں کہ جنگ کے بعد مغرب میں طاقت کا محور یورپ سے ہٹ کر امریکہ منتقل ہو گیا اور اگر امریکہ کی پشت پناہی نہ ہوتی تو روس سے بڑھتے ہوئے انقلاب کا سیلاب مغربی یورپ کو بہالے جاتا۔ لیکن وقت نے اس پیش گوئی کو غلط ثابت کر دیا کہ سرمایہ داری کی اندرونی کش مکش اور سمندر پار کی نوآبادیوں کی آزادی کے بعد مغربی یورپ کا پرانا معاشرہ لامحالہ منہدم ہو جائے گا اور اس کی جگہ انقلاب کا پرچم لہرائے گا۔ فلاحی ریاست کی تشکیل نے جمہوریت کو باقی رکھتے ہوئے اشتراکیت اور سرمایہ داری کا ایسا سنگم بنایا کہ عوام نے انقلاب سے منھ موڑ لیا۔ یہ حال اس مغربی یورپ کا ہوا جسے کارل مارکس کے خیال میں انقلاب کا علم بردار ہونا چاہیئے تھا۔ آبادی کی افزائش کو کم کر کے اور صنعتی و زراعتی دولت کو فروغ دے کر نیز سیاسی و معاشی اداروں کو مستحکم کر کے مغربی یورپ نے وہ راستہ اختیار کیا جو باہمی رقابتوں کو بالائے طاق رکھ کے ایک متحد وفاق کی منزل کی طرف جاتا ہے۔ اس اتحاد کا بنیادی مقصد روس کی سیاسی اور امریکہ کی اقتصادی بالادستی کا مقابلہ کرنا تو ہے ہی، علاوہ بریں تیسری دنیا کے نوآزاد ملکوں کی منڈیوں پر عمل دخل رکھنا بھی ہے۔

یہ جدوجہد جس طرح اقوام متحدہ کو اثرانداز کرتی ہے اس کا تجربہ میں نے یونسکو کی طویل ملازمت میں حاصل کیا۔ تقریباً سترہ سال میرا رتبہ ہمیشہ ڈپلومیٹ کا رہا اور صوالیہ اور ایران میں یونسکو کے سربراہ کی حیثیت سے میرا منصب سفیر کا تھا۔ اس طرح مجھے ان محرکات کو قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا جو امیر اور غریب ملکوں کے رشتوں کو متاثر کرتے ہیں۔ مختلف ممالک کے باشندوں کے ساتھ کام کرتے کرتے ان کے مزاج کے تجزیے کا موقع بھی ملا۔ اس سلسلے میں جن نازک مراحل سے گزرنا پڑا اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایران میں میری نگرانی میں جو تیس ۳۰ غیر ملکی ماہر ملک کے مختلف حصوں میں کاربند تھے۔ ان میں امریکی، روسی، انگریز، فرانسیسی، ہندوستانی، غرض کہ ہر کینڈے کے لوگ تھے۔ طوالت کے خوف سے میں ان کے اطوار و خصائل کو نظرانداز کر کے آگے بڑھتا ہوں۔

۱۹۵۶ء کے شروع میں جب میں پیرس پہنچا تو یونسکو کا دفتر پیرس کی مشہور شاہراہ "شانزالیزے" کے قریب ایک وسیع عمارت میں تھا۔ جنگ سے پہلے یہاں ہوٹل میجسٹک ہوا کرتا تھا جو تسخیر فرانس کے بعد جرمن فوجی حکومت کا مرکز قرار پایا۔ بعد از جنگ حکومت فرانس نے اس عمارت کو ضبط کر کے یونسکو کے حوالے کر دیا۔ ۱۹۵۹ء میں جب ہمارا ادارہ اپنی عالیشان عمارت میں نپولین کے مقبرے کے پاس منتقل ہو گیا تو پرانی جگہ کو حکومت نے بین الاقوامی جلسوں کے لیے مخصوص کر دیا۔

اس زمانے میں فرانس میں جو پاکستانی سفیر تھے ان کا نام میر خان تھا۔ یہ بزرگ حیدرآباد دکن کے باشندے تھے اور غلام محمد کو تب سے جانتے تھے جب ریاست کی وزارتِ خزانہ کا قلمدان ان کے پاس تھا۔ ریاست کی غارت گری کے بعد یہ پاکستان آ گئے اور غلام محمد کی سفارش پر سفیر بنا دیے گئے۔ نظام دکن میر عثمان علی خاں کی کنجوسی کا کچھ اثر انھوں نے بھی قبول کیا تھا۔ بڑی سی کوٹھی میں وہ تنہا رہتے تھے۔ البتہ خدمت پر دو حیدرآبادی ملازم تعینات تھے۔ پیرس میں اپنی طرف کے بلا اطلاع آنے والے بے بلائے مہمانوں کی کمی نہیں ہوتی۔ ان سے بچنے کا نرالا طریقہ میر خاں نے یہ نکالا تھا کہ مہمان کے آتے ہی وہ دوسرے پر چلے جاتے اور نوکر مہمان سے کہہ دیتے کہ گھر میں نہ کھانے کا انتظام ہے نہ چائے کا، اور اگر مہمان مُصر ہوتا کہ پیسے لے کر بازار سے سودا لے آؤ تو وہ انکار کر دیتے اور کہتے کہ صاحب ناراض ہوں گے کہ مہمان سے پیسے کیوں لیے۔ ایک دو دن میں بیچارا مہمان اس طرح زچ ہوتا کہ سامان اٹھا کر کہیں اور چلا جاتا۔

یورپ کو سب سے پہلے جس نے ستار سے آشنا کیا اس کا نام عنایت خان تھا۔ یہ صاحب اوّل جنگ عظیم سے کچھ پہلے وہاں پہنچے تھے اور اپنے فن کا مظاہرہ کیا تھا۔ یہ ساز اہلِ یورپ کے لیے اتنا انوکھا تھا کہ ان کے کانوں کو نہ بھایا، البتہ ایک مال دار امریکن خاتون کے دل پر ایسا اثر ہوا کہ عنایت خان پر فدا ہو گئیں اور ان سے شادی کر لی۔ پھر تو انھوں نے ہندوستان کا خیال چھوڑا اور ہالینڈ میں رس بس گئے۔ انھوں نے ستار سے ہاتھ کھینچ کر تصوّف کا راگ چھیڑا۔ یہ نہیں معلوم کہ انھیں تصوّف میں کتنا درک تھا مگر ان کی شخصیت میں

ایسی کشش تھی کہ کئی لوگ ان کے مرید بن گئے۔ عنایت خان کے انتقال کے بعد ان کے دونوں بیٹوں یعنی ہدایت اور ولایت نے اس تحریک کو خوب ہوا دی اور یورپ کے کئی شہروں میں صوفی سینٹر قایم کر دئے۔ ولایت سے میری ملاقات پیرس میں ہوئی۔ اس وقت وہ مشرقی علوم سے قطعاً ناواقف تھے اور تصوّف سے ان کی واقفیت چند مغربی کتابوں تک محدود تھی۔ میری ترغیب پر وہ صوفیوں کی تلاش میں ترکی، ایران اور پاکستان تک آئے لیکن انھیں کوئی مرشدِ کامل نہ ملا۔ تاہم وقت کے ساتھ ان کے مطالعے اور تجربے میں پختگی آتی گئی۔ ان کی بہن نورا کو گزشتہ جنگ عظیم میں انگریزوں کی جاسوسی کی پاداش میں جرمن حکومت نے سزائے موت دے دی تھی۔

اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ یہ وہ بزرگ عنایت خاں نہیں ہیں جن کے ہم نام نے ستار نواز کی حیثیت سے گزشتہ جنگ سے قبل شمالی ہند میں شہرت حاصل کی اور ان کے ہر دو فرزند ولایت خان اور امرت خان جیسے ستار نواز فی زمانہ برِّصغیر میں نہیں ملیں گے۔

فرانس کو اپنی سامراجی وجاہت اور عسکری قوت پر جو ناز تھا اسے جنگِ عظیم کی ذلّت آمیز شکست نے ختم کر دیا۔ ملک کا شمالی حصّہ جو میدانِ کارزار رہ چکا تھا ہنوز مرمّت اور مرہم پٹّی میں سرگرداں تھا۔ فوج ہند چینی کی ہزیمت کا انتقام الجزائر کے عربوں سے لے رہی تھی جنھوں نے آزادی کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دی تھی۔ یہ وہ فرانس نہ تھا جسے میں نے زمانۂ طالب علمی میں دیکھا تھا۔ اب معلوم ہوا کہ فرد یا قوم کا کوئی مستقل مزاج نہیں ہوتا اور اس کا روپ حالات کے ساتھ بدلتا رہتا ہے۔ کسی کو یہ باور کرانا ناممکن تھا کہ فرانس کی طرح الجزائر کو بھی آزادی کا حق حاصل ہے اور نسلی عداوت ہر حال میں مذموم ہے۔ خواہ وہ نازیوں کو یہودیوں سے ہو یا فرانسیسیوں کو الجزائر کے عربوں سے۔ فرانس میں مقیم عربوں کی جان تو ضیق میں تھی ہی، ہم جیسوں کی بھی مشکل تھی جن پر رنگ کی وجہ سے عرب ہونے کا شبہ ہو سکتا تھا۔ پولیس والے الجزائر کی خفیہ تنظیم کی ٹوہ میں رہتے تھے اور اس کے اراکین کو قہوہ خانوں میں ڈھونڈتے پھرتے تھے۔ اس شبہے میں دو چار بار میرے شناختی کاغذات کا بھی معائنہ ہوا۔ مشہور ہندوستانی صحافی خوشونت سنگھ (ہندوستان ٹائمز دہلی کے سابق مدیر) میرے ساتھ

یونسکو میں کام کرتے تھے ان کے لڑکوں کی گوشمالی راہ چلتے فرانسیسیوں نے اس شبہے میں کی کہ وہ الجیرین ہیں، حالانکہ وہ سر پر پگڑی باندھے ہوئے تھے۔ جنگ کی شکست، سامراج کی پامالی اور اقتصادی بدحالی نے ایسی بے یقینی کی فضا پیدا کر دی تھی کہ ہر تیسرے چوتھے مہینے حکومت بدل جاتی تھی۔ تاہم انتظامی ڈھانچے کی بنیاد اتنی مضبوط تھی اور کارپردازوں میں فرض شناسی کا احساس اتنا گہرا تھا کہ رشوت، غبن، چور بازاری اور سماجی جرائم کا نام بہت کم سننے میں آتا تھا۔ یہ انتشار ۱۹۵۸ء میں ختم ہونے کو آیا جب جنرل ڈیگال نے سیاست سے کنارہ کشی کے عہد کو توڑ کر دوبارہ زمامِ حکومت کو اپنے ہاتھ میں لیا۔ اس سال کا مئی کا مہینہ مجھے یاد ہے جب اپنے گاؤں سے آکر وہ ہمارے دفتر کے مقابل ایک ہوٹل میں ٹھہرے۔ ہر شام میں ان کو اپنے مقربین کے ساتھ ہوٹل کے دیوان خانے میں دیکھتا۔ چند روز بعد ہی وہ فوج کی مدد سے ملک کے صدر بن گئے اور فرانس کو جو تازہ زندگی بخشی وہ عصرِ حاضر کا اہم واقعہ ہے۔ ڈیگال کی دور اندیشی، دلیری اور خلوص کا اعتراف سبھی نے کیا ہے۔ تحریر و تقریر پر ان کی مہارت مسلّم تھی اور ان کی خود نوشت سوانح عمری کو شاہکار کا مرتبہ حاصل ہے۔ یہ انھیں کا زمانہ تھا کہ فرانس کی فوج اور عوام کی مخالفت کے باوجود الجزائر کی آزادی کا اعلان ہوا اور نیٹو کے مرکز کو ملک سے نکال کر امریکہ کے تسلّط کا جوا فرانس کے کاندھوں سے اُتار دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ڈیگال کی ہیبت ایسی چھائی کہ فاحشہ عورتوں کے غول یا تو سڑکوں سے خود بخود غائب ہو گئے یا محتسبوں نے انھیں حلال روزی کمانے پر مجبور کر دیا۔ ڈیگال اس طنزِ لطیف کے بھی ماہر تھے جو فرانسیسی تہذیب کا خاصہ ہے۔ صدر کینیڈی کی اہلیہ جیکولین بزعم خود آرٹ کی ماہر بنتی تھیں۔ پیرس کے دلآویز کلیسا "نوترے دام" (مریم) کی زیارت کو گئیں اور ڈیگال سے کہا، اس عمارت کی تعمیر میں کثیر رقم صرف ہوئی ہوگی۔ ڈیگال نے مسکرا کر جواب دیا اس کی تعمیر میں ہزاروں سال کی تہذیب صرف ہوئی ہے۔ نئے یورپ میں جو انسان رہتا ہے وہ کئی لحاظ سے اپنے پیشرو سے مختلف ہے۔ جنگِ عظیم سے پہلے روزمرّہ کی زندگی ویسی سخت اور گراں نہ تھی جیسی اب ہے۔ بنابریں اُس دور کے انسان میں رواداری اور مروّت زیادہ تھی۔ اب قدروں اور نظریوں کی جگہ مال و اسباب کی ہوس نے

لے لی تھی اور نفاست کے بدلے کرختگی کا دور دورہ تھا۔ فرانس کے عظیم دانشور "سارت" (سارتر) سے جب میرا تعارف یہ کہہ کر کرایا گیا کہ میں جنگ سے پہلے پیرس یونیورسٹی کا طالب علم تھا تو انھوں نے فوراً پوچھا "اس پیرس اور آج کے پیرس میں تم کیا فرق پاتے ہو"۔ میں نے بلا تامّل جواب دیا "آج کی زندگی میں قدروں کا نام و نشان نہیں ملتا"۔ سارت (سارتر) نے ہنس کر جواب دیا "نئے انسان کی نظر میں کپڑے دھونے کی مشین قدروں سے زیادہ مفید ہے"۔

معاشی مسائل کا تجزیہ اگر خالص مادّی نقطۂ نظر سے کیا جائے تو یہی کہا جائے گا کہ پیداوار کے وسائل پر افراد کا نہیں، بنی نوع انسان کا اختیار ہو کہ اسی کی خوش حالی اور ترقی کے لیے انھیں بطریقِ احسن استعمال کیا جا سکے۔ عصرِ حاضر کے اس نظریے سے اختلاف کی گنجایش نہیں خواہ اس پر عمل ہوتا ہو یا نہ ہوتا ہو، تاہم یہ سوال اپنی جگہ الگ ہے کہ معاشرے میں فرد کا مقام کیا ہے اور کیا اس کا مقدر فقط یہ ہے کہ وہ کسی حکومت، ادارے یا عقیدے کا دائمی اسیر بن جائے۔ یہ سچ ہے کہ فرد کا یہ زعم مضحکہ خیز ہے کہ وہ دنیا کا محور ہے اور یا یہ کہ یہ حقیر کرۂ ارض کائنات کا محور ہے، لیکن اسے کیا یہ حق نہیں ہے کہ ایسے ماحول میں رہے جہاں وہ اپنی تعمیری اور تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لا سکے اور معاشرے اور فرد کے رشتے میں صحت مندانہ توازن پیدا کر سکے۔ بالفاظ دیگر کیا اشتراکیت اور جمہوریت کے مطالبات میں کوئی بنیادی اختلاف ہے۔ ذاتی طور پر میں باور کرتا ہوں کہ یہ تضاد عارضی ہے اور آنے والی نسلیں ان دونوں تحریکوں کے سنگم میں راہِ نجات پالیں گی۔

کہنے کو تو گزشتہ جنگِ عظیم کے بعد سامراجیت کا طلسم ٹوٹ گیا اور نوآبادیوں کو سیاسی آزادی مل گئی۔ اب یہ نوآزاد ملک جن کی تعداد ایک سو سے زیادہ ہے اور جو لاطینی امریکہ، افریقہ اور ایشیا کے برّاعظموں کو تیسری دنیا کے لبادے میں لپیٹے ہوئے ہیں، یہ بھی نام کا فریب ہے ورنہ حقیقتاً یہ کرۂ ارضی فقط دو حصّوں میں بٹا ہوا ہے یعنی امیر ممالک جو صنعتی انقلاب سے گزر چکے خواہ انھوں نے اشتراکیت کا راستہ اختیار کیا ہو یا سرمایہ داری کا۔ تیسری دنیا سے مراد وہ غریب ممالک ہیں جو زراعتی نظام سے صنعتی نظام کی طرف بڑھنے کی کوشش کر رہے

ہیں، خواہ چین کی طرح انھوں نے اشتراکیت کا راستہ اختیار کیا ہو یا جنوبی ایشیا کی طرح سرمایہ داری کا۔ بہر صورت تیسری دنیا کی بیچارگی کا یہ حال ہے کہ اپنے پرانے آقاؤں سے فنی یا مالی امداد کے طلبگار ہیں، مگر یہ پرانے گھاگ کیوں چاہیں گے کہ پسماندہ ممالک صنعتی ترقی کر کے ان کے حریف بن جائیں۔ چنانچہ مغربی ممالک کے اتحاد کا مقصد صرف یہی نہیں ہے کہ اشتراکیت کی یلغار کو روکے بلکہ یہ بھی ہے کہ تیسری دنیا میں اتحاد نہ پیدا ہونے دے۔ ہم کتنا بھی سر ماریں لیکن غریب ممالک کو درپیش سنگین مسائل کا تب تک مستقل حل دریافت نہیں کر سکتے جب تک یہ نہ سمجھ لیں کہ اس چھوٹے سے کرۂ ارض کو مصنوعی طور پر سیکڑوں چھوٹی بڑی ریاستوں میں تقسیم کر کے انسان نے فطرت کے اس قانون کو منسوخ کر دیا کہ اس دنیا اور اس کے وسائل پر سب انسانوں کا مساوی حق ہے اور دولت کی منصفانہ تقسیم ممالک کے درمیان اتنی ہی ضروری ہے جتنی ملک کے اندر۔

لیکن متاسفانہ اس تلخ حقیقت سے گریز ممکن نہیں کہ دورِ جدید کی سیاست کا مرکز قومیت ہے۔ مالدیپ کی آبادی ایک لاکھ سہی لیکن وہ بزعم خود اپنے قومی تشخص پر اتنا ہی نازاں ہے جتنا چین، جس کی آبادی ایک ارب ہے۔ کسی خطۂ زمین پر آزادی کا جھنڈا گاڑ کر کوئی حکومت نافذ کر دیں تو وہ اپنی علیحدہ ہستی کو دائم و قایم رکھنے کے لیے سب کچھ قربان کر دے گا۔ ہر حکومت کسی نظریے، مذہب یا اصول کی دعوے دار ہوتی ہے، لیکن اس کا اوّلین مقصد قومی مفادات کا تحفّظ ہے، البتہ آیندہ جنگ کی ہولناکی کے خوف نے حکومتوں کو مجبور کیا ہے کہ وہ حتی الوسع بین الاقوامی اداروں کے توسط سے مختلف شعبوں میں تعاون کریں اور جب تک ممکن ہو اپنے تعلقات میں توازن باقی رکھیں۔ بین الاقوامیت کا بلند بانگ شور تو اب کم سننے میں آتا ہے، اس کی جگہ علاقائی تعاون کے تصوّر نے لے لی ہے۔ اس کی دو مؤثر مثالیں مغربی استعمار کی تنظیم نیٹو اور اشتراکی ممالک کے اتحاد وارسا پیکٹ کی تنظیم نظر آتی ہے۔ تیسری دنیا میں بھی علاقائی تعاون کا احساس پیدا ہونے لگا ہے مثلاً براعظم امریکہ کی پین امریکن تنظیم، افریقی ملکوں کا علاقائی ادارہ اور اسلامی کانفرنس۔ نیک نیتی کے باوجود ان تینوں کی ناکارکردگی کی اصل وجہ یہ ہے کہ ان کے اراکین بنیادی طور پر کمزور ہیں اور ان میں

وہ باہمی اعتماد نہیں ہے جو تاریخی شعور اور سیاسی تدبّر کے بغیر پیدا نہیں ہو سکتا۔

جب ہم ملّتِ اسلامیہ کے اتحاد کا ذکر کرتے ہیں تو بھول جاتے ہیں کہ اس قسم کا تصوّر دنیا کی اور ملّتوں میں بھی موجود ہے۔ مثال کے طور پر جنوبی امریکہ کو لیجیے جو درجنوں ممالک پر مشتمل ہے اور انیسویں صدی کے آغاز تک اسپین اور پرتگال کا زیرِ دست تھا، حصولِ آزادی کے بعد یہ خطّہ مختلف ملکوں میں بٹ گیا حالانکہ یہاں کے باشندوں میں مذہب، زبان اور تہذیب کی یکسانیت ہے تاہم ان میں اتحاد کم اور اختلاف ہی زیادہ ہے۔ یہی حال سیاہ فام افریقی ممالک کا ہے۔ یہ سچ ہے کہ مغربی استعمار ان اختلافوں کو ہوا دیتا ہے لیکن اصل قصور مقامی حکمرانوں کی کم اندیشی اور بدعنوانی کا ہے۔

اس پس منظر میں مسلم ممالک کے حالات کا تجزیہ کرنا چاہیے۔ سیاسی اور معاشی اعتبار سے ان کا براہِ راست تعلق تیسری دنیا کے دیگر ممالک سے ہے۔ انھیں بھی ان انتظامی، صنعتی اور سیاسی اداروں کی تشکیل کرنا ہے جن کے بغیر دورِ حاضر میں کوئی پنپ نہیں سکتا۔ وہ طرزِ فکر جو محض ماضی کی روایات یا شخصی اقتدار کا سہارا لے وہ قومیت کے لیے مضبوط بنیاد فراہم نہیں کر سکتا۔ آزاد رہنا مشکل ہے لیکن ترقی کرنا مشکل تر ہے۔ قوم ماضی سے عبرت حاصل کرتی ہے لیکن امید مستقبل سے وابستہ رہتی ہے اور یہ راستہ مستقل جد و جہد سے طے ہوتا ہے۔ خلافت راشدہ کو اسلامی تاریخ کا سب سے روشن دور اس وجہ سے کہا گیا ہے کہ اس میں اخوّت اور مساوات کی عظیم روایتیں قائم ہوئیں۔ ان کی تفسیر ہمارے زمانے میں جمہوری اور رفاہی اداروں میں ملے گی۔ اگر اس تصوّر کو ترک کر دیا جائے تو پھر ہمارے ماضی میں کوئی ایسی خصوصیت نہیں جو دوسری ملّتوں کی تاریخ میں نہ ملتی ہو۔

ایک طرف تو ہم بڑے فخر سے اخوت، عدل و مساوات کی ان عظیم روایتوں پر عمل پیرا ہونے کی تلقین کرتے ہیں دوسری طرف آمریت، جاگیرداری اور پیر پرستی کو بھی باقی رکھنا چاہتے ہیں۔ ہر روز قرآن کریم کی ہدایتوں کو دُہراتے ہیں کہ علم کا حصول حاصلِ حیات ہے لیکن جب کوئی فرسودہ اوہام کو تنقید کے میزان پر تولتا ہے تو اس پر فقہ کا شکنجہ کسنے لگتا ہے۔ انھیں اسباب کی ستم ظریفی ہے کہ اپنی جغرافیائی وسعت، افرادی

قوت اور مالی وسائل کے باوجود ہم اپنے کو اس حالِ زار میں پاتے ہیں جس سے بیزار ہو کر اقبال نے کہا تھا ؎

مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

بایں ہمہ مستقبل کو تاریک نہیں سمجھنا چاہیئے۔ تاریخ کا دھارا دریا کے سیلِ رواں کی طرح ہے۔ کوئی کشتی سمتِ مخالف میں نہیں بہہ سکتی۔ مدّتوں کے زوال کے بعد اوروں کی طرح مسلمانوں میں بھی بیداری کا دور اسی صدی میں شروع ہوا اور وہ وقت دور نہیں جب رجعت پرور طاقتوں کو تاریخ اپنے خاکدان میں پھینک دے گی۔

سیرِ عالم

۹

سفر، سیاحت اور مہم جوئی میں واضح فرق ہے۔ سفر کسی کام کے لیے کیا جاتا ہے، سیاحت شوقِ تماشا کی تسکین کے لیے اور مہم جوئی دنیا کے کسی نامعلوم و پُرخطر گوشے کی تلاش کے لیے۔ پرانے وقتوں میں رسل و رسائل کی دشواری اور جان و مال کے خطرے کی وجہ سے ان میں امتیاز ممکن نہ تھا۔ شاعروں نے دوسروں کو تو سفر و سیاحت کی تلقین کی لیکن اپنے ٹھکانے سے باہر نکلنے کی زحمت کم نے ہی گوارا کی۔ خواجہ آتش نے نصیحت کی ؏

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے

اور غالب نے کہا کہ ؏

کہ چشمِ تنگ شاید کثرتِ نظارہ سے وا ہو

مگر نہ آتش لکھنؤ سے زیادہ دور کہیں گئے اور نہ غالب نے کلکتہ کے علاوہ کہیں اور کا رُخ کیا۔ میر انیس ؏

ہوتے ہیں بہت رنج مسافر کو سفر میں

کہہ کر اپنے گھر کے ہو رہے۔ فقط ناصر خسرو اور سعدی نے برسوں سیاحت کی، سفر کی صعوبتیں برداشت کیں اور انھیں صحیح معنوں میں مہم جو کہا جا سکتا ہے۔

آج کی دنیا اور ہے۔ جسے دیکھیے سوٹ کیس اٹھائے حج کے لیے نہیں تو حج اکبر کے لیے یورپ یا امریکہ کی طرف اُڑا جا رہا ہے۔ سستے مال اور سستے ہوٹل کی تلاش میں سیّاحوں کے غول دنیا میں ہر طرف ٹڈی دَل کی طرح منڈلا رہے ہیں۔ ایسے سفرناموں کی کمی نہیں جن میں چند ہفتے یا چند ماہ کے ایسے حالات قلمبند ہوں جو آپ گھر بیٹھے کسی گائیڈ بک میں پڑھ سکتے ہیں۔ ابن انشا جب چند روز کی مٹر گشت کے بعد کہیں سے آ کر ابن بطوطہ کے تعاقب کے عنوان سے اخبار میں ایسا مضمون لکھتے جس میں کسٹم کے عملے سے تکرار یا ہوٹل کے کارندوں کی بے پروائی، بازار کے بھاؤ کا ذکر ہوتا تو میں ان کا مذاق اُڑایا کرتا تھا۔ جواب ملتا کہ آپ کی مشکل پسندی اور کوتاہ قلمی پر عمل کروں تو عمر بھر کچھ نہ لکھ سکوں۔

گردشِ روزگار مجھے دنیا میں کہاں کہاں لے گئی، کوہ نوردی اور دشت پیمائی کے شوق نے کیسے کیسے خطروں کے مُنھ میں ڈالا اور فکر و فن کا ذوق کن آستانوں تک لے گیا۔ ان سب باتوں کی تفصیل محال ہے۔ نہ اس کی ضرورت ہے نہ فرصت، لیکن چونکہ ایک طویل مدّت انھیں مشغلوں میں گزری تو اس عنوان سے صرفِ نظر بھی نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا ان تجربوں اور مشاہدوں کا سرسری سا ذکر یہاں کرتا ہوں۔ یوں کتاب کے دیگر ابواب میں بھی ان مضامین کا ذکر ضمناً آتا گیا ہے۔

افریقہ میں دو سال

۱۹۶۵ء کے آغاز میں جب میرا تقرر یونسکو کے نمائندے کی حیثیت سے صومالیہ میں ہوا تو حکومت کے مشورے پر ملک کے طویل دورے پر نکل پڑا تاکہ وہاں کے حالات اور اپنے ادارے کے ماہروں کی کارکردگی کا جائزہ لے سکوں۔ بے نام و نشان راستوں پر ایک ناپیدا کنار بیابان میں جیپ پر میرے ہم رکاب ڈرائیور کے علاوہ محمود علی نامی انگلستان کا فارغ التحصیل صومالی دانشور تھا۔ جب ہم شمالی علاقے میں ایتھوپیا کی سرحد کے

قریب پہنچے تو محمود علی نے جیپ کو روک کر اس میدان کی طرف نظر ڈالی جہاں ہزاروں شُتر بے مہار یا تو ببول کی جھاڑیوں میں چر رہے تھے یا ان کے نیچے بیٹھے جگالی کر رہے تھے۔ اس نے کہا کہ یہ میرے قبیلے "حَضَر موت" کی چراگاہیں ہیں اور ان میں سے کئی اونٹ میرے بھی ہیں۔ میں نے تعجب سے پوچھا کہ تم انھیں کس طرح پہچان سکتے ہو تو اس نے نیچے اُتر کر مُنھ سے عجیب عجیب آوازیں نکالیں۔ کبھی کلکاریاں بھریں کبھی سیٹیاں بجائیں، اتنے میں چند اونٹوں کے کان کھڑے ہوئے۔ غور سے انھوں نے محمود علی کی طرف دیکھا اور شُتر غمزہ کرتے ہوئے اس کی طرف لپکے اور اس فرطِ شوق سے اس سے بغلگیر ہوئے کہ وہ زمین پر گر پڑا۔ پھر وہ دیر تک ان سے سرگوشی کرتا رہا اور میں حق حیران یہ تماشا دیکھتا رہا۔ محمود علی نے کہا کہ افریقہ نے ابھی فطرت سے رشتہ نہیں توڑا ہے۔ یہاں درخت، حیوان اور انسان مل جل کر رہنے کے عادی ہیں، لیکن سفید فام قوموں کی دخل اندازی اس رشتے کو توڑ رہی ہے اور قرین قیاس یہی ہے کہ وقت کے ساتھ ہم بھی مشینی اور شہری تہذیب کی انھیں لعنتوں یا برکتوں میں گرفتار ہو جائیں گے جن کی پیروی تم نے ایشیا میں شروع کر دی ہے۔

اگلے پڑاؤ پر قبائلی زن و مرد کا ایک ہجوم چند سفید فام افراد پر آوازے کس رہا تھا جو ایک پہاڑی ندی سے قریب کے کھیتوں میں پانی لانے کے لیے نالی کاٹ رہے تھے۔ یہ وہ نوجوان تھے جو امریکہ سے پس ماندہ ملکوں کی خدمت کا جذبہ لے کر یہاں آئے تھے لیکن اہلِ افریقہ یہ باور کرنے کے لیے تیار ہی نہیں تھے کہ کوئی بلا غرض ان کی بہتری کے لیے کچھ کرے گا۔ چنانچہ عرفِ عام میں یہ لوگ سفید فام غلام کہلاتے تھے اور قبائلی اپنی حکومت کی تعریف کرتے تھے کہ کس ہوشیاری سے وہ مغربی پردہ فروشوں سے انتقام لے رہی ہے۔ شام ہوتے ہی افریقہ کے زمین و آسمان پر ایسی کیفیت طاری ہوئی جو کہیں اور دیکھنے میں نہ آئی۔ یورپ اور امریکہ کے آسمان پر بیشتر یا تو بادل چھائے رہتے ہیں یا کہر کا غلاف لپٹا رہتا ہے اور کم ایسا ہوتا ہے کہ آسمان پر ستاروں کی تابانی کا تماشا ہو سکے، لیکن میں جہاں تھا وہاں اَن گنت ستارے نُور کی کمندیں زمین کی طرف پھینک رہے تھے۔ اس عالمِ ہُو میں جنگلی جانوروں کی للکار اور دہاڑ کے سوا اگر کچھ اور سنائی دیتا تھا تو وہ مادر گیتی کا خاموش نوحہ۔ اصل افریقہ صحرائے

اعظم کے جنوب سے شروع ہوتا ہے جو سیاہ فام قبیلوں کا مسکن ہے۔ اس برِّ اعظم کے مغربی حصے پر پہلے تو عرب اثر انداز ہوئے اور ان کے زوال کے بعد اہلِ یورپ کا دور دورہ شروع ہوا، البتہ وسطی اور مشرقی افریقہ میں ان کا تسلّط سو سوا سو سال سے زیادہ باقی نہ رہا اور گزشتہ جنگِ عظیم کے بعد ان نوآبادیوں کی سیاسی آزادی کا مرحلہ شروع ہوا جو اب اختتام پذیر ہونے کو ہے۔ اس مختصر مدّت میں مغربی سامراج نے اس برِّ اعظم کا جیسا استحصال کیا اس کی مثال ایشیا میں نہیں ملتی، کیونکہ یہ لوٹ مار سامان کی درآمد و برآمد تک محدود نہ تھی بلکہ اس میں نسلی تشدّد کا وہ جذبہ کارفرما تھا جو وحشی جانوروں کے قتلِ عام اور معصوم و مجبور حبشیوں کے قتلِ عام میں کوئی فرق روا نہ رکھتا تھا۔ اس جذبے نے اُس تہذیب حافر کی پرورش کی جس نے امریکی برِّ اعظم میں بے شمار ریڈ انڈینوں کو اور آسٹریلیا میں اَن گنت قدیم باشندوں کو نابود کر دیا ہے۔ آج بھی وقفے وقفے سے یہ رگ پھڑکتی ہے اور حقوقِ انسانی کے بلند بانگ دعووں کے باوجود بے گناہ انسانوں کو کبھی ویت نام، کبھی الجیریا اور کبھی فلسطین میں فنا کر دیتی ہے۔ افریقہ کے قیام کے دوران ہر ذی حس غیر مُلکی کی طرح مجھے بھی برابر یہ محسوس ہوتا رہا کہ ہم ان لوگوں میں رہتے ہیں جو تاریخ کے زخم خوردہ ہیں۔

ہماری زندگی، پیدائش، شادی اور موت کے جن مسائل میں اُلجھی رہتی ہے وہ ان کے لیے خاص اہمیت نہیں رکھتے۔ میرے ملازم ابوکر کو اپنے واحد بھائی سے بڑا لگاؤ تھا اور بیماری میں اس کی ہر خدمت انجام دی لیکن جب وہ مر گیا تو دوسرے دن وہ کام میں اس طرح مصروف ہو گیا گویا کچھ نہ ہوا ہو۔ میرے اظہارِ افسوس پر اس نے جواب دیا کہ موت کا کوئی علاج نہیں اور ماتم سے کچھ حاصل نہیں۔ ایک دن کام کرتے کرتے وہ بولا "کل میری شادی ہو گئی"۔ جب میں نے پوچھا کہ تم نے مجھے پہلے اطلاع کیوں نہ دی اور اپنے کام سے چھٹّی کیوں نہ کی تو اس نے جواب دیا کہ رسم تو منگنی کی تھی لیکن بڑھے بوڑھوں نے کہا کہ نکاح آج ہی پڑھا دیا جائے۔ غرض یہ کہ پیدائش اور موت کی طرح شادی کو بھی وہ ایک حادثہ ہی سمجھتے ہیں۔ انھیں کسی کے جینے کی خوشی ہوتی ہے نہ کسی کے مرنے کا غم۔

افریقہ میں رہ کر وحشی جانوروں کی خوبیوں کا میں قائل ہوا۔ جن جنگلوں میں شکار

ممنوع ہے اور انسانوں کی آمد و رفت کم ہے وہاں جانور فطرت کے قانون پر عمل کرتے ہیں اور ان میں مہذّب انسان کی خود غرضی، شورہ پشتی، تعصّب و عداوت کی نظیر کم ملتی ہے۔ شیر شکم سیر ہو تو ہرن اور نیل گائے بے خطر اس کے پاس سے گزر جائیں تو وہ نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ جنگل کے بیشتر جانور گوشت خور نہیں ہوتے۔ ایک بار میں نے شیر کے دو جوڑوں کو ایک زیبرا کا شکار کرتے دیکھا۔ جب وہ اسے مار چکے تو جس جوڑے نے اس کا کام تمام کیا تھا وہ پہلے اسے نوشِ جان کرنے لگا اور دوسرا جوڑا دور کھڑا اپنی باری کا انتظار کرنے لگا۔ جب آدھا زیبرا ختم ہوا تو شیر اور شیرنی وہاں سے ہٹ گئے اور دوسرے جوڑے کی باری آئی۔ یہ شائستگی اس کھڑے کھانے (بوفے) میں دیکھنے میں نہیں آتی جہاں لوگ میزوں پر ایک دوسرے کے مُنھ سے لقمہ نوچتے رہتے ہیں۔ مجھے وہ واقعہ یاد آیا جب نواب زادہ لیاقت علی خان نے اپنی کراچی کی رہائش گاہ میں دعوت کا انتظام کیا تھا، اور باغ میں میزوں پر انواع و اقسام کے کھانے چنے گئے تھے۔ جب مہمان میزوں پر بے تحاشا ٹوٹے تو مولوی عبدالحق ہاتھ میں رکابی لیے بھونچکا کھڑے رہ گئے۔ وزیر اعظم نے پاس آکر پوچھا کہ مولوی صاحب آپ کھانا نہیں کھا رہے ہیں تو انھوں نے تنک کر کہا کہ جناب بھیک کا پیالہ لیے کھڑا ہوں۔ معزّز میزبان نادم ہوئے اور ان کے لیے الگ میز پر کھانا لگایا گیا۔ میں بھی ان کے پاس جا بیٹھا اور وہ سارے وقت کھڑے کھڑے کھانے کی لغویت کا ذکر کرتے رہے۔

وقت کی اصلیت کے متعلق مفکّروں اور سائنس دانوں نے بہت سر کھپایا لیکن اس کا سُراغ صحیح معنوں میں آج تک نہیں ملا۔ تاہم اس کی کرشمہ سازی کائنات کے ذرّے ذرّے میں سموئی ہوئی ہے۔ اس کی کارفرمائی کو آدمی اپنی تقدیر سے منسوب کرتا ہے، اور نجومی دست شناس وغیرہ اس کے رازداں ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ پیش گوئی کا جو مشاہدہ مجھے ہوا اس کا ذکر یہاں اس لیے کرتا ہوں کہ اس کا براہ راست تعلق میرے افریقہ کے قیام سے تھا جس کا کوئی وہم و گمان بھی نہ تھا۔

یہ واقعہ اگست ۱۹۶۲ء کا ہے جب میں یورپ سے کراچی آرہا تھا جہاں یونسکو کے

علاقائی دفتر کی تنظیم و نظامت میرے سپرد ہوئی تھی۔ سرِ راہ سیر کی غرض سے استنبول ٹھہر گیا جہاں اتفاقاً میری ملاقات فاطمہ خانم سے ہوئی جو بائیس ۲۲ سال قبل پیرس یونیورسٹی میں میری ہم جماعت تھیں۔ اس طویل عرصے میں ان سے کبھی خط و کتابت نہ ہوئی اور انھیں میرے حالات کا کوئی علم نہ تھا۔ شام کو ان کے گھر کھانے پر گیا تو ایک یونانی خاتون سے یہ کہہ کر تعارف کرایا گیا کہ وہ قہوے کی پیالی میں تقدیر کا تماشا دیکھ لیتی ہیں۔ کھانے کے بعد قہوہ ختم کر کے میں نے پیالی طشتری پر اُلٹ دی اور اس میں باقی ماندہ دو چار قطروں کو غور سے دیکھ کر اس نے مجھ سے تین عجیب باتیں کہیں۔ دو کا تعلق میری ذاتی زندگی سے تھا جو من و عن درست ثابت ہوئیں۔ اس مشاہدے کے بعد میرے ذہن میں وہ تیسری پیش گوئی اکثر کھٹکتی رہی جس کا مفہوم یہ تھا "تمھارا تعلق کسی ایسے کام سے ہے جو تمھیں بار بار اپنے ملک سے باہر لاتا لے جاتا ہے۔ آج کے بعد چھے ۶ بار جب تم بیرونی سفر کر چکو گے تو تمھیں اپنے صدر دفتر سے ایک ایسے ملک میں تبادلے کی ہدایت ملے گی کہ تم حیران رہ جاؤ گے اور وہاں جانے سے صاف انکار کر دو گے لیکن مجبوراً تمھیں وہاں جانا پڑے گا اور رفتہ رفتہ وہ جگہ تمھیں اتنی پسند آئے گی کہ وہاں سے کسی بہتر ملک میں جب تبادلے کا وقت آئے گا تو تم ہرگز راضی نہ ہو گے گو کہ بادل نخواستہ وہاں جانا پڑے گا۔

یقین جانیے کہ اس یونانی خاتون کی پیش گوئی حرف بحرف صحیح ثابت ہوئی۔ میں جب کراچی سے چھٹی بار بیرونی سفر کر کے لوٹا تو اپریل ۱۹۶۴ء میں یک بہ یک یونسکو کے ناظم اعلیٰ نے صومالیہ تبادلے کا حکمنامہ یہ لکھ کر صادر کیا کہ وہاں ہمارے ادارے کی ساری کارکردگی بے سود ثابت ہو چکی ہے اور حالات کی اصلاح کے لیے تم سے بہتر کارکن ہمارے پاس نہیں ہے۔ الغرض قہر درویش بہ جان درویش مجھے وہاں جانا پڑا۔ پھر رفتہ رفتہ اور غیر شعوری طور پر افریقہ نے مجھ پر جو جادو کیا اس کا اندازہ صرف وہی لگا سکتے ہیں جنھیں وہاں عرصۂ دراز تک رہنے کا اتفاق ہوا ہو۔ مغرب کی زندگی نظر کو فوراً خیرہ کرتی ہے مگر وقت کے ساتھ یہ چمک دمک ماند پڑ جاتی ہے۔ افریقہ کی کشش دیر میں محسوس ہوتی ہے اور دیر تک باقی رہتی ہے۔

برطانوی سامراج نے کوئی سو سال پہلے شمالی صومالیہ پر اس مصلحت کے مدِّنظر قبضہ کیا تھا کہ وہ خلیج عدن اور بحرِ احمر کے دہانے پر واقع تھا اور عدن سے سنگاپور تک بحرِ ہند کے تسلّط کو جنوبی ایشیا کے تحفّظ کے لیے ضروری سمجھا جاتا تھا۔ اس صدی کے شروع میں اطالیہ نے جنوبی صومالیہ پر قبضہ جمایا لیکن گزشتہ جنگ عظیم کے اختتام اور اقوام متحدہ کے قیام کے ساتھ یہ طے پایا کہ ملک کے دونوں حصّوں کو آزاد اور متّحد کر دیا جائے۔ اس موقع پر برطانیہ نے اپنی روایتی ریاکاری کا ثبوت دیا اور جاتے جاتے ۱۹۴۸ء میں اوگڈن کا صومالی صوبہ ایتھوپیا کے سپرد کر دیا۔ اس طرح ایتھوپیا اور صومالیہ میں اس کشمکش کا آغاز ہوا جو اب تک جاری ہے۔ افریقہ میں مغربی ممالک نے گو بظاہر مذہبی تعصّب کا نام نہیں لیا لیکن تاریخ شاہد ہے کہ عملاً انھوں نے جس حد تک ممکن ہوا مسلمانوں کی ہزیمت اور عیسائیوں کی پُشت پناہی کے لیے کام کیا۔

قد و قامت اور شکل و صورت کے لحاظ سے صومالی افریقہ میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ وہ سیلانی اور باتونی بلا کے ہوتے ہیں۔ سیکڑوں میل پا پیادہ سیر کے لیے چل پڑنا یا شعر گوئی و داستان سرائی میں رات گزار دینا معمولی سی بات ہے۔ ان کے مشاعرے میں میر مجلس کوئی مضمون مثلاً بادل کی گرج، سمندر کا طوفان یا شیر کا شکار تجویز کرتا ہے اور شاعر فی البدیہہ اشعار سنانے لگتے ہیں۔ اگر ایک کا ناطقہ بند ہوا تو دوسرا وہیں سے مصرعہ اٹھاتا ہے اور یہ لامتناہی سلسلہ رات رات بھر جاری رہتا ہے۔ یہی حال ان کے سیلانی پن کا ہے۔ ایک بار میرے چوکیدار عبدالقادر نے کہا کہ اس کی شادی کی بات چیت چار سو میل دور کسی جگہ ہو رہی ہے اور مُنھ دکھائی کے لیے اسے وہاں پہنچنا ہے۔ پھر وہ اللہ کا نام لے کر ہاتھ میں لاٹھی لیے پا پیادہ دشوار گذار جنگلوں سے گزرتا ہوا اس طرف چل پڑا اور مہینے بھر بعد صحیح سلامت لوٹ آیا۔ یوں تو صومالی مرد و زن کا ناک نقشہ ہر طرح درست ہوتا ہے، لیکن سب سے جاذب اس کے دانت ہوتے ہیں اور غالباً دنیا میں کہیں ان سے زیادہ شفّاف اور صاف دانت دیکھنے میں نہیں آتے۔ جب رات کو یک بہ یک بجلی غائب ہو جاتی تو میں عبدالقادر سے کہتا کہ اپنا منہ کھول کر تیرے دانتوں کی روشنی

میں ماچس تلاش کر سکوں۔

صومالیہ کا دارالسلطنت "موغادیشو" مشرقی بحرِ ہند کے کنارے بسا ہوا ہے اور ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامے میں اس کا ذکر کیا ہے۔ پہلے کبھی جنگلی جانور ادھر آنکلتے تھے۔ آج کل تو ایسا نہیں ہوتا البتہ کبھی کبھی اژدھے نکل آتے ہیں۔ ان میں سے ایک نے ہندوستانی سفیر ڈاکٹر سنہا کی موٹر کے نچلے حصے میں ایسی مضبوط گرفت جمائی کہ وہ ڈرائیور کے لاکھ جتن کے باوجود کسی طرح حرکت میں نہ آئی اور بے چارہ سفیر دیر تک سکتے کے عالم میں موٹر کے اندر بند پڑا رہا۔ اندرونِ ملک خشک سالی کے موقع پر کبھی ریڈیو پر اعلان ہوتا تھا کہ فلاں مقام پر بھوکے بندر دوکانیں لوٹ رہے ہیں یا کسی جگہ ہاتھیوں کے غول گھس آئے ہیں اور انھیں بھگانے کے لیے شکاریوں کی مدد درکار ہے۔

یوں تو مشرقی افریقہ کے جنگلوں میں کئی دلچسپ اور عجیب و غریب تماشے نظر آئے، لیکن سب سے دشوار اور یادگار مہم وہ تھی جو صومالیہ اور کینیا کی سرحد کے پاس سمندر میں چند روز درپیش ہوئی۔ میں ایک انگریز دوست کے ساتھ وحشی جانوروں کے دیدار کے لیے "آف موگو" نامی جنگل کی طرف روانہ ہوا جہاں ان کا بڑا جمگھٹ تھا اور انسانوں کی دسترس سے دور وہ بے خطر زندگی گزارتے تھے۔ جب ہم لوگ بذریعہ طیارہ "کس مایو" نامی چھوٹی سی بندرگاہ پر پہنچے تو اطلاع ملی کہ جنگل میں چند روز سے بارش ہو رہی ہے اور وہاں پہنچنا ناممکن ہے۔ جب وقت گزاری کی اور کوئی صورت نہ ملی تو ہم بے سروسامان ایک بادبانی کشتی پر ان سنسان جزیروں کی طرف روانہ ہو گئے جن کا سلسلہ سمندر میں دور تک پھیلا ہوا تھا۔ متاعِ جاں کشتی بان کے سپرد کر کے ہم پانچ دن کھلے سمندر میں اس طرح سرگرداں رہے کہ ہر پل دل لہروں کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ ٹھہرتا اور ڈوبتا جاتا تھا۔ یہ حوصلہ نہ ہوتا تھا کہ آنکھیں کھول کر کشتی کو کوہ پیکر لہر کی نوک پر لرزاں دیکھ سکیں اور ہر آن غرقاب ہونے کا دھڑکا لگا رہتا تھا۔ جب شام کو تہ آب سے مٹی یا پتھر کا کوئی جزیرہ نمودار ہوتا تو کشتی کو کنارے لگا کر ہم تھکے ہارے ریت پر لیٹ جاتے۔ صرف دو جگہ ماہی گیروں کی آبادی کے آثار نظر آئے، بلکہ ایک بوڑھا چینی بھی ملا جو خدا جانے کیوں وہاں آکر بس گیا تھا۔ جب رات

بھیگ جاتی اور سردی کے مارے آنکھ کھل جاتی تو تاروں کی روشنی میں ایسی ہوشربا کیفیت طاری ہوتی جو ناقابلِ بیان ہے۔ لہروں کی سرگوشی اور مچھلیوں کی باہمی چپقلش کے سوا کچھ نہ سنائی دیتا اور حبشی قبیلوں کے اس وہم کی صداقت کا احساس ہونے لگتا کہ جب انسان سو جاتے ہیں تو ان کی روحیں سمندروں اور پہاڑوں میں آزادی کی سانس لینے کے لیے نکل آتی ہیں۔ اس قسم کی مہم میں جسمانی تکلیف جو بھی ہو روحانی مسرّت ضرور میسّر ہوتی ہے۔

افریقہ کا خیال آتا ہے تو میرے ذہن میں کبھی "کلمن جارو" پہاڑ کی بیس ہزار فٹ چوٹی ابھرتی ہے جو کسی ایسے آسماں بوس کالے دیو کی طرح کھڑی ہوئی تھی جس نے سر پر برف کی سفید ٹوپی پہن رکھی ہو یا اس کے قریب نمک کی جھیلوں پر سرابِ صحرا کا تماشا۔ پھر مجھے وہ زرافہ یاد آتا ہے جو تن تنہا کینیا کے ایک شمالی میدان میں بے بس کھڑا خاموش التجا کر رہا تھا کہ اس کی گردن میں کھُبے ہوئے تیر کو کوئی نکال دے جس سے کسی ظالم نے اس پر وار کیا تھا۔ مجھے گوتم بدھ کا مقولہ یاد آیا کہ ضرورت اس کی ہے کہ زخمی انسانیت کی روح میں چُبھا ہوا تیر نکالا جائے، یہ سوال بعد میں پوچھنے کا ہے کہ تیر کس نے اور کیوں چلایا؟ میرا دل اس زرافہ کے درد سے چیخ اُٹھا اور موٹر رکوا کر اس کی طرف بڑھا کہ ہاتھ سے وہ تیر کھینچ لوں لیکن وہ ڈر کے مارے بھاگا چونکہ میں بھی اسی نوعِ بشر کا فرد تھا جو جانداروں کی ہلاکت کو تہذیب کا طرّۂ امتیاز سمجھتا ہے۔

مجھے جنگجو ساعی قبیلے کے وہ لوگ بھی یاد ہیں جو گائے کے دودھ میں اسی کا خون ملا کر پی رہے تھے، کیونکہ یہ ان کا من بھاتا کھاجا ہے۔ ان کی عورتیں جنھوں نے برہنہ جسم پر اتنی چربی لیپ رکھی تھی کہ ان پر مکھیوں نے چھتا بنا رکھا تھا۔ ان شیروں کو کیسے بھولا جا سکتا ہے جنھوں نے درختوں پر سونے کی عادت ڈال رکھی تھی۔ اور وہ ہاتھی جو یوگنڈا میں دریائے نیل کے کنارے ہماری موٹر کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا تھا اور ٹانگ کے اشارے سے اسے پانی میں گرانے کی دھمکی دے رہا تھا۔ بے شمار مگرمچھوں کی فوج جو نیل کے ساحل پر دم سادھے شکار کا انتظار کر رہی تھی اور رنگ برنگے سُریلے پرندوں کی قطار جو اس خطّے کے سوا اور کہیں دیکھنے میں نہیں آتی۔ اس طرح کی بہت سی یادیں میرے ذہن میں محفوظ ہیں۔

چرند و پرند کی اسی قربت نے اہلِ افریقہ کے مزاج میں وحشت کے ساتھ معصومیت کا ایسا امتزاج پیدا کیا ہے جسے غیر ملکی مشکل سے سمجھتے ہیں کیونکہ وہ فطرت سے دور چلے گئے ہیں۔ جدید تہذیب انسان کو یہ نہیں سکھلاتی کہ وہ فطرت سے تعاون کریں بلکہ یہ درس دیتی ہے کہ وہ فطرت سے زور آزمائی کریں۔ انسانی قدروں کے زوال کا ایک سبب یہ بھی ہے۔

میں صومالیہ پہنچا ہی تھا کہ وزیر اعظم عبدالرزاق سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے باتوں باتوں میں اس امر کی صراحت کی کہ اقوام متحدہ کے مشیروں اور ماہروں کی کارکردگی پر عمل کیوں نہیں ہوتا۔ اصل وجہ یہ تھی کہ حکومت کے پاس افرادی اور مادّی وسائل کی کمی تھی۔ وزیر اعظم نے کہا کہ ہمارا تعلیمی نظام ہر لحاظ سے کمزور ہے اور اس کی اصلاح کے لیے تمھیں جس قسم کے تعاون کی ضرورت ہو اس سے دریغ نہ کیا جائے گا، البتہ بجٹ میں کسی اضافے کی توقع نہ رکھیں۔ دراصل اس وقت دوسرے افریقی ملکوں کی طرح صومالیہ کی ابتری ناقابلِ بیان تھی۔ بیشتر اساتذہ غیر تربیت یافتہ۔ صومالی زبان کا اپنا رسم الخط نہ تھا۔ درسی کتابیں یورپ میں چھپتی تھیں۔ اسکولوں کے لیے عمارتیں نہ تھیں اور پورے ملک میں کوئی یونیورسٹی نہ تھی۔ دس سال تک یہ ملک اقوام متحدہ کے زیر انتظام رہا تھا اور آزادی کے حصول کے چار برس گزر چکے تھے۔ اب مجھ پر یہ ذمّے داری عاید ہوئی کہ ہتھیلی پر سرسوں اُگاؤں۔ یہ کام جس طرح سرانجام پایا اس پر میں بجا طور پر فخر کر سکتا ہوں۔

ہر تعلیمی نظام کے چار اہم عنصر ہوتے ہیں۔ استاد، نصاب، درسی کتاب، اور اسکول کا ماحول۔ میں نے صومالی اُستادوں کی تربیت کا ایسا منصوبہ بنایا جس کے تحت حکومت کو زیر بار کیے بغیر یونسکو اور یونیسیف یہ خدمت انجام دے سکتی تھی۔ روسی حکومت کو آمادہ کیا گیا کہ وہ صومالی مصنّفوں کی لکھی ہوئی درسی کتابوں کی اشاعت کا بندوبست کرے۔ یونسکو کے ماہروں کو از ابتدا تا انتہا نصاب پر نظر ثانی کے کام پر لگا دیا گیا۔

عمارتوں کا مسئلہ یوں طے پایا کہ ان امریکی نوجوانوں کو جو خدمتِ خلق کی غرض سے یہاں آکر جنگلوں میں سیر کرتے یا سمندر میں غوطے لگاتے رہتے تھے دور دراز کے دیہاتوں اور قصبوں میں بھیج دیا گیا جہاں وہ مقامی باشندوں کی مدد سے چھوٹی موٹی درس گاہیں بنانے لگے۔

ان منصوبوں کو بروئے کار لانے میں بڑی جاں فشانی کرنی پڑی، لیکن میں نے وزیر اعظم عبدالرزاق سے یہ وعدہ پورا کر دکھایا کہ کسی مقصد کے حصول میں سب سے بڑا دخل مالی وسائل کا نہیں بلکہ قوتِ ارادی کا ہوتا ہے۔ صومالی یونیورسٹی کا جو منصوبہ بنایا اس پر میری موجودگی میں تو نہیں لیکن چند سال بعد عمل ہو سکا۔

اُس وقت صومالی زبان کا کوئی رسم الخط نہ تھا اور یہ کمی بڑی شدّت سے محسوس کی جاتی تھی۔ جدید اندازِ فکر رومن رسم الخط کا حامی تھا اور اس طبقے کو مغربی سفارت خانوں کی پُشت پناہی حاصل تھی۔ روایت پسند عربی رسم الخط کے طرف دار تھے اور ان کی حمایت عرب حکومتیں کرتی تھیں۔ کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو اپنی زبان کے لیے نیا رسم الخط ایجاد کرنا چاہتے تھے۔ اس تنازعے کے تصفیے کے لیے حکومت نے یونسکو سے رجوع کیا تاکہ صومالی زبان کے غیر ملکی ماہر اس معاملے میں کوئی صائب مشورہ دے سکیں۔ جب مجھے اندازہ ہوا کہ یہ لسانی نہیں بلکہ سیاسی مسئلہ ہے تو میں نے کوشش کی کہ ہمارا ادارہ اس معاملے میں کوئی دخل نہ دے اور فیصلہ حکومتِ صومالیہ پر چھوڑ دیا جائے۔ تاہم یونسکو نے یورپین ماہروں کا ایک مشن بھیج ہی دیا اور اس نے حسب توقع صومالی زبان کے لیے رومن رسم الخط کو موزوں قرار دیا۔ اس موقع پر شہر میں ان کے خلاف مظاہرے ہوئے بلکہ خللِ امن کا خطرہ بھی لاحق ہو گیا۔ وہ لوگ تو خیر سے چلے گئے نزلہ مجھ پر گرا کیونکہ میں یونسکو کا نمائندہ تھا۔ ثقافتی انجمن کے معتمد نے اقوام متحدہ کے سکریٹری جنرل او تھانٹ کو ایک خط لکھ بھیجا جس میں مجھے قتل کرنے کی دھمکی دی گئی۔ اس خط کی نقل انھوں نے میرے صدر دفتر پیرس بھیج دی۔ اب میری بے خبری میں ہنگامہ برپا ہو گیا۔ ہمارے ادارے نے پیرس میں صومالیہ کے سفیر کو طلب کر کے وہ خط دکھلایا اور حکومتِ صومالیہ کو میری سلامتی کا ذمّے دار قرار دیا۔ جیسے ہی سفیر نے صومالی حکومت کو اس ماجرے سے آگاہ کیا تو میری لاعلمی میں میری حفاظت کے لیے دو سفید پوش محافظ میری قیام گاہ پر تعینات کر دیے گئے۔ وہ صومالی جو میری جان کے درپے تھا حراست میں لے لیا گیا۔ کچھ دنوں بعد جب مجھے اس واقعے کی تفصیل معلوم ہوئی تو میں اس شخص سے جیل میں ملا اور اس کی بدگمانی کا ازالہ کیا بلکہ اپنی ضمانت پر اسے جیل سے رہا بھی کرایا۔ کئی سال بعد

حکومت نے اس مشکل مسئلے کا یہ حل نکالا کہ ایک طرف تو رومن رسم الخط اختیار کیا اور دوسری طرف صومالیہ کو عرب لیگ کا گروپ بنا دیا۔

ایک ناقابلِ فراموش تجربے کے ذکر کے ساتھ اس بیان کو ختم کرتا ہوں۔ وزارتِ تعلیم کی عمارت میں میرا دفتر دو کمروں پر مشتمل تھا۔ ایک میرے مددگار ماہروں کے لیے مخصوص تھا اور دوسرے کو میں اپنے سکریٹری کے ساتھ استعمال کرتا تھا۔ یہ شخص البشیر نامی ایک صومالی تھا۔ اس زمانے میں ملک میں آزمودہ انگریزی داں اسٹینوگرافر بہت کم ملتے تھے۔ یہ شخص کچھ وقت لندن میں گزار چکا تھا اور برطانوی سفارت خانے میں کام کر چکا تھا اس لیے ہر لحاظ سے کارآمد تھا، البتہ ایک عیب یہ تھا کہ ہر دوسرے سال موسمِ بہار کی آمد کے ساتھ اس پر جنون کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی اور وہ صومالیہ کے واحد پاگل خانے، جو دور دراز مقام پر واقع تھا بھیج دیا جاتا تھا۔ دیوانہ بکار خویش ہشیار چند ماہ بعد وہ کسی نہ کسی طرح ڈاکٹر سے ہوش مندی کی سند لے کر دوبارہ اپنی ملازمت پر تعینات ہو جاتا تھا۔ میں نے اس کی خفیہ رپورٹ میں یہ واردات پڑھی تو حیران ہوا، لیکن مصلحت کا تقاضا تھا کہ اُسے نہ چھیڑا جائے۔ سال بھر وہ ایسی مستعدی سے کام کرتا رہا اور ہنگامہ پسند صومالیوں سے ایسی بُردباری سے نمٹتا رہا کہ میرا وسوسہ زائل سا ہو گیا۔ اتنے میں اگلی بہار آئی۔ آس پاس کے درختوں میں شگوفے کھلنے لگے اور پرندوں کے نغموں سے فضا گونج اٹھی۔ اب البشیر پر وہ عالم طاری ہوا جس کا ذکر اردو غزلوں میں بہت آیا ہے۔ البشیر کی آنکھوں میں عجیب سی چمک پیدا ہو گئی۔ وہ زیرِ لب کچھ گنگنانے لگا۔ فائلوں کے رجسٹر میں غلط اندراج کرنے لگا اور جس کام کے لیے اس سے کہا جاتا خلافِ معمول اسے بھول جاتا۔ یہ سلسلہ کئی دن تک جاری رہا اور میرا ماتھا ٹھنکا کہ وہ دیوانگی کی راہ پر چل پڑا ہے۔ ایک صبح جب میں اپنے کمرے میں داخل ہوا تو البشیر نے جھپٹ کر دروازہ اندر سے بند کر دیا اور میرے مقابل کرسی پر بیٹھ کر مجھے غصّے سے گھورنے لگا۔ میں نے دل میں سوچا کہ یہ دیو ہیکل اگر مجھ پر وار کر بیٹھے یا اٹھا کر کھڑکی سے باہر پھینک دے تو میں کیا کروں گا، لیکن بڑے سے بڑے خطرے کے سامنے میرے اوسان خطا نہیں ہوتے ہیں چنانچہ میں نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا، سگریٹ سلگائی اور پوچھا کہ وہ کیا

چاہتا ہے۔ البشیر نے درشت انداز میں کہا "مجھے خوب معلوم ہے کہ آپ مجھے ملازمت سے برطرف کرنا چاہتے ہیں"۔ میں نے کہا "میاں تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں نے تو تمھاری ملازمت کی میعاد میں ابھی توسیع کی ہے اور اس کاغذ کو تم نے خود ٹائپ کیا تھا"۔ یہ کہہ کر وہ فائل میں نے اس کے سامنے رکھ دی۔ البشیر کو پورا اطمینان نہ ہوا۔ کہنے لگا کہ آپ نے میرے الاؤنس میں اضافے کی سفارش کیوں نہیں کی۔ میں نے جواب دیا "تمھارا یہ خیال بھی صحیح نہیں ہے کیونکہ اس سفارش کی نقل بھی اسی فائل میں ہے"۔ البشیر ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ کون سا نیا الزام تراشے، اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی۔ البشیر نے چٹخنی کھولی تو میرا ایک ہندوستانی مددگار ڈاکٹر لکھانی اندر داخل ہوا "دیوانہ را ہوئے بس است"۔ البشیر نے اس نحیف و نزار سے اس گرمجوشی سے معانقہ کیا کہ وہ درد سے چیخ اٹھا اور میں نے فوراً باہر نکل کر وزیر تعلیم یوسف کنا دید کو اس واقعے کی اطلاع دی۔ ان کے چوب داروں نے بڑی حکمت عملی سے البشیر پر قابو پایا اور طیارے میں بٹھلا کر اُسے پاگل خانے بھیج دیا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا، لیکن واقف کاروں نے خبردار کیا کہ یہ آسیب اتنی جلدی نہیں ٹلے گا۔ چند ماہ بعد وہ پھر نازل ہوگا اور ہوا بھی یہی۔ شہر میں غیر ملکیوں کے لیے ہوٹل "جوبا" سب سے مناسب رہائش گاہ تھی اور میرا قیام بھی اسی میں تھا۔ رات گئے جب میں ہوٹل کے گول کمرے میں داخل ہوا تو اندھیرے سے یک بیک البشیر میری طرف لپکا اور کہنے لگا کہ میں آپ کا ہی منتظر تھا۔ موقع کی نزاکت کو میں سمجھ گیا اور خندہ پیشانی سے پوچھا کہ طبیعت کیسی ہے۔ البشیر نے تلخی سے جواب دیا کہ طبیعت تو میری کبھی خراب نہیں تھی اور اس کا اندازہ کل آپ کو دفتر میں ہو جائے گا۔ اب معلوم ہوا کہ وہ اسی ہوٹل میں آکر ٹھہرا ہے۔ میں نے اپنے کمرے میں جا کر ٹیلی فون پر ہوٹل کے اطالوی منیجر کو البشیر کی واردات سنائی تو اس نے اپنے عملے کو رات کے وقت میری حفاظت کی تاکید کر دی۔ جب ہوٹل میں سناٹا ہو گیا تو البشیر چپکے سے چھرا لیے میرے کمرے کی طرف بڑھا۔ میں نے دروازہ اندر سے بند کر رکھا تھا اور خطرے کے احساس نے آنکھوں سے نیند اڑا دی تھی۔ کمرے کے دروازے

پر وہ آکر کھڑا ہی ہوا تھا کہ ہوٹل کے ملازموں نے اسے پکڑ لیا۔ پولیس کو فوراً اطلاع کی گئی اور ابشیر حوالات میں بند کر دیا گیا پہلے تو سوچا کہ اس پر قتل کی کوشش کا مقدمہ دائر ہو لیکن بعد ازاں اسے دوبارہ اسی پاگل خانے میں بند کر دیا گیا۔ خدا جانے اس کا بعد میں کیا حشر ہوا؟

۱۹۶۶ء ختم ہونے کو آیا تھا اور صومالیہ میں تنہا رہتے دو سال ہو چکے تھے۔ میری کارکردگی سے حکومتِ صومالیہ بہت خوش ہوئی اور یونسکو کے ناظم اعلیٰ بھی۔ دونوں نے اپنی خوشنودی کا اظہار مختلف طریقے سے کیا۔ حکومت نے بہت کوشش کی کہ میرا تبادلہ نہ ہو اور میرا منشا بھی یہی تھا۔ لیکن میرے صدر دفتر نے دو ٹوک فیصلہ کر دیا کہ ایران کو میری خدمات کی ضرورت ہے چنانچہ جنوری ۱۹۶۷ء میں یونسکو مشن کے سربراہ کی حیثیت سے میرا تبادلہ تہران ہو گیا۔

ایران میں چار سال

(۱۰)

مسلمانانِ ہند کو ان کا مذہب عربوں نے، حکومت ترکوں نے اور تہذیب ایرانیوں نے عطا کی۔ ہمارے بچپن تک ہندوستانی مسلمانوں کے پرانے خاندانوں میں ایران کا ذکر اس طرح ہوتا تھا گویا ہمارا اصل وطن وہی ہے۔ جسم ہند میں پلتا تھا تو ذہن کی پرورش ایران میں ہوتی تھی اور روح عرب میں بھٹکتی تھی۔ رستم و سہراب کا قصہ ہماری نوکِ زباں پر تھا اور ابتدائی درس میں شیخ سعدی کی گلستان و بوستان کو ضرور شامل کیا جاتا تھا۔

جب ۱۹۵۹ء میں مجھے پہلی بار یونسکو کے کام سے تہران جانا پڑا تو یہ گمان بھی نہ تھا کہ ہر سال وہاں جانے کا موقع ملے گا حتیٰ کہ ۱۹۶۷ء سے ۱۹۷۰ء تک مسلسل وہیں قیام بھی رہے گا۔ اپنے پہلے دورے کی یاد مجھے آج بھی نہیں بھولی۔ چند سال قبل ڈاکٹر مصدق نے تیل کو قومی ملکیت میں لے کر خوش حالی اور ترقی کے جس دور کا ڈول ڈالا تھا ابھی اس کی ابتدا ہوئی تھی۔ اب تو شمال میں شمران کی پہاڑیوں سے لے کر جنوب میں شاہ عبدالعظیم کے مقبرے تک آبادی ہی آبادی ہے، لیکن اس وقت شہر کے تین حصے الگ الگ

سے لگتے تھے اور ان کے بیچ میں خاصا فاصلہ تھا۔ جنوب میں اس قدیم شہر "رے" کے آثار تھے جسے چنگیز خان نے تباہ کر دیا تھا اور اب غریب طبقے کا مسکن تھا۔ وسط میں تہران تھا جسے دو سو سال پہلے قاچار بادشاہوں نے اصفہان سے منتقل ہو کر اپنا دارالخلافہ بنایا تھا۔ شمران میں امیروں اور رئیسوں کی کوٹھیاں تھیں جہاں خاص طور پر موسم گرما میں رونق رہتی تھی۔ ان تینوں آبادیوں کے بیچ میں دور دور تک خالی میدان پڑے ہوئے تھے جو دیکھتے ہی دیکھتے آباد ہو گئے۔

یہ تھا ایران کا نقشہ ۱۹۵۹ء میں۔ اصفہان اور شیراز کی ویرانی نہ پوچھیے۔ بچپن سے سنتے آئے تھے کہ اصفہان "نصف جہان" ہے۔ فرطِ شوق وہاں لے گیا تو یہ دیکھ کر مایوسی ہوئی کہ پرانی وضع کا چھوٹا سا شہر ہے جہاں ہر طرف خاک اُڑ رہی ہے۔ یہی حال چالیس سال پہلے آگرہ کا تھا۔ البتہ آگرہ کی طرح اصفہان کی تاریخی عمارتیں بھی لاجواب ہیں۔ شیراز میں تو اس وقت ایک ایرپورٹ بھی نہ تھا۔ ہوائی جہاز نے ہمیں شہر کے پاس ایک میدان میں اُتار دیا اور سوٹ کیس ہاتھ میں لیے سڑک کے کنارے ٹیکسی کا انتظار کرنا پڑا لیکن چند سال کی قلیل مدّت میں صرف انھیں شہروں نے نہیں بلکہ سارے ملک میں ایسی تیز رفتار ترقی ہوئی جس کا اقرار کرنا چاہیے۔

اُسی وقت پیرس سے میرا تبادلہ کراچی یونسکو کے اس علاقائی دفتر کے ناظم کی حیثیت سے ہوا جس کا دائرۂ کار جنوبی ایشیا کے ممالک سے تھا۔ اس میں توسیع کی تجویز ہوئی تو سب سے پہلے ایران اور بعد ازاں افغانستان، نیپال، تھائی لینڈ، ملایا وغیرہ کو شامل کیا گیا۔ مجھے ان سارے ملکوں میں جانے کا بارہا اتفاق ہوا، لیکن ایران سے پرانا ذہنی تعلق تھا وہاں جلد ہی کئی لوگوں سے ایسی دوستی ہوئی جو مرورِ ایام کے باوجود اب تک باقی ہے۔ یہی وہ کشش تھی جو مجھے ۱۹۶۷ء میں صومالیہ سے وہاں کھینچ لائی۔ یہاں مجھے ایک دن کے لیے بھی اجنبیت محسوس نہ ہوئی۔ فارسی شاعری و تاریخ کے مطالعے کے ساتھ ملک کے گوشے گوشے کی سیر نے ایک خاص لطف بخشا۔

اُس وقت کون قیاس کر سکتا تھا کہ پہلوی بادشاہت کا شیرازہ اتنی جلدی بکھر جائے گا۔

یوں تو ہر آمریت فوج اور پولیس کے بل پر مسلّط رہتی ہے، لیکن اگر ملک میں دولت آفرینی کے وسائل ہوں تو ظاہری خوش حالی کا غازہ معاشی خرابیوں کو عارضی طور پر ڈھک لیتا ہے۔ چنانچہ اُس وقت کسی کو اندازہ نہ تھا کہ زیرِ زمین لاوا اُبل رہا ہے جو انقلاب کے کوہِ آتش فشاں کی شکل اختیار کرلے گا۔ البتہ شاہ نعمت اللہ ولی کی کلّیات کے سب سے پرانے نسخے میں جو ان کی رحلت کے فوراً بعد مرتّب ہوا تھا یہ پیش گوئی دیکھنے میں آئی کہ چودھویں صدی ہجری کے اختتام کے ساتھ ایران کی آخری بادشاہت ختم ہو جائے گی جو صرف دو حکمرانوں پر مشتمل ہوگی۔ یہ بات اس مشہور نظم میں کہی گئی ہے جو گزشتہ پانچ سو سال کے اہم واقعات کی پیش گوئی سے متعلق ہے اور گو وقت کے ساتھ اس میں ردّ و بدل ہوتا رہا ہے لیکن اس کا سب سے مستند نسخہ وہی ہے جس کا ذکر اوپر آیا جو آج سے بارہ سال پہلے تک مشہد میں روضۂ امام رضا کے قدیم کتب خانے میں موجود تھا۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ پہلوی دورِ حکومت میں پرانے شاعروں کی عظمت کو باقی رکھنے کا ایسا اہتمام کیا گیا گویا ملک کے تہذیبی ورثے کے اصل نشاں بردار وہی تھے۔ ہر چھوٹے بڑے شہر میں فردوسی، سعدی، حافظ وغیرہ کے نام کے خیابان ہیں۔ یہی نہیں بلکہ ہر مشہور شاعر کی خستہ و خراب قبر پر جیسے شاندار مقبرے تعمیر ہوئے ان کی مثال دنیا میں نہیں ملتی۔ اس کا خیال رضا شاہ اوّل کو آج سے پچاس سال پہلے آیا جب فردوسی کی ہزار سالہ تقریب منائی گئی۔ تیمور لنگ نے، جو فردوسی کا مدّاح تھا، چھ سو سال قبل اس کی شکستہ قبر کو اپنی نگرانی میں درست کیا، لیکن پھر کسی نے اس کی خبر نہ لی۔ رضا شاہ نے فردوسی کا جو عالی شان مقبرہ طوس میں بنایا اس احاطے میں فردوسی کے پُرانے گھر کی دیوار کو بھی باقی رکھا گیا ہے۔

تیمور لنگ کی طرح رضا شاہ کو بھی فردوسی کے علاوہ اور کسی شاعر سے دلچسپی نہ تھی۔ ایک بار وہ دورے پر شیراز گیا تو اس طرف سے گزرا جہاں حافظ کی پرانی قبر تھی۔ اس کی نظر دیوانِ حافظ کے ایک نسخے پر پڑی جو قبر کے دروازے پر زنجیر سے آویزاں تھا۔ شاہ کے ہمراہ وزیرِ تعلیم آقائے علی اصغر حکمت تھے اور یہ واقعہ میں نے ان ہی سے سُنا تھا۔ رضا شاہ

کو یقین ہی نہ آیا کہ دیوانِ حافظ سے فال نکالی جا سکتی ہے لیکن امتحاناً آنکھیں بند کر کے اس نے اس مسودے کا کوئی ورق اُلٹا تو انگلی اس شعر پر پڑی ؎

بلبل ز شاخ سرو بہ گل بانگ پہلوی
می خواند روشن درس مقامات معنوی

اس شعر میں پہلوی کا ذکر پڑھ کر رضا شاہ اتنا متاثر ہوا کہ اسی وقت مزار حافظ کو درست کرنے کا حکم دے دیا۔ چنانچہ اب یہ مزار ایک خوش نما باغ کی زینت ہے اور اس سے کچھ دور آگے شیخ سعدی کے مقبرے کی بھی ایسی جلا ہوئی کہ اس کے احاطے میں وہ نہر رکنا باد گزرتی ہے جس کا ذکر کلامِ حافظ میں ملے گا۔ اس کے بعد عمر خیام اور دیگر شعرا کی قسمت بھی جاگی اور ان مقبروں کی از سر نو تعمیر ہوئی۔ اس سلسلے میں مجھ سے بھی ایک کارِ ثواب انجام پایا۔ ۱۹۵۹ء میں پہلی بار ایران کا سفر درپیش ہوا تو میرے بھائی شمیم (مرحوم) نے ارشاد فرمایا کہ "اصفہان جاؤ تو صائب کی قبر پر حاضری دینا اور میری طرف سے فاتحہ پڑھنا"۔ وہ صائب کے بڑے مدّاح تھے۔ میں جب وہاں کی خاص خاص عمارتوں کی سیر کر چکا تو اپنے رہنما آقائے کربلائی سے مزار صائب چلنے کی فرمائش کی۔ اس نے تعجب سے کہا کہ "صائب یہاں دفن نہیں ہیں"۔ میرے اصرار پر وہ اُس گم شدہ قبر کی تلاش میں نکلا اور دوسرے دن بتلایا کہ شہر کے باہر پھلوں کے ایک دور افتادہ باغ میں صائب کی قبر ہنوز محفوظ ہے، گو اُس کا نام بہت کم نے سُنا ہے۔ کربلائی کے ساتھ میں بہ مشکل تمام اس جگہ پہنچا اور اس عظیم شاعر کو نذرانۂ عقیدت پیش کیا۔ تہران لوٹ کر یہ واقعہ وزیرِ تعلیم ڈاکٹر مہران کو سُنایا تو انھیں تعجب بھی ہوا اور افسوس بھی، پھر مجھے مشورہ دیا کہ یونسکو کی طرف سے خط لکھو تو صائب کے شایانِ شان مقبرہ بن جائے گا۔ میں نے فوراً ہی ایک مناسب خط اُن کی خدمت میں بھیج دیا۔ چند سال بعد جب اصفہان جانے کا اتفاق ہوا تو یہ دیکھ کر دلی خوشی ہوئی کہ حکومت نے اس باغ کا نصف حصّہ حاصل کر کے مزار صائب پر ایک خوبصورت عمارت تعمیر کر دی ہے اور اسی کے ساتھ ایک کتب خانہ بھی قایم ہو گیا ہے۔ اسی زمانے میں سُنا کہ وسط شہر میں تہران کے کسی پُرانے مکان کے احاطے میں مشہور شاعرہ قرۃ العین

طاہرہ کی قبر کا نشان ملا ہے۔ جب ناصر الدین شاہ قاچار کے دربار میں اسے بہائی مذہب کی تبلیغ کے الزام میں پیش کیا گیا تو بادشاہ نے اُسے یہ کہہ کر رہا کر دیا کہ "در گذریم کہ رخ زیبا داری"۔ لیکن بادشاہ کی والدہ نے اسے قتل کرا کے کسی گوشے میں دفن کر دیا۔ اب قرۃ العین طاہرہ کی ہڈیاں وہاں سے منتقل کر کے شہر کے شمالی محلّے یوسف آباد میں پیوند خاک کر دی گئی ہیں۔ بہائی شاعروں کے مطبوعہ تذکرے میں یہ پڑھ کر مجھے مایوسی ہوئی کہ جن فارسی غزلوں نے قرۃ العین طاہرہ کو شہرت بخشی وہ دراصل اس کی تخلیق نہیں ہیں۔

پہلوی خاندان کو دین اسلام تو کجا ملک کی تہذیبی میراث کا بھی احساس نہ تھا۔ یہی وہ بنیادی کمزوری تھی جس نے اسے مغرب کی کورانہ تقلید پر اس حد تک مائل کیا کہ ملک کے عوام اور دانشور سب ہی اس سے متنفّر ہو گئے۔ شاہ کی چھوٹی بہن فاطمہ نے ایک امریکن سے بیاہ رچایا۔ اس کی بڑی بہن شمس نے ایک آرمینین ڈاکٹر "پہل بود" سے شادی کر لی۔ یہ سالہا سال وزیر فرہنگ (ثقافت) کے عہدے پر مامور رہے۔

وزیر اعظم عباس ہویدا کی طرح شاہ کی جڑواں بہن شہزادی اشرف کے متعلق عام طور پر مشہور تھا کہ وہ بہائی ہے۔

بادشاہوں کے تذکروں میں ہم نے مرشد زادوں کا ذکر سُنا ہے۔ یہ وہ لوگ تھے جن کا دُور کا تعلق بادشاہ سے ہوتا تھا۔ میں ایک بار دوستوں کے ساتھ اصفہان میں "دریائے زندہ رود" کے پل "خاجو" پر ٹہلتا جا رہا تھا کہ کسی نے ایک کباب فروش کی طرف اشارہ کیا۔ وجاہت اس کے چہرے پر عیاں تھی۔ چلتے چلتے میرے دوست نے یہ دلچسپ واقعہ سُنایا کہ پہلوی خاندان کے بانی رضا خاں جب جنرل کے عہدے پر قزوین میں مامور تھے تو انھوں نے کسی عورت سے متعہ کر لیا۔ اس رشتے نے ایک لڑکے کو جنم دیا۔ جب متعہ کی میعاد ختم ہوئی تو مہر کی رقم ادا کر کے اس سے بے تعلق ہو گئے۔ پھر وہ تہران منتقل ہو گئے جہاں انھوں نے تخت پر قبضہ کر کے ایک نئی بادشاہت کی بنیاد ڈالی۔ ماں کے انتقال کے بعد وہ لڑکا بے سہارا ہو گیا۔ نہ تعلیم ہوئی نہ تربیت، ناچار یہاں کباب فروش بن کر بیٹھ گیا۔ رضا شاہ کبیر کے انتقال کے بعد ان کے جانشین نے اس کی مدد کی کوشش کی تو اس نے اسے لینے سے انکار کر دیا۔

غیر مسلم اقلیتوں اور غیر ملکیوں کو شاہ نے ایسا سر چڑھایا کہ اہلِ ملک اپنے کو بے خانماں سمجھنے لگے۔ خفیہ پولیس کے جبر و تشدد نے پہلوی دور کے کیے دھرے پر پانی پھیر دیا۔ شاہی خاندان کے افراد کی فرعونیت عوام تو کیا خواص کو بھی نہ بخشتی تھی۔ کئی واقعات کا تو میں خود شاہد ہوں اور "مشتے نمونے از خروارے" کے بطور یہ واقعہ بیان کرتا ہوں۔ ایک وزیر ڈاکٹر ہدایتی اور اُن کی بیگم نے شاہ کی بڑی بیٹی شہزادی شہناز کے اعزاز میں عشائیہ دیا اور اس میں کئی سفیروں اور منصب داروں کے ساتھ مجھے اور میری بیوی کو بھی مدعو کیا۔ دعوت نامے کے مطابق ہم ساڑھے آٹھ بجے شب "وانگ ہوٹل" پہنچ گئے جس کی نچلی منزل ضیافت کے لیے مخصوص کر لی گئی، کیونکہ آدابِ شاہی کا تقاضا تھا کہ شہزادی کسی کو بیٹھا ہوا نہ پائے۔ دیوان خانے سے تمام کرسیاں ہٹا دی گئیں اور سامنے کے دروازے پر میزبان استقبال کے لیے کھڑے تھے اور پیچھے کے دروازے میں خفیہ پولیس نے قفل جڑ رکھے تھے۔ اب سب مہمان خالی دیوان خانے میں کھڑے ہوئے شہزادی کا انتظار کرنے لگے حتیٰ کہ پاؤں شل ہو گئے، پسینے چھوٹنے لگے اور وہ نیک بخت آدھی رات سے پہلے نہ آئی اور جب آئی تو نہ وزیر ہدایتی سے معذرت کی، نہ تھکے ماندے مہمانوں کے سلام کا جواب دیا بلکہ دراتی ہوئی طعام خانے میں گھس گئی۔ یہ ضیافت میزبان و مہمان سب کے لیے کیسی بدمزہ رہی اس کا اندازہ بھی اس بے حس خاتون کو نہ ہوا۔ دراصل نو دولتیوں سے تمیز و شائستگی کی توقع عبث ہے بقول صائب ؎

اُمیدِ مہر ز نو دولتاں مکن صائب
کہ نونہال کجا طاقتِ ثمر دارد

انقلابِ زمانہ کے باوجود انصاف کا تقاضا ہے کہ اس ضمن میں اپنے ذاتی مشاہدے کے اظہار سے تکلف نہ برتوں۔ شاہ کی دلچسپی کے باعث یونسکو نے ایران میں تعلیم بالغان، سپاہِ دانش، آثارِ قدیمہ کے تحفظ پر خاصی توجہ دے رکھی تھی اور اس سلسلے میں چند بار شاہ نے بنفسِ نفیس مجھے باریابی بخشی اور کئی مرتبہ شاہ بانو فرح اور شاہزادی اشرف سے بھی ملنا ہوا۔

۱۹۴۹ء میں جب شاہ پہلی مرتبہ پاکستان کے سرکاری دورے پر آئے تو ان سے اپنی ملاقات کا ذکر یہاں کرتا چلوں۔ گورنر سندھ دین محمد کو ایک شب شاہ کی دعوت کا انتظام کرنا تھا۔ انھیں خیال آیا کہ دعوت محض رسمی نہ ہو بلکہ اسے شاہ کے شایانِ شان ایک ثقافتی تقریب کا رنگ دیا جائے۔ چنانچہ انھوں نے مجھ سے فرمائش کی کہ فارسی آمیز اردو میں ایک سپاس نامہ تیار کروں اور کسی خوش نویس سے لکھوا دوں اور دعوت کے بعد ثقافتی پروگرام مرتّب کروں۔ میں نے یہ خدمت بحسن و خوبی انجام دی۔ جب گورنر نے سپاسنامہ پڑھ کر شاہ کو پیش کیا تو وہ دیر تک تعجب سے اسے دیکھتے رہے۔ جب میرا ان سے تعارف کرایا گیا تو کہنے لگے، مجھے معلوم نہ تھا کہ اردو فارسی سے اس قدر مشابہ ہے۔ پھر پوچھا "کیا تمھیں ایران جانے کا اتفاق ہوا؟" میں نے نفی میں جواب دیا تو شاہ نے کہا "اس کا موقع تمھیں ضرور ملے گا۔" مدّتوں بعد جب تہران میں شاہ کی خدمت میں باریابی ہوئی تو یاد دلاتے ہی شاہ کو وہ پرانا واقعہ یاد آ گیا۔ کچھ دیر وہ اس دعوتِ شب کے بعد کی محفل کا ذکر کرتے رہے، جس میں عمر خیام کی رباعیوں کو رقص و موسیقی کے روپ میں پیش کیا گیا تھا۔

ایران اور جاپان یہی دو ملک ہیں جہاں تہذیب صحیح معنوں میں عوام کی سطح تک جاگزیں ہو چکی ہے۔ رفتار و گفتار نیز نشست و برخاست کا ایک ہی معیار عالموں، جاہلوں، غریبوں اور امیروں میں ملے گا۔

ایران کی دوسری بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کے عرض و طول میں شاید ہی کوئی ایسا مقام ملے جو کسی نہ کسی اعتبار سے دلچسپی کا حامل نہ ہو۔ بے برگ و گیاہ پہاڑوں میں گزرتے گزرتے جب آنکھیں تھکنے لگتی ہیں تو یک بیک کوئی چشمہ یا مرغزار سامنے آ جاتا ہے اور یا ویران ریگستان میں کسی پرانے قلعے یا ٹوٹے ہوئے محل کے آثار کسی بھولی ہوئی داستان کو دہرانے لگتے ہیں۔ اگر ایک طرف بحرِ کاسپین کا دور تک پھیلا ہوا ساحل پہاڑوں اور جنگلوں کو آغوش میں سمیٹے ایک عظیم المثال نظارہ پیش کرتا ہے تو دوسری طرف اصفہان و مشہد میں اسلامی عمارتوں کے بہترین نمونے نظر آتے ہیں۔

ایران کا چپّہ چپّہ میرا دیکھا ہوا ہے۔ ملک کا سب سے خوبصورت حصّہ تو وہ ہے جو

بحرِ کاسپین کے کنارے کوہ البرز کی پشت پر سیکڑوں میل دور تک پھیلا ہوا ہے۔ شیراز اور مشہد جیسے تاریخی شہر ہیں جن کی کشش سے سبھی سیاح اور زائرین واقف ہیں، البتہ چند ایسے دُور افتادہ مقام ہیں جو ہنوز اپنی روایتی دل نوازی کو محفوظ رکھے ہوئے ہیں۔ ان میں ہمدان، خرم آباد اور کرمان کا نام خاص طور پر یاد آتا ہے۔ کرمان کی نسبت سے ہماری سرزمین اس شہر سے ناآشنا نہیں۔ اہلِ کرمان یہاں کیسے وارد ہوئے۔ یہ واقعہ قابلِ عبرت ہے۔ تقریباً دو سو سال قبل جب خاندان قاچار کے بانی آغا محمد نے حاکم اصفہان لطف اللہ خان کو بے دخل کر کے تخت و تاج پر قبضہ کیا اور اس کے تعاقب میں فوج لے کر چل پڑا تو لطف اللہ کو کرمان کے سوا کہیں پناہ نہ ملی۔ آغا محمد اپنی سفاکی اور بے رحمی کے لیے بدنام تھا۔ اس نے اہلِ کرمان کو خبردار کیا کہ وہ اگر لطف اللہ خان کو اُس کے حوالے نہ کر دیں گے تو ان کی جان بخشی نہ ہوگی۔ اہالیانِ شہر نے اطاعت سے انکار کر دیا تو قاچار فوج شہر میں گھس آئی۔ آغا محمد نے حکم دیا کہ شہر کے بالغ مردوں کو اندھا کر دیا جائے۔ اس حکم پر ایسی بے دردی سے عمل ہوا کہ کرمان مدّتوں "شہرِ کور" کہلاتا رہا۔ چند سو افراد جان بچا کر ہندوستان کی طرف بھاگ آئے۔ اُن میں سے ایک کا نام لیوا اپنے اجداد کا انتقام تا ایں دم لے رہا ہے۔

کرمان کے نام سے مجھے یہ بھی یاد آیا کہ اتفاق سے وہاں ایک ایسے اسمٰعیلی خانوادے سے ملاقات ہوئی جو اپنے کو مرحوم آغا خان محمد شاہ کا رشتے دار بتلاتا تھا۔ ان کے دادا فتح علی قاچار کے بہنوئی صوبہ کرمان کے گورنر تھے۔ کسی بات پر بادشاہ سے لڑ کر کراچی اس وقت بھاگ آئے جب انگریز نے سندھ کو فتح کیا تھا۔ پہلوی خاندان سے جب مرحوم آغا خان کے تعلقات استوار ہوئے تو انھیں اپنے اجداد کی جائداد کرمان میں واپس کر دی گئی، لیکن اپنے مقامی رشتے داروں کے حق میں وہ اس سے دست بردار ہو گئے۔ اس کے حصّے بخرے کے لیے مقدمے بازی شروع ہوئی وہ اس وقت بھی جاری تھی جب میں کرمان میں تھا۔

مرحوم آغا خان نہایت بالغ نظر مدبّر تھے انھیں خیال آیا کہ اپنے فرقے کو از سرِ نو ملّتِ اسلامیہ سے وابستہ کریں اور اس کے متعلق جو بدگمانیاں ہیں انھیں قدیم اسمٰعیلی مسودّے کی اشاعت کے وسیلے سے دور کریں۔ اس کام کے لیے ان کی نظرِ التفات تاریخ اسلام کے

ایک روسی نژاد ماہر ایوانوف (AVANOV) پر پڑی جو انگلستان میں قیام پذیر تھا۔ آغا خان کی دعوت پر اس نے بمبئی میں ایک ادارہ قایم کیا۔ ۱۹۳۰ء کے بعد اُس نے اسمٰعیلی فلسفے کی تاریخ پر بڑا کام کیا جس کی شہرت مغربی ممالک میں ہوئی۔ آغا خان کے انتقال کے بعد یہ کام بند ہو گیا۔ ایوانوف اپنے کتب خانے کے ساتھ تہران آگیا۔ ظاہر ہے کہ ایران یا اور کسی اسلامی ملک میں اس تحقیق سے کسی کو دلچسپی نہ تھی۔ وہ تہران یونیورسٹی کے ایک گوشے میں گمنامی کی زندگی بسر کر رہا تھا، جب مجھے اس کی موجودگی کا علم ہوا۔ کبھی کبھی میں اس کے پاس بیٹھ کر اسمٰعیلی تاریخ کی دلچسپ حکایتیں سنا کرتا تھا اور اس کے اندیشے سے باخبر تھا کہ آگے چل کر اس بیش قیمت ذخیرۂ علم کا خدا جانے کیا حشر ہوگا۔ دنیا میں ایوانوف کا نہ کوئی رشتے دار تھا نہ کوئی دوست، چنانچہ جب اس کا انتقال ہوا تو کتب خانہ مہر بند کر دیا گیا۔ خدا جانے اب کس حال میں ہو۔ اسمٰعیلی تحریک اسلامی تاریخ کا ایک اہم باب ہے اور جو لوگ تحقیق میں تعصّب سے کام نہیں لیتے ان کا فرض ہے کہ اس سرمائے کو دوبارہ گم نہ ہونے دیں اور اس سے استفادہ کریں۔

ایران میں ذوقِ سخن شہروں میں ہی نہیں بلکہ دیہاتوں میں بھی ہے تاہم یہ حقیقت ہے کہ اس صدی میں فارسی شاعری کا مزاج یکسر بدل گیا اور وہ کلاسیکی روایت سے ہٹ کر پہلے انقلابی نظم گوئی اور اب آزاد نظم کی طرف مائل ہو گئی ہے۔ کہنے کو نظم گو بہتیرے ہیں لیکن اُن میں سے کوئی بڑائی کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔

خوش وقتی اور آسودگی کے باوجود کبھی کبھی مجھے روحانی اور ذہنی خلا کا احساس شدّت سے ہوتا تھا۔ گو کئی ایرانیوں سے مجھے قربت حاصل تھی لیکن بھول کر بھی دورانِ گفتگو میں ملک کی سیاست کا ذکر نہ آتا تھا۔ اس کا اشارہ ملتے ہی وہ معنی خیز انداز سے کہہ دیتے تھے "دیوار ہم گوش دارد"۔ میں نے کئی بار کوشش کی کہ شہر کے جنوبی علاقے میں جہاں مزدوروں اور مسکینوں کی بستی تھی جاؤں مگر سب نے منع کیا کہ کسی غیر ملکی کے لیے یہ قرین مصلحت نہیں۔ ساواک (خفیہ پولیس) کے ایجنٹ ہر طرف سرگرمِ عمل تھے اور مجھے معلوم تھا کہ ان میں سے ایک میرے دفتر کے ایرانی عملے میں بھی شامل تھا۔ اُس وقت تک مجھے کسی خفیہ انقلابی

تحریک کا سراغ نہ ملا تھا۔ ڈاکٹر مصدق کا احترام دل میں باقی تھا اور جی چاہتا تھا کہ ان کے رفیقوں اور پرستاروں سے ملوں۔ سب کو معلوم ہے کہ انھیں کے دورِ وزارت میں ایران میں تیل پر غیر ملکی اجارہ داری ختم ہوئی تھی۔ اس کی پاداش میں امریکن سی آئی اے نے شاہ سے مل کر اُن کا تختہ اُلٹ دیا اور بڑی خون ریزی کے بعد گھر پر انھیں عمر بھر کے لیے نظر بند کرا دیا گیا۔

۱۹۶۷ء کے آغاز میں وہ مرض الموت میں مبتلا ہوئے تو علاج کے لیے اپنے فرزند غلام مصدق کے گھر پہنچا دیے گئے۔ ہر روز دفتر آتے جاتے میں حسرت سے اس مکان کو دیکھتا تھا جس کے اردگرد پولیس کا سخت پہرا تھا۔ انتقال کے بعد اُن کی لاش اُن کے گاؤں میں چپکے سے دفن کر دی گئی۔ دل میں سب اُن کی عزّت کرتے تھے مگر ڈر کے مارے کوئی نام نہ لیتا تھا۔ جیسے جیسے میرے تعلقات کا دائرہ وسیع ہوتا گیا مجھے ایسے لوگوں سے ملنے کا اتفاق ہوا جو ان کے معاون اور مددگار رہ چکے تھے۔ ان کے وزیرِ خارجہ اور دست راست ڈاکٹر حسن فاطمی کے چھوٹے بھائی سعید فاطمی میرے عزیز دوست تھے۔ موجودہ حالات کے مدِّنظر نہ میں اس خفیہ انقلابی تنظیم کا نام لکھوں گا اور نہ اس دوست کا جس نے مجھے اس کی خبر دی۔ اُنھیں میں آقائے تکریمی کے فرضی نام سے یاد کروں گا۔ مدّتوں قبل دلّی میں جب کچھ عرصہ آل انڈیا ریڈیو سے میرا تعلق رہا تو ماتحت ہونے کے باوجود یہ میرے ہم نشیں اور ہم خیال ہو گئے۔ عرصۂ دراز تک ہم ایک دوسرے سے بے خبر رہے تاوقتیکہ تہران میں راہ چلتے یکایک ان سے آمنا سامنا ہو گیا۔ کسی دیرینہ ہمدم سے اچانک ملاقات سے جو مسرّت ہوتی ہے اس کا اندازہ اہلِ دل لگا سکتے ہیں۔ آقائے تکریمی مشّاق انجینئر تھے اور مختلف ملکوں میں کام کرنے کے بعد کسی یورپین عورت سے شادی کر کے اب تہران میں رہنے لگے تھے۔ وہ تنہا ایرانی تھے جن سے ملک کی اندرونی سیاست پر بے تکلّفی سے گفتگو ہو سکتی تھی۔ اتنے میں ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ وہ ایک رات ایسے وقت میرے گھر آئے جب ملازم جا چکا تھا اور میں تنہا مطالعے میں مصروف تھا۔ تکریمی کچھ مضطرب تھے اور رازدارانہ لہجے میں کہا کہ "تمھاری مدد کی ضرورت ہے"۔ تفصیل دریافت کی تو کہا کہ ایک مفرور انقلابی کو دو تین

دن کے لیے پناہ کی ضرورت ہے اور تمہارے گھر سے زیادہ محفوظ جگہ اسے نہیں مل سکتی۔ میں سوچ میں پڑ گیا کہ میں یہ خطرہ کیسے مول لوں مگر ایسے موقعے زندگی میں پہلے بھی آ چکے تھے۔ برطانوی دورِ حکومت میں تین چار بار ایسے ہی لوگوں کو مجھے اپنے گھر میں چھپانا پڑا گو کہ ان سے میرا براہِ راست تعلق نہیں تھا۔ میں ان معاملوں میں فقط اسی اصول پر کاربند رہا ہوں کہ جو لوگ کسی بڑے مقصد کی خاطر اپنی جان ہتھیلی پر لیے پھرتے ہیں وہ ہمدردی کے مستحق ہیں۔

کسی خفیہ تنظیم سے واسطہ پڑے تو دستور یہ ہے کہ اپنی طرف سے کرید نہ کی جائے اور اُتنی ہی بات پوچھیں جتنی کہ سُنائی دے۔ چنانچہ میں نے آقائے تکریمی سے صرف یہ پوچھا کہ وہ شخص کہاں ہے؟ جواب ملا کہ نیچے کار میں بیٹھا ہے۔ میرے اجازت دینے پر اُسے اوپر لا کر خالی کمرے میں لٹا دیا گیا۔ حُسنِ اتفاق کہ وہ صورت شکل سے بالکل یورپین لگتا تھا اور فرانسیسی زبان سے پوری طرح واقف تھا۔ میں نے اسے ہدایت کی ہرگز مجھ سے یا ملازم سے فارسی میں بات نہ کرے اور پلنگ پر بیمار بن کر لیٹا رہے۔ اس کے سرہانے دوا کی چند بوتلیں اور فرانسیسی کی دو تین کتابیں رکھ دیں۔ تکریمی تو یہ کہہ کر چلے گئے کہ دو تین دن میں اسے ملک سے باہر بھیجنے کا انتظام ہوتے ہی لے جائیں گے اور میں کھڑکی سے بار بار جھانک کر دیکھتا رہا کہ کوئی مخبر تو سڑک پر نظر نہیں آ رہا ہے۔ بارے انتظار اور وسوسے کے وہ تین دن خیریت سے گزر گئے اور آقائے تکریمی اسے لے کر کہیں چلے گئے۔ اس کے بعد مجھے تھوڑا سا اندازہ اس تنظیم کا ہوا جو جان پر کھیل کر بادشاہت کی بیخ کنی میں سرگرم تھی۔

۱۹۷۰ء کے اواخر میں میرا تبادلہ پیرس ہو گیا۔ ایران کے دورانِ قیام میں ہر طرح کا آرام ملا البتہ وہاں سے چلتے چلتے ناگاہ مجھ پر دُہری بپتا ٹوٹی۔ طویل علالت کے بعد میرے بھائی نے کراچی میں اس دارِ فانی کو خیرباد کہا۔ اُن کی جدائی کا غم میں آج تک محسوس کر رہا ہوں۔ انتقال سے قبل انھوں نے برِصغیر کے فارسی گو شعراء کے کلام کا انتخاب "شعرِ فارسی در ہند و پاکستان" کے نام سے کیا تھا جو تہران کے چاپ خانۂ

اقبال سے شایع ہو کر اہلِ نظر میں مقبول ہوا۔ اُسی وقت میری داہنی آنکھ کی بصارت اس طرح متاثر ہوئی کہ مقامی معالجوں کی ساری کوششیں بے سُود ثابت ہوئیں۔ اس محبوب ملک کو الوداع کہنے کے بعد امّید و بیم کی حالت میں ایک بار پھر اس شہر کی طرف چل پڑا جس سے میری زندگی کی بہت سی یادیں وابستہ تھیں۔

فلسطین میں چند ہفتے

(۱۱)

جولائی ۱۹۷۱ء میں مجھے یونسکو کی اس جماعت کے ساتھ پیرس سے مقبوضہ فلسطین جانے کا اتفاق ہوا جو اقوام متحدہ کے ادارہ برائے فلاح مہاجرین UNRAWA (UNITED NATIONS REFUGEES AND WORKS AGENCY) کے اشتراک سے عرب مدارس کی کارکردگی کا جائزہ لیتی ہے۔ آخری درجۂ تدریس (بارہویں کلاس) کے سالانہ امتحان کی نگرانی کرتی ہے اور ان کی درسی کتابوں کی فراہمی پر نظر رکھتی ہے جو مصر میں تیار ہوتی ہیں۔ یہ انتظام حکومت اسرائیل کے تعاون سے کیا جاتا ہے جس کا اصل مقصد یہ ہے کہ تعلیم یافتہ نوجوان اعلیٰ تعلیم یا روزگار کی تلاش میں ملک سے باہر چلے جائیں مبادا یہاں رہ کر مجاہدوں کی صف میں شامل نہ ہو جائیں۔

جون ۱۹۶۷ء کی جنگ کے بعد اس علاقے میں قدم رکھنے والا میں پہلا پاکستانی تھا ماسوا ایک اور صاحب کے جو بیروت میں عالمی ادارۂ صحت سے وابستہ تھے۔ اقوام متحدہ سے مجھے ایک خاص پروانۂ راہداری ملا تھا جس پر حکومتِ اسرائیل کا ویزا حاصل کیا گیا تھا۔

میرے دورہ کی مدت دو ہفتہ تھی، جس میں سے دس دن غزہ اور اس کی اطراف میں گزرے،

باقی تین دن یروشلم اور دریائے اردن کے مغربی علاقے میں، آخری دن واپسی کے طیارہ کے انتظار میں تل ابیب میں بسر ہوا۔

اس یادگار سفر کا تاثر قلم بند کرنے کا موقع اب ملا۔ اس میں آرام اور تفریح کی نہ طلب تھی نہ توقع۔ میرے لیے یہ ایک قربان گاہ کی زیارت تھی جہاں ابراہیمؑ اور عیسیٰؑ سے لے کر آج تک کا انسان شکست و فتح سے بے نیاز کسی نصب العین کی خاطر اپنے کو قربان کیے جاتا ہے۔

تل ابیب کے مشرق میں لگ بھگ سو میل پر یروشلم ہے اور ان دونوں شہروں کے درمیان "لود" نامی ایرپورٹ ہے۔ پیرس سے میں نے قصداً اسرائیل ایرلائن ال آل کے طیارہ سے سفر کیا۔ مگر یہ تجربہ کچھ خوشگوار ثابت نہ ہوا۔ ہم ابھی جینوا ہی پہنچے تھے کہ طیارہ کو بم سے اڑانے کی دھمکی مشتہر ہوئی اور ہمیں ایک طولانی زمین دوز راستے سے نکال کر ایک دوسرے ہوائی جہاز میں بٹھا کر بلا اطلاع زیورخ پہنچا دیا گیا۔ ال آل کا خالی طیارہ وہاں لایا گیا جو کہ سب کو لے کر منزل مقصود کی طرف روانہ ہوا۔ اقوام متحدہ کے نمائندے نے مجھے بلا دقت ایرپورٹ سے نکال کر یروشلم کے نیشنل پیلس ہوٹل پہنچا دیا اور سرِ راہ سمجھا دیا کہ حالات حاضرہ پر کوئی تبصرہ نہ کرنا اور یہ نہ بھولنا کہ مقامی عربوں میں بہتیرے جاسوس ہیں۔ ہوٹل کے منتظم عرب تھے مگر اس میں مغربی سیاحوں کا ہجوم تھا اور اس کے دیوان خانے میں شام کو موشے دایان جیسے یہودی اکابر بھی پائے جاتے تھے۔

یروشلم کی جملہ آبادی تین لاکھ ہوگی اور اسے تین شہروں کا مجموعہ سمجھنا چاہیے۔ سب سے نئی آبادی یہودیوں کی ہے جو مغربی سرے پر بڑی تیزی سے اوندھے سیدھے گھر بنا رہے ہیں۔ یروشلم کے حسین اور تاریخی پس منظر میں یہ ایسے بدنما لگتے ہیں جیسے اطلس پر ٹاٹ کا پیوند۔ مغربی ملکوں نے اس بدنمائی پر بہت حرف زنی کی لیکن ناخلف اولاد بدچلن والدین کی بات کب سنتی ہے۔ پرانا عرب شہر پہاڑیوں کے دامن میں بسا ہوا ہے اور اس کے باغوں اور مکانوں میں ایک ناقابل فراموش کشش ہے۔ یہ ترکوں کے عہدِ حکومت میں بنا تھا اور اس کا طرز تعمیر استنبول اور قدیم قاہرہ کی یاد دلاتا ہے۔ اس کی نرم اور سبک ہوا میں ایک خاص کیفیت ہے اور گو ان دنوں یورپ میں گرمی تھی لیکن یہاں ہلکی سی خنکی تھی۔ اس سے ملا ہوا وہ فصیل بند تاریخی شہر ہے جسے مسلمان اور عیسائی

بیت المقدس کہتے ہیں اور یہودی بیت اللہ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ یہاں ہر ماہ و موسم میں دور دور سے زائرین اور سیّاح جوق در جوق آتے ہیں۔

اس جگہ زمانے کی رفتار بظاہر رک گئی ہے، پرانے گھروں کے در و بام جنگِ صلیب سے لے کر اب تک جوں کے توں کھڑے ہیں۔ ہر سنگ ریزہ پر چشم بینا کو تاریخ کا نقش پا نظر آتا ہے۔ گلی کوچوں میں یہودی ربی، عیسائی راہب اور عرب درویش اپنے اپنے رسم و رواج پر کاربند نظر آتے ہیں۔

گھنٹوں میں نے حرم شریف پر صرف کیے جہاں صخریٰ اور مسجد اقصیٰ ایک دوسرے کے مقابل کھڑے مسلمانوں کو عزم و عبرت کا درس دے رہے ہیں۔ خلیفہ عبدالولید کے ذوق کی داد کس طرح دی جائے کہ صخریٰ جیسی شاندار عمارت کی نظیر دنیا میں بہت کم ملے گی۔ حکومت اسرائیل سیّاحوں کو پرچانے کے لیے صخریٰ کا ذکر اسی انداز سے کرتی ہے جس طرح بھارت کی حکومت تاج محل کا۔

مسجد اقصیٰ کے اندر اس جگہ جانا منع ہے جہاں کچھ عرصے قبل منبر کو نذرِ آتش کر دیا گیا تھا۔ محافظوں نے کہا کہ ادھر مرمّت کا کام ہو رہا ہے۔ یہاں احاطے کی پشت کے پاس جہاں فصیل گزرتی ہے وہاں یہودیوں کی "دیوارِ گریہ" ہے۔ ان کے عقیدے کے مطابق یہ حضرت سلیمان کی اس عبادت گاہ کے منہدم آثار میں سے ہے جسے دو ہزار سال قبل رومنوں نے مسمار کر دیا تھا اور اس سانحے کے غم میں وہ آج بھی پس دیوار آہ و زاری کرتے ہیں۔ ہیکل سلیمانی کی تجدید کو وہ اپنا فرض عین تصوّر کرتے ہیں اور اس کے زمین دوز خرابوں کی تلاش میں وہ یہاں کھدائی کر رہے ہیں۔ مسجد اقصیٰ کو عرف عام میں مسجد عمرؓ بھی کہتے ہیں کیونکہ فتح یروشلم کے بعد حضرت عمرؓ نے یہاں اس تصوّر کے تحت نماز ادا کی تھی کہ آنحضرتؐ اسی جگہ سے معراج کے لیے تشریف لے گئے تھے۔ صخریٰ کے اندر صندلیں گھیرے کے اندر وہ چٹان ہے جس پر کھڑے ہو کر حضرت ابراہیمؑ نے خدا سے قربانی کا وعدہ کیا تھا۔

فصیل کے اندر دوسرے سرے پر وہ احاطہ ہے جہاں حضرت عیسیٰؑ کی خالی قبر اس مشہور کلیسا میں ہے جو عیسائیوں کی سب سے مقدس زیارت گاہ ہے۔ اس کلیسا کی تعمیر کا کام پانچویں صدی

عیسوی میں مشرقی رومن سلطنت کے بانی شاہ قسطنطین کی ماں کے حکم پر شروع ہوا تھا۔ کلیسا کے چوبی پھاٹک کی چابی سلطان صلاح الدین ایوبی نے ایک عرب امیر کے سپرد کر دی تھی اور اب تک اسی خاندان کے وارث کی تحویل میں موجود ہے۔ یہ بزرگ صبح شام پھاٹک کو کھولتے اور بند کرتے ہیں اور عصا لیے چوب داروں کے ساتھ نہایت مستعدی سے آنے جانے والوں کا محاسبہ کرتے ہیں۔ میرے سامنے انھوں نے دو مغربی عورتوں کو اندر جانے سے روک دیا کیونکہ ان کی کمر کے ارد گرد کوئی قابلِ ذکر پوشش نہ تھی۔ اچھا ہوا کہ وہ عربی سے واقف نہ تھیں کیونکہ موصوف نے انھیں قحبہ اور فاحشہ کے القاب سے یاد کیا، معلوم نہیں یہ الزام صحیح تھا یا غلط۔ جب میں اہلاً و سہلاً کی تبریک کے ساتھ ان سے بغل گیر ہوا اور "انا" پاکستانی کا مژدہ سنایا تو وہ بہت خوش ہوئے اور کان میں چپکے سے کہا کہ تم جس گائڈ کے ساتھ ہو وہ جاسوس ہے اس سے ہوشیار رہنا۔

جدید تحقیق کے مطابق حضرت عیسیٰؑ کے نیم جان اور بظاہر مردہ جسم کو ان کے حواری رات کے اندھیرے میں قبر سے نکال کر شہر سے باہر لے گئے اور انھیں صحت مند کرنے کے بہت جتن کیے لیکن جب حضرت عیسیٰؑ دراصل انتقال کر گئے تو ان کے جسدِ خاکی کو ایک گمنام باغ میں دفن کر دیا۔ واللہ اعلم

زائرین کے ساتھ میں بھی تاریخی کوچۂ غم میں زینہ بہ زینہ عیسیٰ کے نقشِ قدم پر چلا اور میں نے اپنی روح پر اُس صلیب کے بار کو محسوس کیا جو مظلوم انسانیت کے غم میں مدتوں سے اٹھائے پھرتا ہوں۔ اس صلیب کی گراں باری سے میرے منکر نکیر بھی گھبراتے ہیں تاہم اپنی چارہ جوئی کے لیے میں نے کسی حواری کو آواز نہیں دی۔

تا کجا اماں یابد از ہجوم جاں بازاں
گوشہ گیر فانوسی بہر سوختن تنہا

یروشلم سے مشرق کی طرف خشک پہاڑیوں، خوشنما بستیوں اور ویران میدانوں کا سلسلہ دریائے اردن تک چلا گیا ہے۔ وہاں سے اردن کی مملکت شروع ہوتی ہے۔ فلسطین کی تقسیم کے وقت ۱۹۴۸ء میں اس علاقے پر اردن کا قبضہ ہو گیا تھا جو ۱۹۶۷ء کی جنگ تک باقی رہا۔ غلبہ حاصل کرنے کے بعد اسرائیل نے یہاں کے لاکھوں باشندوں کو دریا پار کھدیڑ دیا اور یہودی ان کے مال پر قابض ہو گئے۔ جن عربوں سے ہو سکا وہ یہیں رک گئے اور ہمیں اندازہ ہوا کہ ان کی نبض سست

پڑ گئی ہے۔ جا بجا اسرائیل کے فوجی مورچے اور نو وارد یہودیوں کے ٹھکانے نظر آتے ہیں۔ نبلس اور رملہ وغیرہ وغیرہ کئی چھوٹے چھوٹے شہر ہیں جن کی تنظیم اور ترتیب جنوبی یورپ کی یاد دلاتی ہے اور اسرائیل کے اس دعویٰ کی تردید کرتی ہے کہ اس کے وجود سے پہلے فلسطین ترقی و تہذیب سے بیگانہ تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ صلاحیت و حوصلہ مندی میں فلسطینی عرب یہودیوں سے کچھ کم نہیں اور اگر آزاد ملک میں ان کی شیرازہ بندی ہو جائے تو وہ دوسرے عرب ممالک کے رہبر بن سکتے ہیں۔

ہمارا اصل کام غزہ میں تھا جو یروشلم سے ۶۵ میل دور جنوب میں ہے۔ مقبوضہ علاقوں میں فوجی قانون نافذ ہے اور ان کا انتظام فوجیوں کے ہاتھ میں ہے۔ غزہ کی سڑک پر صرف سرکاری اور فوجی موٹریں چلتی ہیں۔ خاص اجازت نامے کے تحت ہم اقوام متحدہ کی موٹر میں چلے۔ اس کے آگے مسلح یہودی سپاہی جیپ پر ہم رکاب تھے۔ دائیں بائیں ہمیں کوئی آبادی نظر نہیں آئی۔ البتہ درختوں کے جھنڈ اور باغوں کے نشان موجود تھے۔ ہمارے ساتھ یروشلم میں مقیم جو غیر ملکی چلے تھے انہوں نے بتایا کہ یہ زرخیز خطہ پہلے آباد تھا، لیکن اس کے عرب باشندوں کو بھگا دیا گیا جو اب غزہ کے ارد گرد کیمپوں میں بے کسی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ دوربین سے دیکھا تو میدان میں مکانوں کے آثار نظر آئے جنھیں بل ڈوزر سے ہموار کر دیا گیا تھا۔ شام ہونے لگی تھی کہ غزہ میں داخل ہوئے۔ اس قدیم شہر کی آبادی ڈیڑھ لاکھ کے قریب ہے۔ وہ سمندر کے کنارے ایک سرسبز وادی میں بسا ہوا ہے۔ وادی کی جملہ آبادی پانچ لاکھ ہو گی جس میں کثیر آبادی مہاجرین کی ہے جو ۱۹۴۸ء کی جنگ کے بعد یہاں آ گئے تھے۔ ۱۹۶۷ء کی جنگ کے بعد سے یہاں مسلسل شام سے صبح کا کرفیو لگا ہوا ہے۔ مقبوضہ فلسطین میں جنگ آزادی کا سب سے اہم مرکز غزہ تھا۔ ہر مہاجر کیمپ ایک طرح خود مختار قلعہ تھا جس کی پُراسرار فضا میں چھاپہ ماروں کی تربیت ہوتی تھی اور ساتھ ساتھ بیکاری، مایوسی اور انتقام پروری کے ماحول میں ایک بے وطن نسل کی پرورش ہو رہی تھی۔

ظہورِ اسلام سے قبل عرب جن دیویوں کی پوجا کرتے تھے ان میں سے ایک کا نام غزہ تھا، جس سے اس جگہ کا نام عبارت ہے۔ حجاز، مصر اور شام کے درمیان قافلوں کی آمد و رفت کا یہ

مرکز تھا اور کسی زمانے میں اس کی خاصی اہمیت تھی۔ پھر اس پر زوال کا ایسا دور آیا کہ مدتوں کے لیے ایک چھوٹی سی بستی میں سمٹ آیا۔ البتہ اسرائیل کے قیام کے بعد جب یہ مصر کے دائرۂ اختیار میں آیا تو اس کے دن پھرے۔ ایک شہر نو کی تعمیر شروع ہوئی اور سڑکوں، اسکولوں، بازاروں کا سلسلہ دور تک چلا گیا۔ اسرائیل کے قبضے کے بعد شہر پر مردنی سی چھا گئی ہے۔

غزہ میں فقط ایک آرام دہ ہوٹل ساحل سمندر پر تھا جسے اب اسرائیل کے فوجی افسروں کے لیے مخصوص کر دیا گیا ہے۔ وہاں سے ایک میل دور کسی ترک بیوہ ناہید ہادم کا مہمان خانہ تھا جس میں اقوام متحدہ کے کارکنوں کی رہائش کا انتظام تھا۔ ستر سال کی عمر کے باوجود ناہید ہادم نہایت مستعد خاتون تھیں اور یہودیوں کو ترکی بہ ترکی سنانے سے باز نہ آتی تھیں۔ غزہ میں ان کی آدھی عمر گزر چکی تھی اور جب موقع ملتا وہ مجھے انگریزوں اور یہودیوں کی زیادتیوں کا آنکھوں دیکھا حال سنایا کرتی تھیں۔ اپنے ہم کاروں کے ساتھ دس دن میں انھیں کے ہوٹل میں مقیم رہا۔ ہمارا روزانہ معمول تھا کہ صبح سویرے اقوام متحدہ کے دفتر میں میٹنگ میں شرکت کے بعد تعلیم گاہوں کے معائنے پر نکل جاتے جہاں بارہویں جماعت کے امتحان ہو رہے تھے۔ دو بجے لوٹتے تو کھانے کے بعد جس کا جی جہاں چاہتا چلا جاتا۔ باقی لوگ تو عموماً نہانے کے لیے سمندر کا رُخ کرتے اور میں شہر کی طرف چل پڑتا کہ وہاں کی زندگی سے واقف ہونے کا یہی وقت تھا ورنہ کرفیو کی وجہ سے سرِ شام سب کا کاروبار بند ہو جاتا تھا۔

غزہ نے ہزاروں سال کی عمر پائی اور اس دوران کئی بار اجڑا اور بسا۔ جو چند ایک تاریخی آثار بچ رہے وہ قابلِ ذکر ہیں۔ شارع ہاشم پر ایک چہار دیواری کے اندر زمانۂ قدیم کے ہیرو سمسون (SAMSON) کی قبر ہے جس کی فلم آپ سب نے دیکھی ہوگی۔ وہاں سے تھوڑی دور ایک مسجد کے صحن میں رسول اللہ کے دادا حضرت ہاشم کا مزار ہے۔ پرانے محلے کے ایک بوسیدہ مکان کو امام شافعی کا مسکن بتایا جاتا ہے۔ اس کے پاس جامع مسجد ہے جو کسی کلب کی بدلی ہوئی شکل ہے۔ پہلے یہ غزہ دیوی کا مندر ہوگا کیونکہ مسجد کی دیوار میں کہیں کہیں اس کی مورت باقی رہ گئی ہے۔ سڑکوں پر سخت فوجی پہرا تھا۔ ذرا ذرا دیر میں جیپ یا ٹرک پر مسلح سپاہی گردش کرتے نظر آتے تھے۔ ان میں کوئی کوئی صورت شکل میں عرب لگتا تھا۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ یہ دروز فرقے کے لوگ ہیں جو فاطمی خلیفہ

حکیم کے پرستار ہیں اور کیونکہ اسمٰعیلی فرقے سے بھی عقیدے میں دور ہیں اس لیے یہ نہیں معلوم کہ وہ مسلمان ہیں یا کچھ اور۔ جنگِ صلیب کے وقت انھوں نے عیسائیوں کی مدد کی تھی اور اب (کم از کم اس علاقے میں) اسرائیل کے ہمنوا ہیں۔ کیونکہ یہ لوگ نسلی اور لسانی اعتبار سے عرب ہیں، یہودی ان سے خوب کام لیتے ہیں۔

شہر میں جگہ جگہ مکان توپ دم کر دیے گئے تھے۔ یہودیوں کو جب کسی عرب کو سزا دینا ہوتا ہے تو اس کے گھر پر بُل ڈوزر چلا دیتے ہیں۔ چنانچہ شہر کی حالت اس شکل کی سی ہو گئی ہے، جس پر چیچک کے داغ نکل آئے ہوں۔ کہیں کہیں سینما یا بار کا نام نظر آتا تھا لیکن اس پر تالے پڑے ہوئے تھے۔ میں سمجھا کہ اسرائیلی حکام کی کارستانی ہے۔ لیکن عربوں نے بتایا کہ ۱۹۶۷ء کی جنگ کے بعد انھوں نے خود ساری تفریح گاہوں کو بند کر دیا۔ جب کوئی قوم حیات و ممات کی جنگ میں مبتلا ہو تو اسے سیر تماشے کی مہلت کہاں۔ میں نے غور کیا کہ کوئی عرب کسی یہودی سے مخاطب نہ ہوتا تھا۔ مسلسل ظلم و تشدد کے باوجود اس کا حوصلہ بلند اور ایمان راسخ تھا۔ میں نے اس جذبے کی کئی مثالیں دیکھیں۔

شارع ہاشم پر الزہرہ نامی زنانہ اسکول تھا جس میں کئی سو لڑکیاں امتحان دے رہی تھیں۔ عمارت کے ارد گرد چار دیواری تھی اور پھاٹک پر چند فوجی مشین گنیں لیے بیٹھے رہتے تھے۔ احاطے میں ترکوں کے زمانے کا چھوٹا سا بنگلہ تھا جس میں اسکول کے ناظم کا دفتر تھا۔ نپولین بونا پارٹ نے اٹھارویں صدی کے آخر میں مصر کو فتح کیا تو مراد بے کا تعاقب کرتے ہوئے غزہ تک آیا اور چند روز اسی بنگلہ میں ٹھہرا۔ اس کے ایک کمرے میں بیٹھ کر میں کبھی نصاب کی تنقیح اور درسی کتابوں کی ورق گردانی کرتا، اور کبھی اسکول کے گشت پر نکل پڑتا جہاں طالبات بڑے انہماک سے پرچوں کا جواب لکھ رہی تھیں اتنے میں شور اٹھا کہ سپاہی احاطے میں گھس آئے ہیں۔ لڑکیوں نے برآمدے میں آ کر انھیں بُرا بھلا کہنا شروع کیا اور امتحان دینے سے انکار کر دیا تاوقتیکہ وہ باہر نہ چلے جائیں۔ اسکول کے عرب ناظم سے میری خاصی ملاقات ہو گئی تھی۔ اس نے بتایا کہ گزشتہ سال انھیں حالات میں فوجیوں نے لڑکیوں کو زدوکوب کیا تھا جس کی وجہ سے شہر میں ہنگامہ برپا ہو گیا۔ یہ سُن کر میں نے اسرائیلی انسپکٹر آف اسکول کو فون کیا۔ وہ فوراً آیا اور عبرانی زبان میں فوجیوں کو کچھ نصیحت کی، جس کا اثر یہ ہوا کہ وہ احاطہ

چھوڑ کر عمارت کی چھت پر چلے گئے۔

ہمارے دورانِ قیام میں غزہ میں روز دستی بم پھٹتے اور دو چار آدمیوں کے زخمی یا گرفتار ہونے کے واقعات ہوتے رہتے۔ وہاں کی زندگی کا یہ ہی معمول تھا۔

کبھی کبھی شام کو میں سمندر کے کنارے اقوام متحدہ کے کلب میں جا بیٹھتا تھا۔ اسرائیلی تسلّط سے پہلے یہاں کی چھوٹی سی بندرگاہ میں خوب چہل پہل رہتی تھی۔ مصر کے سیکڑوں سیّاح سیر کے لیے آتے تھے اور کشتیوں کا ہجوم ہوتا تھا۔ لیکن اب کشتی رانی کی قطعاً ممانعت تھی اور ہر طرف ہُو کا عالم تھا۔ اندھیرا ہوتے ہی ہر شام کو ایک فوجی جیپ ٹریلر سے ریت کو ہموار کرنے لگتی تھی۔ اس حرکت کا مقصد یہ تھا کہ رات کو اگر کوئی سمندر سے ساحل پر اُترے تو ریت پر اس کے پاؤں کے نشان سے سراغ لگ سکے۔

کلب کے پاس کے ہوٹل میں یہودی فوجیوں کا جمگھٹ رہتا تھا۔ ایک شام انھوں نے بندوق سے ٹریسر گولیاں داغنا شروع کیں جس سے تاریک فضا دور دور تک روشن ہو گئی۔ ساتھ ہی ساتھ مشین گن چلانے لگے گویا چاند ماری کا وقت نہ تھا۔ میرے جرمن ساتھی نے کہا کہ آج رات کوئی معرکہ ہونے والا ہے۔ مناسب ہے کہ یہاں سے چل پڑیں۔ چند سال سے وہ اقوام متحدہ کے پروگرام کے تحت غزہ میں ایک ٹیکنیکل اسکول کا نگراں تھا اور یہاں کے نشیب و فراز سے خوب واقف تھا۔ گولیوں کا رُخ شمال میں ہبالیہ کیمپ کی جانب تھا۔ اس جرمن کے قیاس کے مطابق یہودی وہاں کے باشندوں کو کسی خطرے سے ہوشیار کر رہے تھے۔ یہ گمان صحیح ثابت ہوا کیونکہ آدھی رات کے بعد بموں اور گولیوں کے مسلسل شور نے ہوٹل میں ہمیں سوتے سے جگا دیا۔ یہ معرکہ صبح تک جاری رہا۔ اس کی تفصیل اس وقت معلوم ہوئی جب ایک اسپتال کے سامنے ہم نے لوگوں کی بھیڑ دیکھی۔ معلوم ہوا کہ چند چھاپہ ماروں نے اپنے دو رفیقوں کو ایک ویران عمارت میں چھپا رکھا تھا۔ پچھلے دن جب اسرائیلی فوجیوں کو خبر ملی تو انھوں نے مکان کو گھیر لیا اور چھاپہ ماروں کو ڈرا دھمکا کر خود سپردگی کا مطالبہ کرتے رہے۔ جب وہ نہ مانے تو رات کو عمارت پر حملہ ہوا اور گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ ان میں سے کچھ شہید اور زخمی ہوئے باقی اندھیرے میں فرار ہو گئے۔ ہمیں یہ نہ معلوم ہو سکا کہ کتنے یہودی مارے گئے۔ ایک مفرور چھاپہ مار نوجوان کو میں نے کسی تعلیم گاہ میں

معائنہ کے وقت دیکھا۔ ایک کمرہ باہر سے بند تھا، لیکن اندر کسی کی جھلک نظر آئی۔ ایک ہفتہ کی مدّت میں میں غزہ کے عربوں میں مقبول ہو چکا تھا کیونکہ انھیں میری ہمدردی کا یقین تھا۔ چنانچہ اسکول کے ایک عرب نے رازدارانہ بتایا کہ رات کے معرکہ میں اس نوجوان کا بھائی شہید ہو گیا اور اس نے بھاگ کر یہاں پناہ لی ہے۔ اس نوعمر مجاہد کا زخمی ہاتھ پٹّی میں بندھا ہوا میز پر ٹکا ہوا تھا اور وہ پتھرائی ہوئی آنکھوں سے خلا میں کسی کو ڈھونڈ رہا تھا۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ اسے کس طرح دلاسا دوں۔

غزہ کی جیل میں تقریباً ڈیڑھ سو طلبہ اور طالبات کے امتحان کا مرکز قایم کیا گیا تھا۔ یوں تو مقبوضہ علاقوں کے اسکولوں میں مدرسوں، کتابوں اور سائنٹیفک تجربہ گاہوں کا عام فقدان تھا، تو پھر جیل میں یہ سامان کون مہیّا کرتا۔ ان میں سیاسی الزام میں سزا یافتہ طالب علم بھی تھے اور نظر بند بھی۔ ان سب کی اخلاقی جرأت سبق آموز تھی لیکن وہ لڑکی مجھے کبھی نہ بھولے گی جسے چھاپہ ماروں کی کمک کی پاداش میں طویل قید کی سزا دی گئی تھی اور اب ایک تنگ کوٹھری میں تنہا امتحان دے رہی تھی۔ میرا مقصد مقبوضہ علاقوں کے چشم دید حالات بیان کرنا ہے، حکومت اسرائیل کے مظالم کی فہرست گنوانا نہیں۔ اس کے لیے اقوام متحدہ کی اس خصوصی کمیٹی کی رپورٹ سے رجوع کرنا چاہیے، جو نیویارک سے وقتاً فوقتاً شایع ہوتی رہتی ہے۔ فلسطینی عربوں پر اسرائیل کے مظالم کی خونیں داستان یہ کمیٹی سالہا سال سے مرتّب کر رہی ہے، البتہ اس کا ذکر کم سُنا جاتا ہے۔

غزہ میں اپنا کام ختم کر کے ہم واپسی کی تیاری کر رہے تھے کہ یک بیک اسرائیلی فوجیوں نے مہاجر کیمپوں کے اندر زبردستی سڑکیں بنانے کی مہم شروع کر دی۔ اس طرح اقوام متحدہ کے فیصلوں کی خلاف ورزی کر کے کیمپوں کے انہدام اور مہاجروں کی جمعیت کے انتشار کی کارروائی کی ابتدا ہوئی۔ حالیہ اطلاعات سے معلوم ہوتا ہے کہ وادیٔ غزہ کی زرخیز زمینوں پر نووارد یہودی قابض ہونے لگے ہیں۔

مجھے غزہ کے جنوب میں سو میل تک جانے کا اتفاق ہوا جہاں دشتِ سینا کا ڈانڈا ملتا ہے اور اس کے آگے کسی غیر فوجی کو جانے کی اجازت نہیں۔ میں نے سرِ طور کوئی برق لہراتی نہ دیکھی

صرف لن ترانی کی صدائے بازگشت سنی۔

روانگی سے پہلے ایک مقامی مخلص نے ظہر کے وقت میری الوداعی دعوت کی جس میں ان کے چند رفیق شریک تھے۔ تعارف کے بغیر میں سمجھ گیا کہ وہ مجاہدوں کی خفیہ تنظیم کے ارکان ہیں۔ چھوٹتے ہی انھوں نے مشرقی پاکستان کی بغاوت کا ذکر چھیڑا۔ اس سلسلے میں ان کی معلومات یک طرفہ تھیں اور پاکستان سے ہمدردی کے باوجود ان پر ہندوستانی پروپیگنڈہ کا اثر واضح تھا۔ ایک مشکل یہ تھی کہ اس وقت اردن کے شاہ حسین سے اہلِ فلسطین کو سخت نفرت تھی اور جنرل یحییٰ خاں کی حکومت سے موصوف کے خاص تعلقات تھے۔ ان کے سوالوں کے جواب میں میں پاکستانی عوام کے جذبات کی ترجمانی کر سکا۔ حاکموں کی مصلحتوں کا جواب میرے پاس نہ تھا۔ اس کے بعد فلسطین کا ذکر چھڑا تو بات اول جنگ عظیم سے شروع ہوئی۔ عیسائی سامراج اور یہودی سرمایہ کے اتحاد پر مجھے علامہ اقبال کے چند شعر یاد آگئے جن کے ترجمے نے انھیں بہت محظوظ کیا ؎

تاریک ہے افرنگ مشینوں کے دھوئیں سے
یہ وادیٔ ایمن نہیں شایانِ تجلّی
ہے نزع کی حالت میں یہ تہذیبِ جواں مرگ
شاید ہوں کلیسا کے یہودی متولّی
تاک میں بیٹھے ہیں مدّت سے یہودی سُود خوار
جن کی روباہی کے آگے ہیچ ہے زورِ پلنگ
خود بخود گرنے کو ہے پکّے ہوئے پھل کی طرح
دیکھیے پڑتا ہے آخر کس کی جھولی میں فرنگ

فلسطین کے عربوں کو مخاطب کر کے اقبال نے کہا تھا ؎

زمانہ اب بھی نہیں جس کے سوز سے فارغ
میں جانتا ہوں وہ آتش ترے وجود میں ہے

تری دوا نہ جنیوا میں ہے نہ لندن میں
فرنگ کی رگِ جاں پنجۂ یہود میں ہے
سُنا ہے میں نے غلامی سے امّتوں کی نجات
خودی کی پرورش و لذّتِ نمود میں ہے

ہمارے میزبان نے کہا کہ یہ اشعار چالیس سال پہلے ارشاد ہوئے تھے اور ان کی دونوں پیش گوئیاں صحیح ثابت ہوئیں۔ مغربی ممالک میں صنعتی کثافت نے ایسی افراتفری پیدا کر دی ہے کہ یہ مسئلہ ان کے سلجھائے نہیں سلجھتا۔ علاوہ بریں پاپائے اعظم نے فتویٰ دے دیا کہ حضرت عیسیٰ کی شہادت کی ذمّہ داری یہودیوں پر نہیں، کالے چوروں پر ہے تو گویا یہودی کلیسا کے متولّی ہو گئے یعنی دو ہزار سال تک یہودی کو عیسائی جس جرم کی سزا دے رہے تھے وہ بے بنیاد تھا۔ اب اس غلطی کا کفارہ ادا کرنے کے لیے وہ عربوں کے استحصال میں یہودیوں کا ہاتھ بٹا رہے ہیں۔ اس تبصرے پر ایک صاحب نے انتباہ کیا کہ مغربی مدبّروں کی فراست کی داد دیجیے کہ یہودیوں کے سینے میں دو ہزار سال سے جو آتشِ انتقام سلگ رہی تھی اس کا رُخ یکبارگی عربوں کی طرف کر دیا جنھوں نے ان سے ہمیشہ رواداری کا سلوک کیا تھا۔

رخصت کے وقت میرا دل غزہ کے عربوں کے لیے احترام سے لبریز تھا۔ ایک لحاظ سے وہ سامراج سے نبرد آزما تھے اور دوسرے لحاظ سے وہ جنگِ صلیب کے دورِ جدید میں ہراول دستے تھے۔

واپسی پر ہمیں موٹر سے دوپہر کو تل ابیب پہنچا دیا گیا تاکہ رات کو لود کے ایرپورٹ پہنچنے میں آسانی ہو۔

اس شہر کی داغ بیل سمندر کنارے سپاٹ میدان میں ۶۵ سال پہلے رکھی گئی تھی اور اب اس کا حلیہ امریکن شہروں سے ملنے لگا ہے۔ یہاں کسی عرب کو رہنے کی اجازت نہیں اور غیر یورپین یہودی بھی خاکروب، موچی اور چپراسی کے بھیس میں نظر آتے ہیں۔ گرانی کا حال نہ پوچھیے۔ ہوٹل میں کمرے کا کرایہ تیس ڈالر تھا جس میں جملہ آسایش کے علاوہ دیوار میں ایک

خفیہ مائی کروفون بھی نصب تھا۔ مسافروں کو تحریری تاکید کی گئی تھی کہ سڑک کی طرف کھڑکی نہ کھولیں ورنہ جان و مال کی خیر نہیں۔

سڑکوں پر گہما گہمی اور دوکانوں میں سامان کی فراوانی تھی۔ ایک تو یہودی تجارت میں یوں ہی کائیاں ہوتے ہیں اور پھر مغربی ملکوں سے چندے کی ایسی موٹی رقم وصول ہوتی ہے کہ وارے نیارے ہیں۔ دورِ حاضر کی یہ واحد مثال ہے کہ ایک قوم سمندر پار کر کے دوسرے ملک پر قبضہ کر لے، اس کے باشندوں کو مار کر نکال دے اور ان کا مال اسباب چھین لے۔ اس کے صلے میں اس پر انعام و اکرام کی بارش ہوتی ہے حتیٰ کہ مغربی جرمنی سے تاوان بھی وصول ہوتا ہے۔ ملک بدر عربوں سے خفگی کا اظہار ہوتا ہے کہ وہ اس صورت حال کو صبر و شکر سے قبول کیوں نہیں کرتے۔

شہر کو ادھر ادھر سے دیکھا تو نئے پن کے سوا کوئی بات قابلِ ذکر نظر نہ آئی۔ جی چاہا کہ حیفہ میں بہاء اللہ کی قبر بھی دیکھ آؤں لیکن وارنہ بیٹھا کیونکہ یہاں اسرائیل کا بحری اڈہ ہے۔

رات کو سونے کا وقت نہ ملا کیونکہ صبح سویرے ایرپورٹ پہنچنے کے لیے ہوٹل سے دو بجے چل پڑنا تھا۔ اس کے پرشکوہ دیوان خانہ میں یہودی سیٹھوں کی بھیڑ تھی اور اس کی رقص گاہ طرب و نشاط سے گونج رہی تھی۔ میرے لیے یہ دُور کا جلوہ تھا۔ میرا دل اپنے دور افتادہ ملک کے غم میں ڈوبا ہوا تھا، جو ان دنوں خانہ جنگی کی آماجگاہ بنا ہوا تھا اور اس غم میں وہ رنج بھی سمویا ہوا تھا جو غزہ کے سفر میں مجھے ودیعت ہوا تھا۔

آج بھی فلسطین اس صلیب کا بار اٹھائے ہوئے ہے جس کی گرانی نے عیسیٰ کو شہادت کا مرتبہ عطا کیا تھا۔

اسپین کی جھلکیاں

(۱۲)

غرناطہ کے جنوب کی طرف آنکھ اُٹھاؤ تو چند میل دور پہاڑ کی ایک چوٹی نظر آئے گی جسے ہسپانوی زبان میں مسلمان کا دم واپسیں LADE NIER SUPIRO DE MORO کہتے ہیں۔ روایت کے مطابق یہی وہ جگہ ہے جہاں اُندلس میں ۱۴۹۲ء میں مسلم اقتدار کا چراغ ہمیشہ کے لیے گُل ہو گیا۔ جان کی امان حاصل کر کے الحمرا کا قلعہ عیسائی فاتحوں کے سپرد کرنے کے بعد امیر ابو عبداللہ نے آبدیدہ نگاہوں سے غرناطہ کو آخری بار دیکھا اور آہِ سرد کھینچ کر مراکش کی طرف چل پڑا۔ اُس کی ماں نے غصّے سے کہا کہ اے بزدل جس ملک کی حفاظت تو اپنے خون سے نہ کر سکا اُس کے لیے آنسو بہانے سے کیا حاصل ہے۔ ابو عبداللہ نے اپنی یادداشت تحریر کی تھی جو مراکش میں شایع ہو چکی ہے، لیکن مجھے اسے دیکھنے کا اتفاق نہ ہوا۔ تاایں دم مراکش میں ان مہاجروں کے ایسے وارث موجود ہیں جن کے پاس غرناطہ کی آبائی جائداد کے کاغذات اور مکانوں کی چابیاں محفوظ ہیں۔ اسی وقت عیسائی فاتح فرڈی نینڈ اور ملکہ ازابیل نے کولمبس کو اس مہم پر روانہ کیا جس نے نئی دنیا (امریکہ) کا پتہ چلایا۔ اس طرح تاریخ کا ایک پرانا دور ختم ہوا اور ایک نیا دور شروع

ہوا۔ رومن کلیسا کی ہدایت پر ایک طرف اسپین میں مسلمانوں کا اور دوسری طرف مقبوضہ امریکہ میں انڈین قبیلوں کا جس طرح قتل عام ہوا وہ تاریخ کا لرزہ خیز باب ہے۔

۱۹۶۲ء میں مجھے اسپین میں ایک ماہ گزارنے کا موقع ملا جس کا بیشتر حصہ اُندلس میں صرف ہوا۔ پانچ سو سال گزر جانے کے بعد بھی وہاں کے سماج پر عربوں کی تہذیب کا نقش ابھی باقی ہے۔ صورت و شکل، رقص و موسیقی، بود و باش غرض کہ زندگی کے ہر شعبے پر یہ اثر نمایاں ہے اور اب وہاں باشندے اس دور کا ذکر فخر سے کرتے ہیں اور اسے اپنی تاریخ کا عہد زرّین قرار دیتے ہیں۔ اسپین میں جا بجا بالعموم اور اُندلس میں بالخصوص عربوں کے بنائے ہوئے پُلوں، قلعوں اور شہر پناہوں کے آثار ملتے ہیں البتہ فن عمارت سازی کے جو مشہور نمونے باقی رہ گئے ہیں اُن میں غرناطہ کا الحمرا، قرطبہ کی مسجد اور سیویل کا القصر نامی محل قابلِ ذکر ہیں۔ قرطبہ کے پرانے حصّے میں شہر پناہ کے اندر وہ محلہ "ذاکو" تو دیدنی ہے۔ وہی قدیم عرب مکان جن کے صحن میں فوّارے چلتے ہیں اور سامنے مردانہ حصّہ ہے تو پائیں باغ کی طرف زنانہ حصّہ۔ سڑکیں گو پتھر کی ہیں لیکن اتنی تنگ کہ ان میں موٹر کا سمانا ناممکن ہے۔ کہیں جلیبی تلی جا رہی ہے تو کہیں کباب تیار ہو رہے ہیں۔ کلیسا کی سخت گیری میں اتنا تو فرق آیا کہ مسجد قرطبہ کا ایک حصّہ مسلمانوں کو نماز کی ادائیگی کے لیے دے دیا گیا۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں اقبال نے اپنی ولولہ انگیز نظم مسجد قرطبہ لکھی تھی۔

اسپین سے عربوں کے انخلاء کے بعد گزشتہ پانچ سو سال میں ہسپانوی زبان کی لغت بہت کچھ بدل چکی ہے تاہم عربی الفاظ خاصی تعداد میں موجود ہیں۔ ان کی ترکیب مقاموں کے نام کے ساتھ عموماً ملے گی اور لوگ بات بات پر ایج کہتے ہیں جو اللہ سے عبارت ہے اور صاحب جناب کے معنوں میں استاد استعمال کرتے ہیں۔ جنوب میں ایک شہر جواریز (JUAREZ) ہے جس کا نام شیراز سے عبارت ہے۔ چاول کے ایک مقبول پکوان کا نام "پلّو" ہے جو دراصل "پلاؤ" کی بدلی ہوئی شکل ہے۔ موسیقی کے ساز و انداز پر عربی اثر بہت غالب ہے۔ اُندلس کے لوک گیت ہی نہیں بلکہ ادب بھی اس عہد رفتہ کی یاد میں سوگوار ہے۔ جدید ہسپانوی ادب کی ابتدا جس ڈان کوئک زوٹ (DON QUIXOTE)

نامی ناول سے ہوتی ہے اس پر مشرقی داستان کا اثر بہت گہرا ہے۔ رتن ناتھ سرشار کا ناول "فسانۂ آزاد" کا ہیرو آزاد اور اس کا مصاحب خوجی کا کردار ڈان کوئیک زوٹ اور اس کے ملازم سن کوپن زا (SAN CHO PANZA) سے مستعار ہے۔

ہسپانوی زبان کی سب سے پرانی نظم "سی آئی ڈی" ہے جو شاید سعید یا سیّد کی کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ اس نظم پر عربی روایت کا اثر نمایاں ہے۔ اُس زمانے میں بعض مغربی زبانوں میں غزل گوئی کی رسم بھی پڑ گئی تھی اس کا نقش مغربی فرانس کی زبان —— "پروانسال (PROVENCAL) میں جَنزل کے نام سے دیر تک باقی رہا۔

غرناطہ پہاڑوں کے دامن میں بسا ہوا ہے۔ ایک بلندی پر شہر آباد ہے۔ دوسری پر الحمرا کی شکستہ عمارتوں کے آثار ہیں اور دونوں کے درمیان دو تین میل نشیبی وادی ہے جس میں ایک ندی بہہ رہی ہے۔ شہر میں پُرانے دور کی بچی کھچی عمارتوں میں قابلِ ذکر "مدرسہ" ہے جسے میں نے کوتوالی کی طرح استعمال ہوتے دیکھا، لیکن سُنا ہے کہ اب اسے یونیورسٹی کے سپرد کر دیا گیا ہے۔ شہر کے باہر پہاڑی غاروں میں وہ جپسی رہتے ہیں جن کے متعلق مشہور ہے کہ اُن عربوں کی اولاد ہیں جو پندرھویں صدی میں کلیسا کے جبر سے بچنے کے لیے خانہ بدوشوں سے جا ملے تھے۔ امن و امان قایم ہونے کے بعد انھوں نے ان غاروں میں ایسا آسن جمایا کہ یہیں کے ہو رہے۔ البتہ ان میں بجلی کے قمقمے لگ گئے ہیں اور سیّاحوں کے غول جپسی رقص و سرود کے شوق میں یہاں جمع رہتے ہیں۔ جب میں نے جپسی بولی کے چند الفاظ انھیں سنائے اور بتلایا کہ ان کی جنم بھوم (برِصغیر) کا رہنے والا ہوں تو وہ بہت خوش ہوئے اور میری خوب خاطر کی۔ کئی محققوں کا خیال ہے کہ جپسیوں کا اصلی وطن وہ علاقہ ہے جسے اب پاکستان کہتے ہیں۔ اس قیاس کی شہادت اُن کی بولی سے بھی ہوتی ہے۔ عیسوی صدی کے اوائل میں جب وسطی ایشیا سے جنگ جو قبیلوں نے یکے بعد دیگرے یورش شروع کی تو قدیم باشندے جنوب کی طرف بھاگنے پر مجبور ہو گئے۔ عین ممکن ہے کہ ان میں سے کئی لوگ حملہ آور قبائلیوں میں خلط ملط ہو کر مغرب کی جانب چل پڑے ہوں اور پھر خانہ بدوشی کو اپنا مستقل شعار بنا لیا ہو۔ اسپین میں جپسیوں کی زبان سے پانی، کالا،

چڑی (چڑیا) جیسے الفاظ سننے میں آئے۔ الحمرا سے ایسا رومانی تصوّر وابستہ ہے جو ایک مٹی ہوئی تہذیب کی عظمتوں کی یاد دلاتا ہے۔ عہدِ وسطیٰ کے طرزِ تعمیر کے مطابق غرناطہ کے عرب امیر یکے بعد دیگرے فصیل کے اندر عمارتیں بناتے رہے تا ایں کہ یہ شاہی محلہ خود کفیل ہو گیا۔ وہاں کے حاکموں کا دربار ہنرمندوں اور فن کاروں کی آماجگاہ بن گیا۔ انقلابِ زمانہ نے اس پُررونق بستی کو یوں اجاڑا کہ اب وہاں صرف محل باقی رہ گیا جو الحمرا کے نام سے معروف ہے۔ ماہروں کی نظر میں محل وقوع اور فنی اعتبار سے یہ عمارت لاجواب ہے۔ شہر کے مقابل کا حصّہ دربارِ عام اور شاہی دفتر کے لیے مخصوص ہے۔ اس کی مرمریں اور طولانی دیواریں بہتیرے دریچے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک سے شہر غرناطہ کی مکمل تصویر نظر آتی ہے گویا افق پر جڑی ہوئی ہو۔ وہاں سے فوّاروں کی آغوش میں رنگ برنگی روش پیچھے کے خوبصورت حرم سرا کو جاتی ہے اور اس کے جس جھروکے سے دیکھو پہاڑ کی برف پوش چوٹی کا نظارہ ہوتا ہے۔ الحمرا کا پرانا باغ اصلی صورت میں ابھی باقی ہے جس میں لبنان سے درآمد کردہ ہفت صد سالہ دیودار (CEDAR) درخت ماضی کا نوحہ سنا رہے ہیں۔ اس خرابے کے صدر دروازے کے اندر ایک عمارت کو ہوٹل بنا دیا گیا ہے۔ میں دو دن اس میں ٹھہر کر کبھی شکستہ در و دالان میں گھومتا، کبھی روایتی سازوں پر پُرانی دھنیں سُنتا اور کبھی مقامی لوگ اس داستانِ پارینہ کی یاد تازہ کرتے ہیں جس کا آخری ورق یہاں لکھا گیا تھا۔

اسپین میں خانہ جنگی کو ختم ہوئے بیس سال سے زیادہ عرصہ گزر چکا تھا، لیکن اس کے زخم تازہ تھے۔ خوف و ہراس کی وجہ سے اجنبیوں سے کوئی کچھ نہ کہتا تھا اور جنرل فرانکو کی فاشسٹ آمریت نے تحریر و تقریر کی آزادی یکسر سلب کر لی تھی۔ البتہ جنگ کی بربادی کے ظاہری آثار بہت کم نظر آتے تھے۔ میڈرڈ کی طرح کئی شہروں کا تو رنگ روپ ہی بدل گیا تھا۔ اسپین کی تعمیرِ نو میں ان جرمنوں کا بھی ہاتھ تھا جو نازیوں کی شکست کے بعد سرمایہ لے کر یہاں بھاگ آئے تھے۔

اس موقع پر مجھے ایک دلچسپ واقعہ یاد آیا۔ یہ ۱۹۵۷ء کی بات ہے۔ میں

پیرس میں یونسکو کے دفتر میں کام کر رہا تھا کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی اور میر غلام علی تالپور کی آواز آئی۔ یہ پاکستان میں کچھ عرصے وزیر تعلیم رہ چکے تھے اور صحیح معنوں میں پُرانی وضع کے رئیس تھے۔ کراچی جم خانہ کلب کے سامنے ان کی کوٹھی کے دروازے صبح سے دوپہر تک اس طرح کھلے رہتے تھے کہ جس کا جی چاہے طعام خانے میں گھس کر بیرے سے ناشتہ یا کھانا طلب کرلے۔ میر صاحب بالائی منزل میں اپنے مصاحبوں کے ساتھ گپ شپ میں مصروف ہوتے۔ جب میں کوئی ضروری فائل لے کر ان کی خدمت میں حاضر ہوتا تو فرماتے کہ یہ سب میرے رازداں ہیں، آپ بلا تکلّف اپنی بات کہیں۔ میں عذر کرتا کہ معاملے کی نوعیت نازک ہے تو اُٹھ کر برآمدے میں آجاتے اور پڑھے بغیر کاغذات پر یہ کہہ کر دستخط کر دیتے کہ آپ پر مجھے کامل اعتماد ہے۔ فون پر میر صاحب کی آواز سُن کر مجھے دلی خوشی ہوئی اور میں دفتر سے اُٹھ کر ان کے ہوٹل پہنچا۔ انھوں نے بتلایا کہ صدر اسکندر مرزا کے ساتھ اسپین جاتے ہوئے وہ چند روز کے لیے پیرس میں ٹھہرے ہیں۔ اسکندر مرزا بذاتِ خود اپنی بیگم کے ساتھ پرنس علی خاں کے مہمان تھے۔ میر افلیٹ علی خاں کی کوٹھی کے پاس ہی تھا۔ چائے نوشی کے بعد میر صاحب نے کہا "اسکندر مرزا کی طرف جا رہا ہوں تم بھی ساتھ چلے چلو تو ان سے تعارف ہو جائے"۔ بعد میں معلوم ہوا کہ جنرل فرانکو کی دعوت پر اسکندر مرزا اس غرض سے اسپین گئے تھے کہ اس کے طرزِ حکومت کا مطالعہ کریں۔ یہاں سراغ ملتا ہے اس منصوبے کا جو ۱۹۵۸ء میں مارشل لا کے نفاذ کی صورت میں ظاہر ہوا۔

یہاں اسپین کی اس مقبول تفریح کا ذکر بے محل نہ ہوگا جسے اردو میں "آ بیل مجھے مار" کہا جا سکتا ہے۔ تعجب ہے کہ دورِ بربریت کی یہ یادگار ہنوز اسپین کے علاوہ جنوبی امریکہ میں بھی باقی ہے جسے ہسپانوی نسل نے آباد کیا ہے۔ قارئین نے کتابوں اور فلموں میں اس کا حال معلوم کیا ہوگا کہ کس طرح وحشت زدہ بیلوں کو میدان میں لا کر تلواروں سے کچوکے دیے جاتے ہیں کہ وہ تنگ آکر اس شخص پر جھپٹیں جو بلا دقّت اس کا کام تمام کر دیتا ہے۔ نہ اس میں بہادری کا کوئی پہلو ہے اور نہ تفریح کا۔ یہ الگ بات ہے کہ تماشائیوں کو اس قسم کی خوشی ہوتی ہے جو بے گناہ جانوروں کا شکار

کرنے سے ہوتی ہے۔

اسپین کے دو بڑے شہر "میڈرڈ" اور "بارسیلونا" ہیں۔ ان میں یہی فرق ہے جو انقرہ اور استنبول میں ہے۔ خانہ جنگی کی تباہی کے بعد حکومت نے میڈرڈ کی تعمیر پر خاصی توجہ دی کیونکہ وہ دارالخلافہ ہے۔ انقرہ کی طرح یہ بھی اندرونِ ملک کے خشک علاقے میں واقع ہے اور اس کی ظاہری شان و شوکت پر نو دولتے پن کا گمان ہوتا ہے۔ اس کے برعکس بارسیلونا سمندر کے کنارے آباد ہے اور اپنی قدامت پر کسی پرانے رئیس کی طرح نازاں۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اسپین کا سب سے خوبصورت شہر ٹولیڈو (TOLEDO) ہے جو میڈرڈ سے پچاس ساٹھ میل مغرب میں ایک پہاڑی پر آباد ہے۔ یہاں کے قدیم کلیسا کی ظاہری عظمت جتنی دلکش ہے اتنی ہی اس کی اندرونی آرائش، جو دراصل عرب فنِ تعمیر کا بہترین نمونہ ہے۔ قرطبہ کی مسجد کے ستون میں جو نازک تناسب ہے وہی انداز یہاں بھی دیکھنے میں آتا ہے۔

ٹولیڈو کے مقابل بلند کوہ کا نام المنظر ہے۔ کہا جاتا ہے کہ خلیفہ عبدالرحمٰن ثالث کا وزیر المنصور یہیں دفن ہے۔ اس شہر کی شہرت کی دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ سولھویں صدی کے عظیم آرٹسٹ الگرے کو (ELGRECO) کا وطن بھی ہے۔ اس کی رہائش گاہ کو عجائب گھر بنا دیا گیا ہے جہاں اس کے بیشتر شاہکار محفوظ ہیں۔ مغربی فنِ مصوّری کے چار بڑے دبستان ہیں یعنی اطالوی، ہالندزی، فرانسیسی اور ہسپانوی۔ دنیا نے بیسویں صدی میں جو سب سے بڑا مصوّر پیدا کیا وہ پابلو پکاسو اسپین نژاد ہی تھا۔

اسپین میں مسلمانوں کے ہفت صد سالہ وجود کو ختم کرنے میں رومن کلیسا کو سو سال سے زیادہ عرصہ نہ لگا۔ بالآخر ۱۶۰۵ء میں حکومت اسپین نے قانوناً کسی غیر عیسائی کی رہائش ملک میں ممنوع قرار دے دی۔ اس قانون میں گزشتہ جنگِ عظیم کے بعد ترمیم ہوئی۔ اسے دولت کا کرشمہ سمجھیے کہ وہی عرب اب ملک میں ہاتھوں ہاتھ لیے جاتے ہیں اور ہزاروں کی تعداد میں ملک کے مشرقی ساحل اور بالخصوص اُندلس میں پھر سے آباد ہو گئے ہیں۔

بارسیلونا میں میرے ہوٹل کے پیچھے جو سڑک گذرتی تھی اس کا نام "کازا عمر" (کوچۂ عمر) تھا۔ وہیں کے ایک قہوہ خانے کے مالک سے کچھ شناسائی ہوئی تو میں نے اس کی وجہ تسمیہ دریافت کی۔ اس نے بتایا کہ مسلمانوں کے عہد حکومت کے دورِ آخر میں یہ محلہ شیخ عمر نامی امیر کبیر کی ملکیت تھا۔ اس کے مالکوں نے مجبوراً بظاہر مذہب بدل لیا لیکن دیر تک ان پر اسلامی معاشرت کا اثر باقی رہا۔ شیخ عمر سے اس کا سلسلۂ نسب ملتا تھا۔ ایک عمر رسیدہ شخص ان باتوں کو غور سے سنتا رہا پھر بول اٹھا "اس میں کوئی شک نہیں کہ کلیسا نے اس زمانے میں بڑے ظلم ڈھائے لیکن آج جنرل فرانکو کی حکومت میں کیا تشدد کم ہے"۔ مجھ سے مخاطب ہو کر وہ بولا "میں کبھی یونیورسٹی کا پروفیسر تھا، لیکن آمریت کی مخالفت کی پاداش میں نہ صرف ملازمت سے سبکدوش ہوا بلکہ قید و بند کی سختیاں بھی جھیلیں اور اب اس قہوے خانے کے سوا میرے لیے کوئی اور جائے پناہ نہیں ہے"۔ پھر ایک تلخ قہقہہ لگا کر اس نے کہا "کیا ستم ظریفی ہے کہ چوکیدار گھر پر یہ کہہ کر قبضہ کر لے کہ اہل خانہ اس قابل نہیں کہ انتظام سنبھال سکیں"۔ میں کہیں اور لکھ چکا ہوں کہ اسپین کے اس آمر سے کس طرح ۱۹۵۷ء میں پاکستان کے صدر اسکندر مرزا نے حکمرانی کا گُر سیکھا تھا۔

اطالوی تاریخ و فن کے نقوش

(۱۳)

اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ مغرب کے ماضی و حال کی جان کاری کے لیے فقط ایک ملک کا انتخاب کرنا ہے تو میں اسے اطالیہ جانے کی رائے دوں گا۔ یہ ملک سلطنت روما کا مرکز اور عیسائی مذہب کا گہوارہ ہے۔ یہیں سے نشاطِ ثانیہ کی وہ تحریک شروع ہوئی جس نے تاریخ کا رُخ عہدِ جدید کی طرف موڑ دیا۔ یہی نہیں بلکہ اطالیہ کو مصوّری، مجسّمہ سازی اور موسیقی میں مغرب کے استادِ اوّل کی حیثیت حاصل ہے۔ قدرتی مناظر کی کشش مجھے یورپ میں دور دور تک لے گئی، لیکن کہیں وہ تنوع دیکھنے میں نہ آیا جو اطالیہ میں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ سوئٹزرلینڈ کے پہاڑ زیادہ بلند ہیں اور وہاں کی وادیوں اور جھیلوں میں زیادہ دلکشی ہے، لیکن نہ تو وہاں سمندر کا ساحل ہے نہ تاریخ و تہذیب کی عظمت کے وہ نشان جو اطالیہ میں ملتے ہیں۔

مجھے اطالیہ جانے کا پہلا موقع ۱۹۳۸ء میں ملا جب میں پیرس میں طالب علم تھا۔ ایک دن جینوا ٹھہرنا پڑا جو صرف اپنی بندرگاہ اور قبرستان کی خوبصورتی کے لیے مشہور ہے۔ گویا ایک وسیع خوش نما باغ ہے جس میں بڑے سلیقے سے قبروں کی حلقہ بندی کی گئی ہے۔ ہمارے ملک کے گورستانوں میں بدنظمی اور بے ترتیبی کا یہ عالم ہے کہ مرنے کو بھی جی نہیں چاہتا۔ مسلم ممالک میں ہیں

نے فقط ترکی میں مُردوں کا یہ احترام دیکھا کہ شہرِ خموشاں میں مناسب طریقے سے روش بندی کی گئی ہے۔ مرد کی قبر پر علامتی طور پر ٹوپی کا اور عورت کی قبر پر پھول کا نشان بنا ہوا ہے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب اطالیہ میں فاشسزم کا زور تھا اور مسولینی کی حکومت تھی تاہم غیر ملکی سیّاحوں کو بظاہر کسی تشدّد کا احساس نہ ہوتا تھا۔ اطالیہ کے دو سب سے خوبصورت شہر فلورنس اور وینس ہیں۔ وینس تو سڑکوں کا نہیں بلکہ نہروں کا شہر ہے جہاں آمد و رفت کشتیوں پر ہوتی ہے۔ یوں تو اطالیہ کے ہر چھوٹے بڑے شہر میں آرٹ کے نادر نمونے ملیں گے لیکن اس کا عدیم المثال ذخیرہ روم اور فلورنس کے عجائب گھروں میں محفوظ ہے۔ پاپائے اعظم کے مسکن وٹیکان (VATICAN) کے عجائب گھر اور کتب خانے کا تو جواب ہی نہیں ہے۔

روم میں تن تنہا سڑک ناپتے ہوئے میں تھک چکا تھا کہ یک بیک اقبال شیدائی پر نظر پڑی۔ قارئین شاید ان کے نام سے آشنا ہوں۔ یہ ان لوگوں میں سے تھے جو پہلی جنگ عظیم کے بعد ہندوستان سے ہجرت کر کے کابل کے راستے سوویت روس پہنچے اور وہاں کچھ وقت گزار کر یورپ چل پڑے اور وہیں کے ہو رہے۔ ۱۹۳۷ء میں پیرس پہنچتے ہی اتفاق سے ان سے ملاقات ہو چکی تھی۔ ان کی دلچسپ شخصیت نے مجھے متاثر بھی کیا تھا۔ انھیں دنوں خالدہ ادیب خانم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ میں پہلے ان کی شفقت کا ذکر کر چکا ہوں۔ باتوں باتوں میں جب میں نے اقبال شیدائی کا نام لیا تو وہ غصّے سے اس طرح آگ بگولا ہوئیں کہ میں ہکّا بکّا رہ گیا۔ انھوں نے سختی سے کہا کہ تم آئندہ ہرگز اس شخص سے نہ ملنا۔ کیا تمھیں معلوم نہیں کہ یہ اس مصطفےٰ صغیر کا دوست تھا جسے برطانوی حکومت نے اتاترک کو قتل کرنے کے لیے انقرہ بھیجا تھا۔ بروقت اس سازش کا پتہ چل گیا تو مصطفےٰ صغیر کو پھانسی ہوئی اور اقبال شیدائی جیسے لوگوں کو ملک سے نکال دیا گیا۔ اس واقعے کا مجھے پہلے علم نہ تھا۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ برطانوی حکومت نے مراد آباد کے مصطفےٰ صغیر کو خلافت کمیٹی کا رکن بتا کر انقرہ روانہ کیا جہاں اپنی ساکھ بٹھانے کے لیے اس نے کارِ خیر میں لاکھوں روپے کے چندے دیے۔ وہ موقع کا منتظر تھا کہ اتاترک پر حملہ کرے کہ عین وقت پر پکڑا گیا اور کیفرِ کردار کو پہنچا دیا۔

گیا۔ مجھے معلوم نہیں کہ اقبال شیدائی کا اس سازش سے براہِ راست تعلق تھا یا نہیں، البتہ پیرس میں اسی وقت شاہ انگلستان کی آمد آمد ہوئی اور پولیس نے جن مشتبہ غیر ملکیوں کو نکال دیا ان میں اقبال شیدائی بھی تھے۔ یہ سب باتیں میرے ذہن نشین تھیں کہ جب روم میں ان سے اچانک ملاقات ہو گئی ہم تھوڑی دیر کے لیے قہوہ خانے میں جا بیٹھے۔ اقبال شیدائی کی زندگی کا بڑا حصہ اطالیہ میں گزرا۔ انھوں نے وہیں کی کسی عورت سے شادی کی اور کئی سال قبل انتقال ہو گیا۔

دوسری جنگِ عظیم میں اطالوی ریڈیو پر انھوں نے آزاد ہند حکومت کی بڑے جوش و خروش سے ترجمانی شروع کی۔ قیامِ پاکستان کے بعد چند سال کراچی میں بھی رہے، جہاں آرٹسٹ ناگی کے نگار خانے میں ان سے کبھی کبھی علیک سلیک ہو جاتی تھی۔

اطالیہ کا سب سے بڑا صنعتی مرکز "میلان" نامی شہر ہے۔ یہاں کا کلیسا جتنا پُرشکوہ ہے اوپیرا ہاؤس بھی اتنا ہی پُروقار ہے۔ اوپیرا کا فن اطالیہ میں ہی ایجاد ہوا تھا۔ اپنی زبان میں ہم اسے سنگیت ناٹک کہہ سکتے ہیں۔ مغرب میں کلاسیکی گلوکاری کا صحیح مظاہرہ اوپیرا میں ہی ہوتا ہے اور آواز کا جیسا کمال یہاں سننے میں آتا ہے اس کی مثال ہماری موسیقی میں نہیں ملتی۔ پیرس یونیورسٹی کا ایک ہم جماعت البرٹو میلان کا رہنے والا تھا اور میں تین چار دن اسی کا مہمان رہا۔ اسے معلوم تھا کہ مجھے وائلن سیکھنے کا نیا نیا شوق ہوا ہے۔ چنانچہ البرٹو نے اپنے ایک رشتہ دار کی دکان سے کم قیمت پر مجھے ایک پُرانا وائلن دلا دیا۔ دکان دار نے تاکید کی کہ اسے احتیاط سے رکھنا کیونکہ اسٹراویڈس (STRAVIDIUS) مارکے کا وائلن تھا جس کے دام آج ہزاروں ڈالر ہوتے ہیں۔ ہندوستان واپسی کے بعد ایک عزیز اسے عاریتاً لے گئے پھر وہ اس طرح سے کھویا کہ نہ ان کے پاس رہا نہ میرے پاس۔

یوں تو اطالیہ میں دیکھنے کی بہت سی چیزیں ہیں مگر جو نقوش میرے ذہن میں بطور خاص رہ گئے ان کے ذکر پر اکتفا کرتا ہوں۔ ٹیوولی (TIVOLI) کا وہ عدیم النظیر باغ جہاں بیک وقت سیکڑوں فوارے اس طرح آب ریز ہوتے ہیں گویا موسلا دھار بارش ہو رہی ہے۔ وینس کا وہ مشہور چوک جس کے ایک طرف قدیم محل قطار در قطار کھڑے ہیں

دنیا کے بڑے چوکوں میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ جزیرہ کاپری کی پہاڑی کی چوٹی پر کھڑی ہوئی "سان مشعل" نامی وہ عمارت جو مجھے یاد ہے اُسے STORY OF SAN MICHEL نامی کتاب نے شہرت دوام بخش دی۔ دراصل یہ سوئیڈن کے ایک ڈاکٹر کی سرگزشت ہے جب پہلی جنگِ عظیم کے بعد نیپلز میں آباد ہو گیا تھا اور عہدِ قدیم کے بکھرے ہوئے ستونوں اور محرابوں کو جمع کر کے اس عمارت کو تشکیل دیا تھا۔ یہاں کھڑے ہو کر سمندر کا جیسا ہوش رُبا نظارہ ہوتا ہے وہ میں نے صرف ایک اور جگہ یعنی "موگا دیشو" میں صدر صومالیہ کے محل سے دیکھا تھا۔ دراصل فطرت یا فن کے حُسن کا صحیح اندازہ تب ہی ہوتا ہے جب اسے صحیح زاویے سے دیکھا جائے۔ تاج محل کا حُسن دھوپ میں نہیں چاندنی میں نکھرتا ہے مگر برف پوش پہاڑ کا حُسن دھوپ میں اُجاگر ہوتا ہے۔ فن کے کسی شاہکار کو دیکھنے کے لیے فاصلہ اور روشنی کا صحیح اندازہ ضروری ہے۔ سمندر کی عظمت کا اندازہ لگانے کے لیے اس کی سطح کی وسعت کو نہیں دیکھنا چاہیے بلکہ کسی بلند مقام پر کھڑے ہو کر ہر طرف سے حدِ افق تک نظارہ کرنا چاہیے۔

اطالیہ نے عہدِ قدیم میں اس لاطینی زبان کو جنم دیا جس کے دامنِ شفقت میں بہت سی مغربی زبانوں کی پرورش ہوئی۔ اب تو سنسکرت کی طرح لاطینی کا شمار بھی مردہ زبانوں میں ہوتا ہے مگر اس کا اثر یورپ کے مذہب و تہذیب اور آئین و ادب پر بہت واضح ہے۔ لاطینی کی بگڑی ہوئی شکل نے عہدِ وسطیٰ میں موجودہ اطالوی کا روپ دھارنا شروع کیا۔ اطالوی نثر کی سب سے پہلی قابلِ ذکر تصنیف افسانوں کا مجموعہ ڈیکامیران (DECAMERON) ہے جو عربی داستان گوئی سے متاثر ہے۔ اسی زمانے میں دانتے کی وہ شہرۂ آفاق نظم ڈوائن کامیڈی تخلیق ہوئی جس کا بنیادی تصوّر کئی محققوں کی رائے میں ابن عربی کے معراج نامے سے ماخوذ ہے۔ پیرس کے آخری قیام میں ہر دوسرے تیسرے دن مجھے یہ نظم خواہ مخواہ یاد آجاتی تھی۔ شام کو چہل قدمی کے لیے نکلتا تو لامحالہ اس عجائب گھر کے سامنے سے گزرنا ہوتا جو دورِ حاضر کے سب سے بڑے مجسّمہ ساز رودان (RODIN) کے نام سے موسوم ہے اور اس کے صدر دروازے پر دانتے کی نظم کے اس حصّے کے نقوش بنے

ہوئے ہیں جس کا عنوان "جہنم کا دروازہ" ہے۔ جہنم کے ساتوں تختوں کی نقش گری میں اس باکمال نے وہ روح فرسا اُستادی دکھائی ہے کہ تماشائی کو حیاتِ فانی اور آخرت دونوں سے نفرت ہو جاتی ہے۔

اطالیہ کی سیر تین مختلف موقعوں پر ہوئی لیکن اطالویوں سے واسطہ صومالیہ میں پڑا۔ بیسویں صدی کے نصف اوّل تک اس ملک کے جنوبی حصّے پر انھیں کا قبضہ رہا۔ پہلے تو روم سے مجرموں کو یہاں لاکر اس طرح آباد کیا جاتا تھا جس طرح برطانیہ سے بدقماشوں کو آسٹریلیا جلاوطن کیا جاتا تھا۔ بعد ازاں مسولینی کے دور میں سیاسی منحرفوں کو یہاں دیس نکالا دیا گیا۔ صومالیہ میں میرے دورانِ قیام میں یہ جلاوطن ہزاروں کی تعداد میں موجود تھے۔ انھوں نے اور کچھ نہ کیا ہو لیکن گلّہ بانوں کے ملک میں جدید طریقۂ زراعت کو ضرور فروغ دیا۔ ان میں وہ رعونت بھی نہ تھی جس کے لیے انگریز بدنام ہیں۔ اسی وجہ سے حصولِ آزادی کے بعد بھی صومالیوں سے ان کے تعلقات خوشگوار رہے۔ ان میں سے ایک سے میری خاصی دوستی ہو گئی۔ اس کا نام "رومانو" تھا۔ پہلے وہ اطالیہ میں اسکول ماسٹر تھا اور زمانۂ جنگ میں جبراً یہاں بھیج دیا گیا۔ رفتہ رفتہ افریقہ نے اس پر ایسا جادو کیا کہ بہت سے سفید فام نوواردوں کی طرح وہ بھی یہیں آباد ہو گیا۔ شہر کے باہر صومالی بچّوں کے لیے اس نے زراعتی درس گاہ قائم کی اور وہیں رہنے لگا۔ اس کے کھیتوں اور باغوں میں رنگ برنگے پرندوں کا بسیرا ہوتا اور بے ضرر جانور بے خطر گھومتے پھرتے۔ رومانو اطالیہ واپس گیا لیکن دل نہ لگا اور پھر یہیں لوٹ آیا۔ وہ مجھ سے کہتا تھا کہ مغرب کے اور ملکوں کی طرح اطالیہ بھی گویا ایک بڑا سا کارخانہ ہے جس میں مشین انسان کی انفرادیت پر غالب آگئی ہے۔ وہ جن تہذیبی قدروں کو عزیز رکھتا تھا وہ خوابِ رفتہ کی طرح ہماری زندگی میں موہوم ہو چلی ہیں لیکن ان کی صدائے بازگشت آنے والی نسلیں ہمیشہ سُنتی رہیں گی۔

امریکہ کے چند تاثرات

(۱۴)

یہ عجیب بات ہے کہ شمالی امریکہ کے انڈین قبیلوں کی میراث میں اس تہذیب کا شائبہ بھی نہ آیا جس کا تماشا کولمبس اور بعدازیں ہسپانوی حملہ آوروں نے جنوبی امریکہ میں دیکھا تھا اور جس کے آثار آج بھی سیّاحوں کو حیران کرتے ہیں۔ ایک طرف ہم "مایا" اور "اَزتک"، جیسی ہزاروں سال پرانی تہذیبوں کے آثار پر تعجب سے انگشت بدنداں رہ جاتے ہیں اور دوسری طرف شمالی امریکہ کے انڈین کی سادگی پر حیرت زدہ ہوتے ہیں جسے لکھنا کیا انگلیوں پر گننا بھی نہ آیا اور جو ابتدائی انسان کی سطح سے آگے نہ اُٹھ سکا۔ چنانچہ چند سو سال قبل جب انگریزوں کی سرکردگی میں اہلِ یورپ نے اس سرزمین پر یلغار کی تو بلا دقّت انھوں نے انسان وحیوان سب کا صفایا کر دیا۔ اب جو ملک ظہور پذیر ہوا وہ دراصل بالکل نیا تھا جس کے ماضی کی کوئی یادگار موجود نہ تھی۔ افریقہ کی طرح امریکہ کی تسخیر کی داستان بھی عبرتناک ہے کہ کس طرح چالاک سفید فام تاجر چمکدار شیشوں کے ہار کے بدلے زمینوں کے بڑے بڑے قطعات سادہ لوح قبائلیوں سے خرید لیتے تھے اور جب غیرت مند انڈینوں کو وہ زراعت کے لیے غلامی پر مجبور نہ کر سکے تو انھیں فنا کر کے

مغربی افریقہ سے بے شمار حبشیوں کو پا بہ زنجیر نئی دنیا بسانے لے آئے۔

اس خونچکاں داستان کو نظر انداز کریں تو اہلِ امریکہ کی صنعت گری اور مہم جوئی کی داد دینا چاہیئے کہ انھوں نے دو سو سال کی قلیل مدّت میں اسے دنیا کا سب سے ترقی یافتہ ملک بنا دیا۔ یہ ملک کیا دراصل ہزاروں میل لمبا چوڑا برِّ صغیر ہے جس میں ہر جگہ ترقی و تنظیم کا ایک ہی ڈھانچہ نظر آئے گا۔ امریکہ میں سفر کرتے وقت مجھے ہمیشہ تین چیزوں کا گہرا احساس ہوا۔ یکسانیت، نیا پن اور دولت کی فراوانی۔ مختلف قوموں اور نسلوں کے لوگ یہاں آباد ہیں لیکن نہ تو رہن سہن میں فرق ہے نہ لباس و غذا میں۔ ملک میں سب سے بڑی قوت ابلاغ عامّہ کی ہے اور وہ بھی اس حد تک کہ فرد میں سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت سلب ہو گئی ہے۔ اس کے ذوق و فکر پر ریڈیو، ٹیلی ویژن یا اخبار کی مہر چسپاں ہے۔ یوں تو یہ تماشا تمام صنعتی ممالک میں ملے گا لیکن امریکہ میں انتہا کو پہنچ چکا ہے۔

۱۷۷۶ء میں جنگِ آزادی جیت کر امریکہ نے جب انگلستان کے تسلّط سے رہائی حاصل کی تو یہ دنیا میں جمہوریت کی پیش قدمی تھی۔ اس کا جو اثر چند سال بعد انقلابِ فرانس پر پڑا وہ عہدِ حاضر کی تاریخ کی اہم حقیقت ہے۔ امریکی آئین کو ایک اعتبار سے مثالی آئین کہا جا سکتا ہے۔ جب میں نے وہاں عام انتخاب کے موقع پر کانگرس کے نمائندوں کے علاوہ سرکاری عہدہ داروں کے انتخاب کا انتظام دیکھا تو سخت متحیّر ہوا۔ مجھے بتایا گیا کہ مقنّنہ کے علاوہ انتظامیہ کو بھی عوام کا جواب دہ ہونا چاہیئے۔

حصولِ آزادی کے بعد امریکہ نے انیسویں صدی میں صنعتی ترقی کی وہ ساری منزلیں طے کر لیں جن سے یورپ گزر چکا تھا اور پھر بیسویں صدی کی دو عظیم جنگوں کے بعد وہ مادّی اعتبار سے دنیا کی سب سے عظیم طاقت کی شکل میں اُبھر آیا۔ گزشتہ جنگ ختم ہوئی تو مغربی یورپ اور جاپان کی تعمیرِ نو کی نگرانی کے علاوہ امریکہ نے کمیونزم کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنے کی ذمّہ داری سنبھالی، لیکن اس کی حکمتِ عملی نے لاطینی امریکہ، افریقہ اور ایشیا کو براہِ راست متاثر کیا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ وہ سرمایہ داری کے خطوط پر کاربند رہیں اور

ترقی کے لیے امریکہ کے مرہونِ منّت بنیں۔ اس طرح امریکہ اور روس کی رقابت، امریکہ و مغربی یورپ کی رفاقت اور تیسری دنیا کا وہ خلفشار منظرِ عام پر آیا جس میں ہم مبتلا ہیں۔

امریکی سماج کا سب سے بڑا مسئلہ وہ خلیج ہے جو رنگ کے تعصّب نے کالوں اور گوروں کے درمیان پیدا کر دی ہے۔ افریقہ سے جو حبشی لاکھوں کی تعداد میں یہاں درآمد کیے گئے تھے ان کی حیثیت غلاموں کی تھی جن کی آزادی کے سوال نے ۱۸۶۵ء میں خانہ جنگی کی شکل اختیار کر لی۔ پھر حبشی کہنے کو تو غلام نہ رہے لیکن ان کی حیثیت آج بھی دوسرے درجے کے شہریوں کی ہے۔ ۱۹۵۰ء میں پہلی بار امریکہ کا طویل دورہ کرتے کرتے مجھے جنوبی ریاست الباما جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں حبشیوں کی دانش گاہ کے پرنسپل نے ایک صبح مدعو کیا اور مجھے لانے کے لیے کسی پروفیسر کو ہوٹل بھیجا۔ یہ گفتگو ٹیلی فون پر ہوئی تھی۔ وقت مقررہ پر میں ہوٹل کے دیوان خانے میں اس کا انتظار کرنے لگا۔ امریکن وقت کے پابند ہوتے ہیں لہٰذا جب پندرہ بیس منٹ تک وہ نہ آیا تو مجھے تعجب ہوا اور یاددہانی کے لیے ٹیلی فون کی طرف بڑھا۔ اتنے میں ہوٹل کا قد آور دربان میری تلاش میں آیا اور کہنے لگا کہ ایک سیاہ فام باہر آپ کا انتظار کر رہا ہے۔ میں نے پوچھا کہ وہ اندر کیوں نہیں آتا، تو دربان نے حقارت سے جواب دیا کہ کوئی حبشی ہوٹل میں داخل نہیں ہو سکتا۔ باہر نکل کر میں نے اس پروفیسر سے معذرت کی۔ وہ کہنے لگا کہ آپ اجنبی ہیں آپ کو یہاں کے حالات کا علم کیسے ہو سکتا ہے۔ میں پندرہ منٹ سے باہر کھڑا ہوں۔ دربان سے التجا کر رہا تھا کہ آپ کو اطلاع کر دے لیکن وہ یہ ماننے کے لیے تیار ہی نہ تھا کہ ہوٹل کا کوئی مہمان کسی سیاہ فام سے ملاقات کرے گا۔ اس زمانے میں گوروں اور کالوں کے ہوٹل، ریستوران، اسکول اور اسپتال وغیرہ الگ الگ ہوتے تھے حتیٰ کہ بس اور ریل میں بھی ان کی نشستیں علیحدہ ہوتی تھیں، مگر رفتہ رفتہ اس قسم کی ظاہری کاوٹیں کم ہو گئی ہیں اور ہندوستان کے اچھوتوں سے ان کی حالت بہر حال بہتر ہے۔

امریکہ نے جس تیز رفتاری سے عروج حاصل کیا اُسی سرعت سے ملک کے اندر یہودیوں نے غلبہ پا لیا۔ اسی کا کرشمہ ہے کہ اسرائیل کی توسیع اور استحکام امریکہ کی خارجہ پالیسی کا

سنگِ بنیاد بن گیا ہے۔ خواہ اس کی قیمت اسے عرب ممالک کی عداوت کی صورت میں کیوں نہ ادا کرنا پڑے۔ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ امریکہ کی زندگی کو جو ادارے سب سے زیادہ متاثر کرتے ہیں وہ ہیں "یہودیوں کی عالمی انجمن" اور جرائم پیشہ اطالوی خفیہ تنظیم "مافیا"۔ یہ مافیا دراصل عربی لفظ ہے جو جزیرۂ سسلی کے عرب چھاپہ ماروں کے لیے مخصوص تھا۔ عہدِ وسطیٰ میں عیسائیوں نے عربوں سے دوبارہ سسلی کو چھین لیا تو وہ مدّتوں، جنگلوں اور پہاڑوں میں چھپ کر ان سے لڑتے رہے اور اطالوی انھیں مافیا کہنے لگے۔

پہلے تو اہلِ یورپ امریکی باشندوں کو غیر مہذّب گردانتے تھے لیکن سائنس و صنعت کے علاوہ وہی لوگ ادب اور آرٹ کے بھی پیش رو بن گئے ہیں۔ جدید انگریزی ادب کو ان کا عطیہ بیش بہا ہے اور یورپ کا کوئی ثقافتی مرکز نیویارک سے مقابلہ نہیں کر سکتا۔

بایں ہمہ ایک عام امریکی کے کردار میں سادہ لوحی کا پہلو ہوتا ہے اور اپنے ملک اور معاشرے کے علاوہ اسے دنیا و مافیہا سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ اس کی مثال تو یہ ہے کہ جنگِ عظیم کے بعد وہاں صرف دو تحریکوں نے زور پکڑا۔ ایک تو روائتی رسم و رواج کے خلاف بے راہ رو کا وہ شور جسے "ہپّی" کہلانے والے نوجوانوں نے برپا کیا تھا اور پھر وہ آواز جو ویت نام میں امریکہ کی مداخلت کے خلاف بلند ہوئی تھی، ورنہ ملک میں دولت کی فراوانی نے آبادی کے بیشتر حصّے کو متوسط طبقے کی سطح پر لا کھڑا کیا ہے جسے اپنی غرض کے سوا کسی اور چیز سے دلچسپی نہیں۔ نتیجہ یہ کہ ایسی کسی تحریک کا پنپنا مشکل ہے جو معاشی بدحالی کی فضا میں پروان چڑھتی ہے۔

ایک بار لاس اینجلس جانے کا اتفاق ہوا جو فلمی صنعت کا مرکز ہے۔ وہاں حسن خیام نامی بزرگ سے ملاقات ہوئی جو مدّتوں پہلے پشاور سے ہجرت کر کے یہاں بس گئے تھے اور ایک پنشن یافتہ ایکٹریس سے شادی کر لی تھی۔ انھوں نے ویک اینڈ گزارنے کی دعوت دی۔ مجھے صبح سویرے سیر کی سوجھی۔ سنسان سڑک پر تھوڑی دور چلا تھا کہ گشتی پولیس کی سیٹی بجی

اور ایک موٹر نے میرا راستہ روک لیا۔ بڑی مشکل سے میں نے پولیس مین کو یقین دلایا کہ میں فلاں مکان میں مقیم ہوں اور سیر کی نیت سے ٹہلتے نکلا ہوں۔ اس نے سمجھایا کہ اس ملک میں اٹھائی گیروں کے علاوہ اور کوئی چھٹّی کے دن اتنی جلدی باہر نہیں آتا اور اسی شبہے کی وجہ سے پڑوسیوں نے پولیس کو میری موجودگی کی اطلاع دی تھی۔ دراصل مغرب میں تفریح کی غرض سے صبح سویرے کوئی سیر کے لیے نہیں نکلتا۔

اسی شام کو حسن خیام اپنی بیوی کے ساتھ مجھے ایک دعوتِ شب میں لے گئے جو ایک عراقی خاتون کے گھر منعقد تھی۔ یہ پرنسز امینہ کے نام سے مشہور تھی۔ اس سے میرا تعارف یہ کہہ کر کرایا گیا کہ یہ فلاں صاحب ہیں جو فلاں ایشیائی ملک کی وزارت سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ نیک بخت رات کے نشے میں ایسی مخمور تھی کہ سب سے مجھے یہ کہہ کر ملانے لگی کہ یہ وزیر ہیں اور آج کی پارٹی انھیں کے اعزاز میں دی گئی ہے۔ جب میں نے حسن خیام سے اس غلط فہمی کے ازالے کے لیے کہا تو اس نے جواب دیا۔ میاں نہ وہ شاہزادی ہے اور نہ تم وزیر ہو مگر یہ ہالی وڈ ہے اور اسی قسم کا فرضی تعارف آدمی کو کہیں سے کہیں پہنچا دیتا ہے۔

سالہا سال بعد کراچی میں سُنا کہ پرنسز امینہ نامی کوئی مشہور رقاصہ کسی ہوٹل میں دعوتِ نظارہ دے رہی ہے۔ میرے ذہن میں لاس اینجلس کی اس رات کی یاد تازہ ہوئی اور اس تماشا گاہ کی طرف اس تجسّس میں چلا کہ وہی فتنہ گر ہے یا کوئی اور، لیکن وقت اتنا گزر چکا تھا اور پھر اتنی بھیڑ تھی کہ اس کی شناخت نہ ہو سکی۔

امریکہ کا سب سے خوبصورت شہر سان فرانسسکو ہے۔ جو ملک کے مغربی سرے پر بحرالکاہل کے کنارے بسا ہوا ہے۔ دنیا کا طویل ترین سنہرا پل شہر کو برکلے یونیورسٹی سے ملاتا ہے۔ غالباً یہ امریکہ کی سب سے ترقی پسند دانش گاہ ہے۔ کسی زمانے میں سان فرانسسکو غدر پارٹی کا مرکز تھا اور مشہور انقلابی رہنما مولوی برکت اللہ بھوپالی نے اسی جگہ دنیا کو خیرباد کہا تھا۔ ڈاکٹر سید حسین مدّتوں برکلے یونیورسٹی میں درس دیتے رہے، اور ان کے بعض رفیقوں سے میری ملاقات بھی ہوئی۔ امریکہ کا سب سے بڑا صوبہ کیلیفورنیا ہے

لیکن اس کا صدر مقام سان فرانسسکو یا لاس اینجلس نہیں بلکہ سیکری منٹو (SACREMENTO) نامی ایک چھوٹا سا شہر ہے جس کے اطراف وہ پنجابی کسان آباد ہیں جو پہلی جنگ عظیم کے بعد وہاں جا کر بس گئے تھے۔

مغرب سے تین ہزار میل مشرقی کنارے پر ملک کا سب سے بڑا شہر نیویارک آباد ہے۔ یہ گویا انسانوں کا جنگل ہے اور اسے آسمان بوس عمارتوں اور موٹروں کے جنجال نے اس طرح گھیر رکھا ہے کہ فرد کو اپنی ذات بالکل بے حقیقت معلوم ہونے لگتی ہے۔ تاہم یہیں کے ساہوکار صرف امریکہ نہیں بلکہ دنیا کی منڈیوں کو کنٹرول کرتے ہیں۔ یہ محض اتفاق نہیں کہ یہودیوں کی بہت بڑی تعداد اسی شہر میں آباد ہے۔ یہاں اپنے قیام کے دوران میں نے کئی خوش حال امریکیوں سے پوچھا کہ کیا وہ اپنی زندگی سے خوش ہیں تو جواب ملا کہ خوشی ایسی کیفیت ہے جس کے مفہوم سے ہم ناآشنا ہیں، البتہ ہم آرام سے رہتے ہیں کیونکہ آرام کا سامان بازار سے خریدا جا سکتا ہے۔

فلم سازی کی ایجاد امریکہ میں ہوئی اور ابھی اس میدان میں کوئی اس کا ہم پلّہ نہیں ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ گھر بیٹھے تفریح کی سہولت جو یہاں میسّر ہے وہ کہیں اور نہیں۔ درجنوں ٹیلی ویژن اسٹیشن اور سیکڑوں ریڈیو چینل ہیں جن سے آپ چوبیس گھنٹے اپنی دلچسپی کے پروگرام دیکھ اور سُن سکتے ہیں۔ ان میں سے بیشتر ذوقِ سلیم پر گراں گزریں گے، لیکن اس زمانے میں ذوق کی شرط مشکل سے ہی عائد کی جا سکتی ہے۔ یہی حال کتابوں رسالوں اور اخباروں کا ہے جو کروڑوں کی تعداد میں شائع ہوتے اور بکتے ہیں۔ غرض یہ صنعتی سماج معیار نہیں بلکہ کثرت کے جس اصول پر قایم ہے اس کا نقطۂ عروج یہاں دیکھنے میں آتا ہے۔ اقبال نے سچ کہا تھا ؏

احساسِ مروّت کو کچل دیتے ہیں آلات

انسان بزعم خود مشین کے سہارے فطرت پر غلبہ حاصل کرنے کے لیے نکلا اور اب مشین سے مغلوب ہو کر رہ گیا۔ پہلے تو اُس نے مشینوں سے وہ کام لینا شروع کیا جو ہاتھ پاؤں انجام دیتے ہیں اور اب کمپیوٹر کے روز افزوں استعمال نے اسے بے دماغ بنانا شروع

کر دیا۔ امریکہ ہی نہیں اس کے جلو میں ساری دنیا۔ اسی روش پر گامزن ہے لہٰذا اقدار، اصول یا اخلاق کا ذکر صدا بصحرا معلوم ہوتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مشین تعمیر و تخلیق کی بے پناہ قوت ہے تاہم اس کا خالق انسان ہی ہے اور اسے جب احساس ہوگا کہ اس کا اصل مصرف انسانیت کی حاکمیت نہیں بلکہ اس کی خدمت ہے تو موجودہ معاشرے کا ایک بڑا بحران ختم ہو جائے گا۔

جاپان کی دل آویزی

(۱۵)

برطانیہ اور جاپان میں کئی چیزیں مشترک ہیں۔ جغرافیائی اعتبار سے دونوں ہی چھوٹے چھوٹے جزیرے ہیں اور ان میں قدرتی وسائل کا فقدان ہے تاہم جس طرح مغرب میں صنعتی انقلاب میں پیش قدمی کے ساتھ برطانیہ نے عالمگیر سلطنت کا پرچم لہرایا، اسی طرح جاپان نے صنعت اور سائنس کے میدان میں ایشیا کو پہلے پہل راہ دکھائی۔ تعجب کی بات تو یہ ہے کہ برطانیہ میں جدید صنعت کی ابتدا ۱۷۶۰ء میں ہوئی اور جاپان نے سو سال بعد ۱۸۶۰ء میں یہ عمل شروع کیا۔ اپنی افرادی قوت کو اس نے اس طرح منظّم کیا کہ فقط پینتیس ۳۵ سال بعد یعنی ۱۹۰۵ء میں روس کو شکست دے کر مشرق بعید کے ایک بڑے حصّے پر قابض ہو گیا۔ پھر گزشتہ جنگ عظیم کے ابتدائی مرحلوں میں اس نے یک بیک امریکہ، برطانیہ اور دوسری مغربی قوتوں کو بحرالکاہل میں جیسی شکست فاش دی وہ دورِ جدید کی تاریخ کا اہم واقعہ ہے۔ دراصل اس صدی کے اوائل میں ایشیا کی سیاسی بیداری بڑی حد تک جاپان کی مرہونِ منّت ہے۔

۱۹۵۳ء کے موسمِ خزاں میں فورڈ فاؤنڈیشن کے تعاون سے حکومت پاکستان

نے مجھے جاپان کی تعمیرِ نو کے مطالعے کی غرض سے ایک مہینے کے لیے بھیجا۔ بات پرانی ہے لیکن اس کے نقوش میرے ذہن میں آج بھی باقی ہیں۔ امریکہ نے ایٹم بم کی یورش سے جاپان کو سرِ تسلیم خم کرنے پر مجبور کر دیا تھا اور غارت گری کے آثار ہر طرف نمایاں تھے۔ ٹوکیو کے علاوہ مجھے کئی شہروں اور دیہاتوں میں جانے کا موقع ملا اور سماج کے ہر طبقے کے افراد سے ملاقات کی۔ سب سے زیادہ متاثر میں ان کی غیرت قومی سے ہوا۔ کوئی فرد ایسا نہ ہوگا جو جنگ کی تباہ کاری اور شکست خوردگی سے بچا ہو، لیکن حرفِ شکایت کسی کی زبان پر نہ تھا۔ حتی الوسع وہ اس دُکھ بیتی سے گریز کرتے تھے، لیکن مجھ جیسا نو وارد اس ذکر کو چھیڑے تو وہ یہ کہہ کر ٹال دیتے کہ جنگ میں ایک فریق جیتتا ہے اور ایک ہارتا ہے۔ جنگ ہم نے ہی شروع کی تھی اور ہار گئے تو پھر کوئی مضائقہ کی بات نہیں۔ ہم میں اتنی قوتِ ارادی ہے کہ پھر اٹھ کھڑے ہوں گے۔ تاریخ سے اپنے اس وعدے کا ایفا پینتیس ۳۵ سال کی مدّت میں انھوں نے جس طرح کر دکھایا وہ ایک طرح کا معجزہ ہے۔ آج جاپان ترقی کی شاہراہ پر مغرب کا ہمسر نہیں بلکہ پیشرو ہے۔ پاکستان جیسے ترقی پذیر ایشیائی ملک کو اپنی تعمیر کے لیے مغرب نہیں بلکہ جاپان جیسے ملک کی تقلید کرنا چاہیے جس نے قلیل مدّت میں صدیوں کا فاصلہ طے کر لیا۔ اس کی یہ کاوش اس لحاظ سے بھی قابلِ ستائش ہے کہ مغرب کی کورانہ تقلید سے دامن بچا کر اس نے اپنی تہذیبی روایات کو باقی رکھا۔ میرے ایک جاپانی دوست پروفیسر "اسابوکی" نے بالکل صحیح کہا تھا کہ جدید سائنس کی حیثیت تجرباتی علم سے زیادہ نہیں ہے اور یہ سمجھنا غلط ہے کہ روحِ مذہب اور ہماری تہذیبی روایات سے اس کا کوئی بنیادی تضاد ہے۔

جاپانی تہذیب کی جو ادا سب کو پسند آتی ہے وہ اس کی سادگی اور پُرکاری ہے۔ اگر کسی معاشرے میں تہذیب صرف حکمران طبقے تک محدود رہے اور اس سے عوام محروم رہیں تو وہ معاشرہ مہذب ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ جاپان میں صفائی اور شائستگی کا ایک ہی معیار شہر اور دیہات میں بلا امتیاز نظر آئے گا۔ کسی گھر کی صفائی کو جانچنے کے لیے اس کے باورچی خانے اور غسل خانے کا معائنہ کرنا چاہیے۔ اس اعتبار سے جاپانی گھر کی مثال

اور کہیں نظر نہ آئے گی۔ یوں ان گھروں میں ساز و سامان کم ہوتا ہے۔ عموماً لکڑی کے بڑے یا چھوٹے گھر ہیں۔ جن میں فرش پر ہی سونے اور بیٹھنے کا چلن ہے۔ کوئی جاپانی گھر میں جوتے پہن کر داخل نہیں ہوتا ہے۔ دروازے پر چپلوں کی قطار لگی ہوتی ہے اور ہر آنے والا جوتے اتار کر چپل پہن لیتا ہے۔ غسل خانے کے باہر چپلوں کی نئی قطار رہتی ہے۔ صبح سے شام تک تلاشِ معاش میں باہر سرگرداں رہنے کے بعد جب وہ گھر میں داخل ہوتا ہے تو سب سے پہلے کپڑے یہ کہہ کر اتار دیتا ہے کہ ان میں کثافت کی بو آتی ہے۔ پھر وہ ایک ریشمی لبادہ جسے "کیمونو" کہتے ہیں زیب تن کر کے چائے نوشی کی "رسم" ادا کرتا ہے جس کے تکلّفات کے لیے جاپان مشہور ہے۔ مجھے اس رسم کا ایک دلچسپ تجربہ ہوا۔

ٹوکیو ایک ایسا غدار شہر ہے جسے انسانوں کا جنگل کہنا مناسب ہوگا۔ اس میں انسانوں، دکانوں، موٹروں کے انبوہ کے سوا اور کوئی خاص کشش نہیں ہے۔ البتہ جاپان کے پرانے دارالخلافے "کیوٹو" میں دلکشی کے کئی پہلو باقی ہیں۔ وہ پہاڑیوں اور جھیلوں کے دامن میں بسا ہوا ہے۔ پرانی وضع کا شہر ہے۔ جب میں نے اسے دیکھا تو مردانگی کے دو نمونے "سمورائی" اور نسوانیت کی خوش ادائی "گیشا" کی جھلک نظر آجاتی تھی۔ ان ہی دونوں میں روایتی جاپانی معاشرے کی رونق تھی۔

سمورائی قدیم جاپان کے اس شمشیر زن کو کہتے تھے جس کی لغت میں شکست کا لفظ شامل نہ تھا۔ لڑائی میں پاؤں اکھڑنے لگتے تو اسیری سے بچنے کے لیے "ہاراکری" یعنی خودکشی کر لیتا تھا۔ اس رسم کو پرانے راجپوت سورما جوہر کہتے تھے۔ اس جذبے کی بے شمار مثالیں گزشتہ جنگِ عظیم میں جاپانی سپاہیوں نے دکھائیں۔ وقتاً فوقتاً اب بھی اخباروں میں چھپتا رہتا ہے کہ فلاں جنگل میں اُس دور کا جاپانی سپاہی مورچہ سنبھالے بیٹھا ہے کیونکہ اس کو یقین نہیں کہ جنگ ختم ہو چکی اور اگر اس کا علم بھی ہے تو حکومت جاپان کا براہِ راست حکم حاصل کیے بغیر ہتھیار نہیں ڈالنا چاہتا۔

گیشا اس خاتون کو کہا جاتا ہے جو میزبانی کے فرائض انجام دینے کی تربیت درسگاہوں میں حاصل کرتی تھی۔ اگر گھر والی نہ ہو اور دعوت کا انتظام کرنا ہو تو شہر کے گیشا آفس

فون کر کے کسی مناسب میزبان کو بلا لیجیے۔ وہ سارا انتظام بڑے سلیقے سے کر دیتی ہے بلکہ مہمانوں کو رقص و سرود سے بھی مسرور کرتی ہے، البتہ وہ پہلے شریف زادی ہوتی تھی اور اس سے کوئی یہ توقع نہ کرتا تھا کہ دعوت ختم ہونے کے بعد وہ اپنے گھر نہ چلی جائے گی۔

کیوٹو میں ایک شناسا مسٹر ایشی کاوا نے دعوتِ شام پر بلایا جب میں جوتے اتار کر اندر داخل ہوا تو ملازمہ "کیمونو" پہنانے لے آئی۔ میں نے اسے سوٹ پر ڈال لیا تو اُس نے ہنس کر اشارے سے کہا کہ "کیمونو" برہنہ جسم پر اوڑھا جاتا ہے۔ اس شرط کی ادائیگی کے لیے ضروری تھا کہ وہ وہاں سے دفعان ہو لیکن وہ مجھے بے لباس کر کے "کیمونو" پہنانے پر مصر تھی۔ جب میزبان کو اس بحث کی وجہ معلوم ہوئی تو اُس نے جاپانی فلسفۂ برہنگی پر تقریر کر ڈالی۔ اس کا ماحصل یہ تھا کہ شب و روز کی جامہ زیبی تندرستی کے لیے مناسب نہیں ہے اور اپنے جسم سے شرمانا بیمار ذہنیت کی علامت ہے۔ اسی قسم کا واقعہ ایک بار ہالینڈ میں بھی پیش آیا جہاں میں پیرس سے کسی کانفرنس میں شرکت کرنے گیا تھا۔ وہ زمانہ تھا جب مغربی عورتوں نے وہ کوتاہ لہنگا پہننا شروع کر دیا تھا جو منی اسکرٹ کہلاتا تھا۔ غالب نے جس چار گرہ کپڑے پر عاشق کا گریباں ہونے کی حسرت کا اظہار کیا تھا وہ گویا معشوق کا گریبان بن گیا۔ کانفرنس کے شریکوں میں چیکوسلاواکیہ کے ایک ڈاکٹر ربکا بھی تھے۔ اشتراکی ممالک کے بود و باش کا ذکر آیا تو ان سے میں نے اس نئے زنانے فیشن کا ذکر چھیڑا۔ وہ بولے "ہاں ہماری عورتیں بھی یہ لباس اختیار کر رہی ہیں"۔ جب میں نے تعجب کا اظہار کیا تو انھوں نے سبق آموز لہجے میں کہا "صدیوں سے شاعر اور مصوّر عورتوں کے سراپے کے متعلق قیاس آرائی کرتے آئے ہیں اب جو وہ برضاد رغبت اپنے جسم کی نمائش سرِعام کر رہی ہے تو تم اعتراض کرنے والے کون ہو!"

بات میں جاپانی رہن سہن کی کر رہا تھا۔ اُن کی روزمرّہ کی غذا بہت سادہ بلکہ کچھ بدمزہ سی ہوتی ہے، لیکن اسے دسترخوان پر چننے اور سجانے میں ایسا تکلّف برتا جاتا ہے اور ہر لقمے پر شکریہ اور نوش جان کا ایسا غلغلہ بلند ہوتا ہے کہ گویا شادی کی دعوت ہو رہی ہو۔ اہلِ جاپان کی دوسری خوبی قدرتی مناظر سے لگاؤ ہے۔ کوئی ایسا گھر نہ ملے گا

جس میں پودے اور پھول نظر نہ آئیں اور پانی کا فوّارہ یا چھوٹا سا حوض دعوتِ فرحت نہ دیتا ہو۔

ملک کا سب سے خوبصورت حصّہ وہ وسیع پہاڑی علاقہ ہے جس کے بیچوں بیچ مشہورِ عالم کوہ آتش فشاں فیوجی یاما سربلند ہے۔ عموماً اس کی چوٹی سربلند رہتی ہے۔ میں نے پہلے کہیں اور فیوجیا ہوٹل کا ذکر کیا ہے جس میں میں نے قیام کیا تھا۔ دنیا میں بہت سے اچھے ہوٹلوں میں ٹھہرنے کا موقع ملا، لیکن اپنے ماحول اور آرائش کے لحاظ سے اس کا جواب نظر نہ آیا۔ کسی جاپانی رئیس کے محل کو بدل کر فیوجیا ہوٹل کی شکل دے دی گئی تھی اس دو منزلہ محل میں لگ بھگ پچاس کشادہ کمرے تھے اور اس کے ارد گرد چھے سو ایکڑ زمین پر پہاڑیوں، چشموں اور باغوں کا سلسلۂ دراز حدِ نظر تک پھیلا ہوا تھا۔ سامنے آسمان بوس کوہ فیوجی یاما آتشی جسم کو برفانی لبادے میں چھپائے ہوئے تھا۔ ہوٹل میں کمروں کے نمبر نہیں تھے بلکہ ہر کمرہ کسی نام سے موسوم تھا مثلاً ناریجی، انارکلی، چمپئی وغیرہ۔ ہر کمرے میں نام کی مناسبت سے آرائش کا انتظام تھا۔ دیوار، پردہ، فرنیچر، پلنگ حتیٰ کہ کمرے کی ملازمہ بھی اسی رنگ میں ملبوس تھی۔ رات کو جب میں ہوٹل کے طعام خانے میں گیا تو یہ دیکھ کر سخت متعجّب ہوا کہ مینیو پر پاکستان کے پرچم کا نقش چھپا ہوا ہے۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ میں ہوٹل کا پہلا پاکستانی مہمان تھا اور اس تقریب کی یاد میں یہ اہتمام کیا گیا تھا۔

۱۸۷۰ء تک جاپان مغرب کے لیے راز سربستہ رہا کیونکہ وہاں کسی غیر ملکی کا عمل دخل ناممکن تھا۔ اس کے بعد جب جاپانی دست کاری اور مصوّری کے نمونے یورپ پہنچنے لگے تو انھوں نے بالخصوص اُس اشاریاتی (IMPRESSIONIST) طرزِ مصوّری کو متاثر کیا جس نے فرانس میں فروغ پایا۔ گزشتہ جنگِ عظیم کے بعد جاپان نے فلم سازی میں جو تجربے کیے انھوں نے اس فن کا رُخ نئی سمت کی طرف موڑ دیا۔ اسی طرح جدید جاپانی ادب نے بھی بالخصوص فن ناول نگاری میں ایک نئی تحریک کا آغاز کیا۔ یہ تو سب کو معلوم ہے کہ صنعت کے ساتھ تعلیم میں بھی جاپان کا شمار صفِ اوّل کے ترقی یافتہ ممالک میں ہوتا

ہے ۔ یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ جاپان میں وہی چینی رسم الخط رائج ہے جسے دنیا کا سب سے مشکل طریقۂ تحریر کیا جاتا ہے ۔

یہ کیسا عجیب اتفاق ہے کہ مغرب کی سفید فام نسل کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ اِس وقت ایشیا کی زرد فام نسل کر رہی ہے ۔ فرق یہ ہے کہ مغرب کی رہبری جس برطانیہ نے کی تھی وہ جنگ میں اپنی فتح کے باوجود روبہ زوال ہے اور مشرق کا جو سب سے ترقی یافتہ ملک جاپان ہے وہ جنگ میں شکست کے باوجود روبہ عروج ہے ۔ تاریخ کے ان مضمرات کو سمجھے بغیر ترقی کے خواہاں نو آزاد ممالک اپنے مستقبل کی تعمیر صحیح طور پر نہیں کر سکتے ۔

چند دیگر ممالک کی بھولی بسری یادیں

(۱۶)

مجھے احساس ہے کہ صفحات گزشتہ میں میں اس تاثر اور مشاہدے کو خاطر خواہ طریقے سے بیان نہیں کر سکا جو تقریباً نصف عالم کی سیاحت کا تقاضا تھا۔ اس کا حق تو کوئی سفرنامہ ہی ادا کر سکتا ہے، البتہ اس باب کو ختم کرنے سے پہلے میں اپنی یادداشت کے نہاں خانے سے ان نقوش کو تلاش کرتا ہوں جو یہاں وہاں بکھرے پڑے ہیں۔ سری لنکا (جسے پہلے سیلون کہتے تھے) کی پُرکیف وادیوں کا حال تو سب نے سنا ہوگا۔ اُسے دُہرانے کے بجائے میں صرف ایک صحبت کا ذکر کرتا ہوں جس کا تعلق انگریزی کے شہرۂ آفاق مصنّف آلڈوس ہکسلے (ALDOUS HUXLEY) سے ہے۔ ہر انگریزی داں ان کے نام سے واقف ہوگا۔ ۱۹۶۱ء کے اواخر میں مجھے یونسکو کے ایک بین الاقوامی سیمنار کے انتظام کے لیے کولمبو جانا پڑا۔ ساحل سمندر کے ایک وسیع ہوٹل میں جب میں نے غیر ملکی نمائندوں اور سیمنار کے دفتر کے لیے تقریباً ستّر کمرے کرائے پر لیے تو مینیجر کی نظر میں میری دھاک بیٹھ گئی۔ اس نے طعام خانے میں میرے لیے الگ میز لگا دی جہاں سے سمندر کی لہروں کے اتار چڑھاؤ کا عجیب دلفریب نظارہ ہوتا تھا۔ اتنے میں سُنا کہ مسٹر ہکسلے اسی ہوٹل میں ٹھہرے ہیں بلکہ میں نے انھیں ایک دو بار احاطے میں ٹہلتے

بھی دیکھا۔ پھر ایک صبح میں ناشتہ کر رہا تھا تو وہ طعام خانے میں گم سم کھڑے نظر آئے۔ میں سمجھ گیا کہ کوئی بیرا انھیں نہیں پہچانتا اور انھیں بیٹھنے کی جگہ نہیں مل رہی ہے۔ میں نے اُٹھ کر اپنا تعارف کرایا اور پوچھا کہ میں ان کی کوئی مدد کر سکتا ہوں۔ وہ بولے کہ ایسی جگہ بیٹھنا چاہتا ہوں جہاں سے سمندر کا نظارہ ہو سکے۔ کیونکہ کوئی اور میز خالی نہ تھی اس لیے میں نے انھیں اپنے ساتھ بیٹھنے کی دعوت دی۔ اس طرح ہفتہ بھر ناشتے پر ان سے ہر طرح کی باتیں بے تکلفی سے کرنے کا شرف حاصل ہوا۔ اس کا خلاصہ بھی لکھوں تو ایک مضمون بن جائے۔ فقط دو دلچسپ مکالموں پر اکتفا کرتا ہوں۔

ہکسلے کی آنکھیں کم عمری سے اتنی خراب تھیں کہ لاکھ جتن کے باوجود بڑے بڑے ماہر انھیں اچھا نہیں کر سکے۔ فائدہ ہوا تو ایک نئے طریقۂ علاج سے جو آنکھوں کی ورزش کے اصول پر مبنی ہے۔ اس طرح ہکسلے کو کھوئی ہوئی بینائی واپس مل گئی اور انھوں نے اس کے متعلق ایک کتاب بھی لکھی ہے۔ اُس وقت میری بینائی اچھی خاصی تھی۔ اپنی کوتاہ بینی کا حال سناتے ہوئے انھوں نے کہا کہ مشکل یہ آن پڑی ہے کہ جب تک قریب سے کسی شکل کو نہ دیکھوں پہچانا نہیں جاتا، اگر کسی عورت کو غور سے دیکھوں تو اسے شکایت ہوتی ہے کہ گھور رہا ہوں اور اگر منھ پھیر لوں تو بدتمیزی کا گلہ ہوتا ہے۔ اس وقت کیا معلوم تھا کہ آج مجھے بھی اسی مشکل کا سامنا کرنا پڑے گا۔

ہکسلے کی شہرت کا آغاز اُن کے طنزیہ ناول بریو میو ورلڈ۔ —— (BRAVE MUE WORLD) سے ہوا۔ کم عمری میں اس کے مطالعے کے بعد میں نے اپنے کسی مضمون میں اس قیاس کا اظہار کیا تھا کہ انقلاب روس کے چند سال بعد سویت مزاحیہ نگار "زینیاتین" کے ایک ناول سے (جس کا اردو ترجمہ "ہم" قرار پائے گا) ہکسلے کی تحریر متاثر ہے۔ جب میں نے یہ بات چھیڑی تو ہکسلے نے متعجب ہو کر کہا کہ تمھارا قیاس صحیح ہے، لیکن یہ اندازہ تمھیں کیسے ہوا؟ چند سال بعد جب اس روسی ناول کا ترجمہ لندن میں چھپا تو ناقدوں نے اس مشابہت کا برملا اعتراف کیا۔

کولمبو کی ایک اور دلچسپ ملاقات یاد آتی ہے۔ سری لنکا میں ان دنوں جو وزیرِ تعلیم

تھے ان کا نام بدیع الدین تھا جو علی گڑھ یونیورسٹی کے ہوسٹل میں میرے پڑوس میں رہتے تھے۔ مدّتوں بعد کولمبو میں ملاقات ہوئی تو انھوں نے حق ہمسائیگی ادا کیا جس سے مجھے اپنے ادارے کے کام میں ہر طرح کی آسانی میسر آئی۔ دنیا کا پہلا خلا باز گگارین اسی زمانے میں سرکاری دورے پر سیلون آیا تو بدیع الدین نے اس کی دعوت میں مجھے بھی بلایا اور ہم دیر تک گگارین کے خلائی سفر کی دلچسپ داستان سنتے رہے۔

چند بار برما بھی گیا لیکن اندرونِ ملک بدامنی کی وجہ سے رنگون سے باہر نہ جا سکا۔ شہر میں بدھوں کی وہ عبادت گاہ دیدنی ہے جسے "شمگن پگوڈا" کہتے ہیں۔ اس کے گنبد پر سونے کا کلس چڑھا ہوا ہے۔ لیکن میری زیارت گاہ بہادر شاہ ظفر کی شکستہ قبر تھی۔ جس چھوٹے سے گھر میں اس بدنصیب کی آخری عمر بسر ہوئی اس کے احاطے میں یہ قبر تاریخ ہند کے طالب علم کو درسِ عبرت دے رہی ہے۔ کلکتہ کے دوران قیام میں "تیموریہ گھرانے کی آخری جھلک" کے عنوان سے اردو میں جو پہلا مضمون (۱۹۳۱ء میں) سپردِ قلم ہوا اس کا تعلق ظفر کے پڑپوتے مرزا بیدار بخت سے تھا۔

رنگون میں ایک بار یہ دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ ۱۹۶۴ء میں بنکاک سے وہاں پہنچا تو معلوم ہوا کہ شہر کے واحد مقبول ہوٹل میں کوئی کمرہ خالی نہیں ہے۔ مجبوراً ٹیکسی پر دوسرے ہوٹل کی جانب چلا جو شہر سے دور تھا۔ جنگ عظیم سے پہلے یہ کسی چینی امیر کبیر کا ایوان تھا اور اب حکومت نے اپنی تحویل میں لے لیا تھا۔ وہاں جا کر پتا چلا کہ چین سے کوئی بڑا طائفہ آیا ہے اور پورا ہوٹل اس کے تصرّف میں ہے۔ جب میری مشکل کا اندازہ اس طائفے کے ناظم کو ہوا تو اس نے میری قومیت دریافت کی۔ یہ سُن کر کہ میں پاکستانی ہوں اس کا دل پسیجا اور اُس نے ایک کمرہ میرے لیے خالی کر دیا۔ رات کو کھانے کے کمرے میں ستّر اسّی چینی ایک بڑی میز کے گرد بیٹھ گئے اور میں نے تن تنہا ایک کونا سنبھالا۔ اُس زمانے میں چین اقوام متحدہ کا رکن نہ تھا کیونکہ اس کی رکنیت کی ہر کوشش کو امریکہ ناکام بنا دیتا تھا۔ میں دل ہی دل میں ڈر رہا تھا کہ کہیں انھیں اس ادارے سے میرے تعلق کا پتا چل گیا تو سارا بھرم کھل جائے گا، مگر یہ بات چھپ بھی کیسے سکتی تھی۔ مجھے اکیلا دیکھ کر چینی

ترجمان قریب آیا اور میز پر سب کے ساتھ بیٹھنے پر اصرار کرنے لگا۔ میں اس محفل میں شریک ہوا تو باتوں باتوں میں ان لوگوں نے سفر کی وجہ دریافت کی۔ میں نے مناسب سمجھا کہ صاف صاف اپنی شناخت کرا دوں۔ اب کیا تھا گویا میں نے بھڑوں کا چھتّا چھیڑ دیا تھا۔ چینی زبان سے میں ناواقف ٹھہرا البتہ اُن کے تبصرے کی تلخی کو میں محسوس کرتا رہا۔ ترجمان دیر تک اقوام متحدہ پر نکتہ چینی کرتا رہا مگر بالآخر میں نے اسے باور کرا دیا کہ مجھ جیسے بہت سے لوگ چین کے بہی خواہ ہیں۔ جب انھیں میری نیک نیتی پر یقین آگیا تو چار دن ایسی خاطر مدارات کی جو اب تک یاد ہے۔ اس طائفے میں چینی ترکستان کے بھی بعض افراد تھے بلکہ ان میں ایک دو سے میں فارسی میں بھی بات چیت کر سکا۔ تھائی لینڈ، ملایا، سنگاپور وغیرہ کو جنوبی ایشیا میں خوش حالی اور تعلیمی ترقی کے لحاظ سے امتیاز حاصل ہے۔ مقامی باشندوں کی بہ نسبت چینی اقلیتوں کی کارکردگی کو زیادہ دخل ہے۔

میں نیپال ایک ہی بار ۱۹۶۴ء میں گیا۔ وہاں جیسی پس ماندگی ہے اور مفلوک حالی ہے ایشیا میں کہیں اور دیکھنے میں نہیں آئی۔ ذہن میں چند یادیں محفوظ ہیں۔ ایک تو کٹھمنڈو سے چند میل دور ایک پہاڑی پر چڑھ کر دوربین سے دنیا کے سب سے اونچے پہاڑ ایورسٹ کا نظارہ کیا۔ دوسرے شہر کے بیچوں بیچ وہ مندر دیکھا جو ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے ایک ناکام رہنما "نانا صاحب" کی راج کماری نے بنوایا تھا اور جس پر برطانوی قوم کے لیے بددعائیں کندہ ہیں۔ مرہٹوں کے آخری سربراہ باجی راؤ پیشوا کو پونا سے لاکر انگریزوں نے یہاں نظر بند کیا تو اس نے قریبی عزیز "نانا صاحب" کو اپنا جانشین نامزد کیا۔ پیشوا کے انتقال کے بعد حکومت ہند نے نانا صاحب کا حق تسلیم نہیں کیا جس کا انتقام اُس نے ۱۸۵۷ء میں لیا۔ شکست کے بعد اُس نے نیپال میں پناہ لی۔ آخر دم تک اس کا مونس و غم خوار کانپور کا عظیم اللہ رہا جس کا انتقال ایک سو بیس سال کی عمر میں آزادی ہند کے بعد ہوا۔ انتقال سے پہلے اُس نے اپنے حالات قلم بند کر دیے تھے۔ میری اطلاع کے مطابق ۱۹۵۲ء میں یہ مسودہ مولانا ابوالکلام آزاد کے زیرِ مطالعہ تھا۔ بعد میں معلوم نہیں شائع ہوا یا نہیں۔ کٹھمنڈو میں یونیورسٹی لائبریری جب خالی

خالی سی نظر آئی تو کسی نے کہا کہ ملک کا سب سے اچھا کتب خانہ پرانے رئیس رانا قیصر شمشیر جنگ کی حویلی میں ہے۔ درحقیقت یہ اپنی نوعیت کا نادر کتب خانہ نکلا۔ اس میں تقریباً تیس ہزار انگریزی کی کتابیں ہوں گی جو بیشتر تاریخ، سیاست، سوانح عمری وغیرہ پر مشتمل تھیں۔ رانا صاحب ایک عمر رسیدہ بزرگ تھے اور آمدنی کا زیادہ حصہ کتابوں پر اور وقت ان کی نگہداشت پر صرف کرتے تھے۔ یہی حال اس پادری اسٹوکس کے کتب خانے کا تھا جو آریہ سماجی بن کر شملہ سے دُور رہ پڑا تھا جس کا ذکر اوپر کہیں آیا ہے۔ کٹھمنڈو کے بیگم محلے سے واجد علی شاہ کی بیگم حضرت محل کا نام وابستہ ہے جنھوں نے ۱۸۵۷ء میں لکھنؤ میں دلیرانہ غاصبوں کا مقابلہ کیا اور پھر ناچار یہاں پناہ لی۔ میں نے ان کی قبر پر کوئی کتبہ نہ پایا تو نیپال کے محکمۂ آثار قدیمہ سے کہہ کر انگریزی میں نام کی تختی آویزاں کرادی۔

کبھی اپنے کو استنبول کے کنارے باسفورس کی موجوں پر سیر کناں پاتا ہوں۔ یہ گویا تاریخ کی سیرگاہ ہے۔ سوئٹزرلینڈ میں جنیوا کی وسیع جھیل کی گردش میں فطری حسن کی کرشمہ گری کی مثال نہیں ملتی۔ اس مقام میں میرے لیے خاص کشش ہے جہاں تاریخ کی عظمت حُسنِ فطرت سے ہم کنار ہے۔ اس کی مثال دیکھنا ہو تو فرانس میں دریائے "لوار" کی وادی کا تماشا کیجیے جہاں عہدِ وسطیٰ کے محل معماروں اور صنّاعوں کی مدح خوانی کر رہے ہیں۔

اطالیہ میں نیپلز کے قریب اگر ایک طرف "پوم پی آئی" کا خرابہ سلطنت روما کے جلال کی شہادت دے رہا ہے تو وہیں کوہ آتش فشاں "وے سوویس" چشم غضب روشن کیے دہکتا ہوا لاوا اُگل رہا ہے۔

کبھی ذہن اس جگہ لے جاتا ہے جہاں آسٹریا اور ہنگری کی سرحد ملتی ہے۔ اشتراکیت کے عتاب سے بچنے کے لیے خانہ بدوشوں نے یہاں پناہ لی اور بے سروسامانی کے باوجود اُن کے خیموں میں رقص و سرود کی محفل گرم ہے۔ ذہن ایک اور رات کی طرف پلٹتا ہے۔ ایتھنز میں قدیم یونان کی یاد دلانے کے لیے "ایکروپولس" میں کچھ شکستہ عمارتوں کے آثار باقی ہیں۔ یہ وہی جگہ ہے جسے ایران کے فاتح "دارا" نے نذرِ آتش کر دیا تھا اور بعد میں

اس کا انتقام سکندر نے ایران کے شہر "پرس پولس" سے لیا جو شیراز کے قریب اپنے ماضی کا ماتم کر رہا ہے۔ ایتھنز میں کسی شناسا نے بتلایا کہ "ایکروپولس" کے پاس چند ایسے مہمان خانے بنائے گئے ہیں جہاں ہر چیز یونانی وضع کی ہے۔ لباس، غذا، مشروب، برتن، غرض کہ ہر شے اس قدیم تہذیب کی آئینہ دار ہے جو ہمیں اب نئی لگتی ہے۔ یادداشت پر کیسے کیسے تماشوں کے نقش باقی ہیں، ان میں سے کچھ کا حال جستہ جستہ لکھ دیا گیا ہے اور باقی کو دل کے خلوت خانے میں محفوظ رکھ لیا ہے۔ بیدل نے کیا خوب کہا ہے ؎

النویدا ے دل کہ عمرِ رفتہ را دریافتم

ادب کا ماضی و حال

(۱۷)

تہذیب اور زبان کے ارتقا میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ یہ بھی مسلّمہ حقیقت ہے کہ ادبی تخلیق کی سب سے پرانی اور مقبول شکل شاعری ہے۔ تاریخی لحاظ سے اس کا قدیم ترین نمونہ "گلگامش" نامی وہ طویل نظم ہے جو آج سے تقریباً سات ہزار سال پہلے بابل میں لکھی گئی تھی اور ہنوز محفوظ ہے۔ نظم کے کاتب کا بیان ہے کہ اس کا کچھ حصّہ دو ہزار سال پہلے کسی اور تحریر سے لیا گیا تھا۔ بالفاظ دیگر یہ نظم لگ بھگ نو ہزار سال قبل وجود میں آئی ہوگی۔ اس میں طوفانِ نوح کا ذکر تفصیل سے کیا گیا ہے اور بیان اور مشاہدے کی قابلِ توجہ خوبیاں نظر آتی ہیں۔

ہزاروں سال کے دوران انسان کی تخلیقی صلاحیت جیسے جیسے پروان چڑھتی گئی، شاعری اور دیگر فنون میں کیسے کیسے شاہکار معرضِ وجود میں آئے، ان کا سہرا کسی حد تک ماحول کے خارجی اثرات پر اور کسی حد تک فن کار کے انفرادی جوہر پر ہے۔ تخلیق کا عمل بڑا پیچیدہ ہے اور اسے آسانی سے کسی مفروضے یا نظریے میں نہیں سمیٹا جا سکتا ہے۔

نظم اور نثر یہ دو ادب کی واضح شکلیں ہیں۔ تا زمانۂ حال ان میں اہمیت نظم ہی کو

حاصل رہی ہے اور اس کی وجہ ظاہر ہے۔ الفاظ میں اگر ترنم ہو اور انھیں کسی بحر کا پابند کر دیا جائے تو ان میں موسیقی کی وہ تاثیر پیدا ہوتی ہے جو دل کی گہرائی تک پہنچتی ہے اور یادداشت پر نقش ہو جاتی ہے۔ دیوتا کی دعا ہو یا سردار قبیلہ کی توصیف، آبا و اجداد کے کارناموں کا ذکر ہو یا شادی بیاہ کی تقریب، ہر موقع کا اظہار نظم کے وسیلے سے ہوتا تھا۔ اس کے بیشتر حصے کو تک بندی قرار دیا جائے گا لیکن بہر صورت یہ بھی شاعری کی ابتدائی شکل ہی تھی۔

عظیم شاعری کی ابتدا تہذیب کے اسی گہوارے میں ہوئی جسے یونان کہتے ہیں۔ تین ہزار سال قبل ایلیڈ اور اوڈیسی نامی اُن ایپک نظموں کی تخلیق ہوئی جو ہومر کے نام سے منسوب ہیں۔ اردو میں ایپک کا ترجمہ رزمیہ کیا جاتا ہے جس کی صحت محل نظر ہے۔ اوڈیسی کے علاوہ دانتے کی "ڈوائن کامیڈی"، اور ملٹن کی "پیراڈائز لاسٹ" کا شمار ایپک نظموں میں ہوتا ہے، لیکن یہ کسی اعتبار سے رزم کی منظوم داستان نہیں ہیں۔ شاہ نامہ فردوسی کے علاوہ ہمارے یہاں کسی بڑی رزمیہ نظم کی تخلیق نہیں ہوئی۔ واقعتاً یہ رزمیہ نظم ہے لیکن صرف اس وجہ سے ایپک کو رزم سے منسوب نہیں کیا جا سکتا ہے۔ سنسکرت میں رامائن اور مہابھارت کا شمار اسی فہرست کے تحت ہوتا ہے۔

بعد ازاں مختلف زبانوں میں طرز و بیان نیز تخیّل و تنوع کے لحاظ سے تخلیق کی کئی نادر مثالیں ایجاد ہوئیں۔ ان میں جو کیفیت سب سے وافر نظر آتی ہے وہ ہے حُسن کی کشش اور عشق کا جذبہ، فطرت کی کرشمہ سازی کا تحیّر، ابدی حقیقت کی تلاش اور حاکمِ وقت کی مدح خوانی۔ مشرق کے مقابلے میں مغربی شاعری میں قصیدے اور حمد کا ہی نہیں بلکہ تصوّف کا عنصر بھی کم ملے گا۔

شاعری سے قطع نظر تخلیقی نثر میں اظہار کے لیے ڈراما اور فکشن کے پیرائے تلاش کیے گئے۔ فکشن کی جامعیت کو اردو کے ایک لفظ میں ادا نہیں کیا جا سکتا۔ یہ داستان مختصر افسانے اور ناول سبھی پر حاوی ہے۔ ڈراما بھی تہذیب کے اسی طلسم کدۂ یونان کی ایجاد ہے۔ تقریباً ڈھائی ہزار سال قبل وہیں ڈراما اور اسٹیج کی ایسی مثالیں قایم ہوئیں جن کے خطوط پر

اس فن نے ترقی کی بڑی بڑی منزلیں سر کیں۔ اداکاری، مجسّمہ سازی، نقاشی اور رقص سے عہدِ وسطیٰ کے مسلمانوں کو ایسا تعصّب تھا کہ مسلم ممالک میں ان کی پذیرائی نہ ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ادب میں ڈراما نگاری کے قابلِ قدر نمونوں کا یکسر فقدان ہے۔ البتہ سنسکرت میں کئی ناٹک لکھے گئے جن میں کالی داس کے شکنتلا کو شاہکار کا درجہ حاصل ہے۔ مدت ہوئی اس کا ترجمہ میں نے اردو میں کیا تھا۔ ہندوؤں میں رام لیلا کے موقع پر، جو سوانگ رچائے جاتے ہیں یا جاپان میں "نو" کے نام سے جو ناٹک اسٹیج کیا جاتا ہے اس میں تماشے کا لطف ضرور ہے لیکن ادبی شان نہیں۔ اس تخلیقی افلاس کا مقابلہ اس فنّی عظمت سے کیجیے جس کا کمال شکسپیئر کے ڈراموں میں ظاہر ہوتا ہے۔ ان کے حوالے سے شکسپیئر کا شمار دُنیا کے عظیم فن کاروں میں ہوتا ہے۔ پھر گوئٹے اور مولیئر سے لے کر ابسن، برنارڈ شا، چیخوف وغیرہ کو یاد کیجیے تو ادب کے سرمائے میں ایسا بیش بہا اضافہ ہوا جس کی مقبولیت مغرب میں ادب کے کسی اور شعبے سے کم نہیں۔

فکشن کی ابتدا قصّہ گوئی سے ہوئی البتہ اس کے اوّلین نمونے چرند و پرند کی اُن کہانیوں میں ملیں گے جو ڈیڑھ ہزار سال پہلے سنسکرت میں "پنچ تنتر" نامی کتاب میں لکھے گئے اور بعد ازاں عربی میں کلیلہ و دمنہ کے نام سے روشناس ہوئے۔ اس وقت تک نثر میں تاریخ، فلسفہ، طب وغیرہ پر کتابیں لکھی جاتی تھیں مگر تخیّل کے اظہار کی صلاحیت پیدا نہ ہوئی تھی۔ تاہم ارسطو اور افلاطون کی نثر کے صاف ستھرے منطقی انداز پر غور کیا جائے تو حیرت ہوتی ہے کہ کوئی ڈھائی ہزار سال قبل کس طرح یونان میں نازک اور پیچیدہ مسائل کو اس سلاست سے ادا کرنے کا سلیقہ پیدا ہو چکا تھا جو ہمیں اب بھی میسّر نہیں ہے۔ فکر و فن میں یونان کی اوّلیت کو مغرب کے علاوہ عربوں نے بھی تسلیم کیا ہے۔

شاعری اور ڈراما نگاری کے مقابلے میں فکشن کی تاریخ نسبتاً نئی ہے۔ اسے ہزار سال سے کم مدّت میں عروج حاصل ہوا۔ سنسکرت میں اس کی پہلی مثال "کتھا سرت ساگر" اور عربی میں "الف لیلہ" ہے۔ عہدِ وسطیٰ میں لاطینی زبان کے زوال کے بعد جب یورپین زبانیں موجودہ روش پر گامزن ہوئیں تو راستہ انھیں نثری داستانوں نے دکھلایا۔ انگریزی میں ان کی

یہ پہلی مثال چوسر کی کینٹر بری ٹیلس (CANTERBURY TALES) اطالوی میں بکیسیو کی ڈیکیمران (DECAMERON) اور ہسپانوی میں سرون تیز (CERVENTES) کی ڈان کوئیک زوٹ (DON QUIXOTE) ہے۔ یہ سب چودھویں پندرھویں صدی میں تحریر ہوئیں۔ صرف انھیں پر نہیں بلکہ سنسکرت کی مذکورہ بالا کتاب پر بھی عربوں کی داستان گوئی کا اثر نمایاں ہے۔

اب ہم تاریخِ ادب کے اس موڑ پر پہنچ گئے جب پندرھویں صدی کے آخر میں مغرب میں خوش نویسی کی جگہ چھاپے خانے کی طباعت نے لے لی۔ اس سے قبل قلمی مسودے کی چند نقلیں مخصوص افراد یا کتب خانوں تک محدود رہتی تھیں۔ اب چھاپے خانے میں یہی مسودے سیکڑوں بلکہ ہزاروں کی تعداد میں شایع ہو کر دور دور تقسیم ہونے لگے۔

اسی زمانے میں یورپ میں نشاۃ الثانیہ کے ساتھ دورِ جدید کا آغاز ہوا۔ نئے ملکوں کی دریافت، عقلی علوم کی ترقی اور پرانی کتابوں کے تراجم نے قومی زبان میں نثر نگاری کو ایسا فروغ دیا کہ اٹھارویں صدی تک اس میں اسلوب اور انشا کی صلاحیتیں پیدا ہو گئیں۔ اگر فرانس میں روسو اور والٹیر جیسے مفکّروں کا زورِ بیان نظر آتا ہے تو انگلستان میں ڈاکٹر جانسن کی انشا پردازی کا کمال نمایاں ہوتا ہے۔ چھپی ہوئی نثری کتابوں کی ترویج اور نثر نگاری کے فروغ کے ساتھ عوام میں تعلیم و علم کے شوق کا براہِ راست تعلّق ہے۔

اس پس منظر میں غور کیجیے کہ انقلاب فرانس نے کس طرح مغربی ادب کو اثر انداز کیا جب اس نے حکومت اور کلیسا کو دینی اور دنیاوی امور میں جدا جدا کر دیا۔ اس طرح معاشرے کا محور خدا اور حکومت کی بجائے انسان قرار پایا۔ اس فلسفۂ زندگی کی صدائے بازگشت لازمی طور پر ادب میں بھی سنائی دیتی ہے۔ فرانس کے سیاسی اور فکری انقلاب ۱۷۸۹ء سے تیس ۳۰ سال پہلے انگلستان میں صنعتی انقلاب ۱۷۶۰ء شروع ہو چکا تھا۔ تاریخ عالم میں اٹھارویں صدی کو بڑی اہمیت حاصل ہے کیونکہ اس کی ابتدا کے وقت مسلمان زوال کی سیڑھیوں پر اُترنے اور مغرب صنعت اور سائنس کے سہارے بامِ عروج پر چڑھنے لگا تھا۔ اس کیفیت کی جھلک مغرب میں رومانی تحریک کے جوش اور ولولے میں نظر آتی ہے جو بیک

دقت موسیقی، مصوّری اور شاعری میں نمایاں ہے۔ اس کے برعکس افسردگی اور اضمحلال کا غبار مشرقی شاعری پر سایہ فگن ہوا۔ اس اندوہناک امر کو بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ اٹھارویں صدی تک ایشیا نے نہ چھاپے خانے کی طرف توجہ دی اور نہ نثر کی اس فطری صلاحیتوں سے آگاہی حاصل کی جن کے بغیر نہ تعلیم عام ہو سکتی ہے اور نہ جدید علوم کا اظہار ہو سکتا ہے۔

ان تغیرات کے جلو میں فکشن کا وہ عظیم دور شروع ہوا جو دو سو سال کی قلیل مدت میں تخلیق کے میدان میں شاعری اور ڈراما نگاری سے رفتہ رفتہ آگے بڑھ گیا۔ تخلیقی نثر کچھ عرصے تک شاعری کی پیروی میں رومان اور حُسن کی وادیوں میں سرگرداں رہی لیکن انیسویں صدی میں اُس نے حقیقت نگاری کی وہ شاہ راہ تلاش کر لی جس کے رہنما بالزاک اور چارلس ڈکنس جیسے ناول نگار تھے۔ بالخصوص فرانس میں اس ادبی تحریک نے بڑے بڑے ادیب پیدا کیے جن کا اثر عالمگیر اور دور رس ثابت ہوا۔ البتہ روسی زبان نے فکشن میں ناول نگاری کے فن کو ایسی جلا دی جو وہیں کی سرزمین کے ماحول اور مزاج سے عبارت ہے۔ مثال کے طور پر ٹالسٹائے اور دستووسکی جن کا شمار ناول نگاری کے اماموں میں ہوتا ہے ان دونوں کا فن مختلف سمتوں میں جاتا ہے، لیکن ان میں ایک قدر مشترک ہے اور وہ ہے اخلاق اور صداقت کی تلاش۔ مغربی حقیقت نگاری زندگی کی خوبیوں اور خرابیوں کے تجزیے پر اکتفا کرتی ہے لیکن روس کے فن کار اسے انسانی اور اخلاقی قدروں سے روشناس کراتے ہیں یہ حقیقت (REALITY) اور صداقت (TRUTH) کا وہ امتیاز ہے جسے نظر انداز کر کے دورِ حاضر نے ریاکاری، منافقت اور دوعملی کا بہروپ اختیار کر لیا ہے۔

اس گہرے اخلاقی احساس نے ٹالسٹائے کو اس ادبی نظریے کی تلقین کی طرف راغب کیا جس کا اظہار اس کی معرکہ آرا کتاب "WHAT IS ART" میں ہوا ہے۔ انیسویں صدی کے آخر میں جب ٹالسٹائے نے اس موضوع پر قلم اٹھایا تو وہ خود اپنی دولت و ثروت سے منہ موڑ کر درویشی کی راہ اختیار کر چکا تھا۔ اس کے ناولوں، ڈراموں اور افسانوں میں اخلاقی اور انسانی قدروں کی جو جستجو نظر آتی ہے اس کی جھلک اس کے

نظریۂ ادب میں بھی ملتی ہے۔ مغرب کے لیے یہ ایک نئی آواز تھی۔ اس کے ادب میں جو جمالیاتی، تکنیکی اور سائنٹیفک روایتیں سرایت کر گئی تھیں اس نئی آواز کو آسانی سے قبول نہ کر سکی، لیکن روس میں اس کا اثر انقلاب کے بعد بھی باقی رہا البتہ اس کی شکل یوں بدل گئی کہ اب اخلاق کا تصوّر روحانیت سے ہٹ کر مادّی زندگی کی طرف منتقل ہو گیا۔ بہر کیف ٹالسٹائے کا یہ نقطۂ نظر بنیادی طور پر باقی رہا کہ ادب کی تخلیق بے مقصد نہیں ہونا چاہیے اور اس کا صرف یہی جواز ہے کہ وہ انسانیت کی بہتری کے لیے کوشاں ہو۔

بیسویں صدی کے آغاز میں ان واضح خطوط سے ہٹ کر مغربی فکشن میں بڑے بڑے تجربے ہوئے جنھیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس صدی کے شروع میں ایمل زولا کے ساتھ حقیقت نگاری کا بڑا دور پیٹر لوئی نیز آسکر وائلڈ کے ساتھ رومان نگاری کا عہد ختم ہونے کو آیا۔ ظاہر سے ہٹ کر ناول نے باطن کا تجزیہ شروع کیا۔ دستووسکی کے اسلوب نے روس سے زیادہ مغرب کو متاثر کیا اور فرائڈ کے تحلیلِ نفسی کے نظریے نے شعر و ادب کے مزاج کو بدل کر رکھ دیا۔ علاوہ بریں انقلاب روس کے بعد نوآبادیوں کی جنگِ آزادی اور سماجی بے انصافی کے شعور نے ادبِ عالم کو جس طرح متاثر کیا اس کے ہم سب شاہد ہیں۔

دورِ حاضر کی تاریخ میں دوسری جنگِ عظیم کو سنگِ میل کی حیثیت حاصل ہے۔ اس کے بعد دنیا وہ نہیں رہی جو پہلے تھی۔ یہ تبدیلی اتنی ہمہ گیر تھی کہ اس کا اثر آج بھی ہماری زندگی پر سایہ فگن ہے۔ اگر ایک طرف اشتراکیت کا سیلاب روس سے باہر نکل کر مشرق میں چین اور مغرب میں وسطی یورپ میں پھیل گیا تو دوسری طرف یورپی سامراج کے شکنجے سے افریقہ اور ایشیا کو گلو خلاصی مل گئی۔ ان نوآزاد ملکوں کے ساتھ جنوبی امریکہ کے پس ماندہ ملکوں کو جوڑ کر نقشے پر وہ خطۂ ارض اُبھرا جسے تیسری دنیا کہتے ہیں۔ افلاس و جہالت کی لعنتوں سے رہائی کے لیے یہاں رجعت اور ترقی میں جو کش مکش ہو رہی ہے ہم سب اس میں مبتلا ہیں۔ مغربی سرمایہ دارانہ نظام میں سائنس کی روز افزوں ترقی کے ساتھ انسانی قدروں کے زوال کا، اشتراکی سماج میں ریاست کی آمریت کے مقابل فرد کی بے بسی اور تیسری دنیا میں پرانی اور نئی قدروں کی کش مکش نے فکر و عمل کے ہر شعبے کی طرح ادب میں بھی

انتشار کی کیفیت پیدا کر دی اور وہ ولولہ سر دبڑنے لگا جس نے انقلاب اور آزادی کا صور پھونکا تھا۔ وہ آدرش خاک بسر ہونے لگے جن کی روشنی میں ہماری نثر نجات کی راہ تلاش کرنے لگی تھی۔ گم شدگی اور بے راہ روی کا یہ احساس مغربی ادب میں شدت سے نظر آتا ہے ——— یہ امر قابلِ غور ہے کہ گزشتہ جنگِ عظیم کے بعد دنیا نے کوئی عظیم ادیب یا شاعر پیدا نہیں کیا۔ سارتر، مالرو اور پابلو نرودا وغیرہ کا شمار ان لوگوں میں ہو گا جو اس صدی کے شروع میں پیدا ہو کر جنگِ عظیم تک اپنی تخلیقی صلاحیتوں کے عروج پر پہنچ چکے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ کتاب خوانوں کی تعداد پہلے سے بہت زیادہ بڑھ گئی ہے لیکن ان کی اکثریت کو نیم خواندہ کہا جائے گا جن کی تسکین سستے قسم کے تفریحی ادب سے ہو جاتی ہے۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا ہے کہ تخلیق کا عمل بند ہو گیا ہے، البتہ اس میں تکنیک کے تجربے کے نام پر الفاظ کے اُلٹ پھیر کے ساتھ فکر اور مشاہدے کی تکرار کا ہیجان سا برپا ہے جن کی اہمیت اور وقعت کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔

مغرب کے اقتدار سے پہلے ایشیا میں تخلیقی نثر کی روایت برائے نام تھی۔ انیسویں صدی میں چھاپے خانوں اور جدید علوم کی ترویج کے ساتھ اس کی رگوں میں تازہ خون آیا، جس کا ذکر بعد میں آئے گا۔ آسانی کی خاطر میں اس بحث کو صرف فارسی اور اردو تک محدود رکھوں گا، البتہ ان زبانوں کی شاعری نے صرف ہمارے ہی نہیں بلکہ دنیا کے ادبی ورثے کو جو بیش بہا عطیہ فراہم کیا ہے اس کا اعتراف اب مغرب کے اہلِ نظر بھی کرنے لگے ہیں۔ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ نے شاعری کو تین خانوں میں تقسیم کیا ہے۔ صوتی۔ بصری، اور فکری۔ صوتی شاعری سے مراد وہ کلام ہے جو اپنے آہنگ، نغمگی اور موسیقیت کے اثر سے دل پر قابو کر لے۔ بصری شاعری کا امتیاز یہ ہے کہ وہ الفاظ کی بوقلمونی سے رزم و بزم کی ایسی محفل سجائے یا واردات و واقعات کی ایسی تصویر کھینچے جو مصوّر اور مجسّمہ ساز کا حق ادا کرے۔ فکری شاعری میں حقیقت و حکمت کا بیان ایسی ندرت سے کیا جائے کہ فلسفے کی موشگافیاں بے نقاب ہو جائیں۔

اس معیار پر جانچا جائے تو ہماری شاعری بعض اعتبار سے اپنا جواب نہیں رکھتی۔ یوں تو سب کو اپنی زبان پیاری ہوتی ہے اور شعر کا خاطر خواہ ترجمہ مشکل ہے تاہم جن لوگوں میں زبان و ادب کے تقابلی مطالعے کی صلاحیت ہے وہ اس معاملے میں انصاف کر سکتے ہیں۔ اگر رزمیہ نظموں کا احاطہ کیا جائے تو شاہنامہ، رامائن اور مہابھارت کی مجموعی حیثیت ان کے مدِّمقابل مغربی ایپک سے یقیناً کم نہیں ہے۔ یہ بھی مانی ہوئی بات ہے کہ صوفیانہ شاعری میں رومی کا مرتبہ دنیا میں کسی کو حاصل نہیں ہے۔ بیسویں صدی کی شاعری کا طرۂ امتیاز اس کا فکری عنصر ہے اور اس ضمن میں اقبال کا نام ایلیٹ اور رلکے کے ساتھ لیا جائے گا۔

بایں ہمہ شاعری کا اصل میدان حسن و عشق کا بیان ہے اور اس ضمن میں موازنہ آسان نہیں ہے۔ فارسی اور اردو میں عشقیہ شاعری کا اظہار بڑی حد تک غزل میں ہوا ہے۔ یہ ایسی منفرد صنفِ سخن ہے جو (عربی کے علاوہ) اور کہیں نہیں پائی جاتی۔ بحر، قافیہ، اور ردیف کی پابندی برقرار رکھتے ہوئے چند الفاظ پر مشتمل دو مصرعوں میں کسی ایسے جذبے یا خیال کی طرف اشارہ کرنا جس کا تعلق حسن و عشق کی کسی کیفیت سے ہو ایک قسم کا امتحان ہے جس میں کامیابی مشکل سے میسّر آتی ہے۔ اچھی نثر میں لفظ کا کام معنیٰ کو چھپانا نہیں بلکہ اُجاگر کرنا ہے۔ اسی کے برعکس غزل کی زبان میں لفظ معنیٰ کو جتنا عیاں کرتا ہے اس سے زیادہ نہاں رکھتا ہے۔ معنی آفرینی کا کمال نہ بھی ہو تو آہنگ کا وہ لطف شاعری میں موسیقی کی شان پیدا کر دیتا ہے۔ لفظ و معنیٰ کا یہ رشتہ آہنگ کے پورے کمال کے ساتھ جس طرح حافظ کے کلام میں ملتا ہے اس کی نظیر اور کہیں نظر نہیں آتی۔ اردو میں یہ خوبی میرؔ کے یہاں بدرجۂ اتم ملتی ہے۔

یہ اعتراض اپنی جگہ بجا ہے کہ غزل کی صنف میں تخیّل کے اظہار کی گنجائش کم ہے، اور اسی وجہ سے اس میں چند بندھے ٹکے مضامین کی تکرار ذوقِ سلیم کو گراں گزرتی ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ بیشتر غزلوں میں لفظی اور قافیہ پیمائی کے علاوہ اور کچھ نہ ملے گا۔ پھر بھی مختلف غزلوں کا اتنا بڑا سرمایہ موجود ہے جو عشقیہ شاعری کی عظیم المثال ترجمانی کرتا ہے۔ جو قبولِ عام غزلوں کو حاصل ہے وہ کسی اور صنفِ سخن کو نہیں۔ اس کی گائیکی ہماری موسیقی

میں بذاتِ خود ایک منفرد مقام رکھتی ہے اور مہذّب محفلوں میں اشعار کا برمحل استعمال شائستگی کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ اس کے شاعرانہ محاسن و عیوب سے قطع نظر قبولِ عام کی صنعت ہمارے تہذیبی ورثے میں غزل کی اہمیت کی نشان دہی کرتی ہے۔

بیسویں صدی میں مغرب کی طرح مشرق میں بھی شاعری کا مزاج بدلا اور اس کا محور جذبات سے ہٹ کر افکار کی طرف آگیا۔ ہماری زبان میں غزل کی گرفت کو حالی اور اقبال کے اثر نے کمزور کیا ہے۔ اب جو بڑے نظم نگار اور غزل گو شعرا کا دور ختم ہونے کو آیا تو آزاد نظم اور جدید غزل میں تجربے کی کوششیں شروع ہوئیں۔ ان کے مستقبل کے متعلق ابھی کوئی رائے زنی نہیں کی جا سکتی ہے۔

صحیح معنوں میں اردو نثر کی نشو و نما اس وقت شروع ہوئی جب ۱۸۳۵ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے فارسی کے بجائے انگریزی کو دفتری زبان بنا دیا۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ فصیح اردو کے خد و خال اس سے پہلے روشن نہ ہو چکے تھے۔ اٹھارویں صدی کے آخر میں انشاء اللہ خاں انشا نے رانی کیتکی کی کہانی اور بیسویں صدی کے آغاز میں میر امن نے باغ و بہار لکھ کر یہ ثابت کر دیا تھا کہ قصّہ گوئی کے لیے مسجّع و مقفیٰ عبارت کی ضرورت نہیں ہے۔ فصاحت کی یہی مثال دلّی کالج کی علمی کتابوں اور غالب کے خطوط میں ملتی ہے، لیکن اردو نثر کو ترقی دراصل ۱۸۵۷ء کے بعد میسّر آئی۔ سر سیّد احمد خان اور ان کے رفقا نے اس ضمن میں جو خدمت انجام دی وہ تو جگ ظاہر ہے، مگر ہم اکثر اس کارنامے کو فراموش کر جاتے ہیں جو رتن ناتھ سرشار نے انجام دیا۔ نہ صرف انھوں نے اردو میں ناول نگاری کے فن کی ابتدا کی بلکہ نثر کو طلسماتی داستانوں کے اس چیستان سے نجات دلائی جن کے نام بھی اب یاد نہیں رہے۔ یہی نہیں بلکہ فسانۂ آزاد میں سرشار نے اودھ کے زوال پذیر جاگیردارانہ سماج کی جیسی قلعی کھولی وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اس کی تھوڑی سی جھلک ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں میں ملے گی۔ سرشار نے خوجی اور نذیر احمد نے ظاہر دار بیگ کی شکل میں لکھنؤ اور دہلی کے کھوکھلے معاشرے کا جیسا خاکہ اُڑایا ہے اس کی تقلید کوئی نہ کر سکا۔

اردو نثر کی کوتاہیوں کا محاسبہ کرتے وقت اس کی کم عمری کا لحاظ کرنا چاہیے، اور

اس سے زیادہ اس امر کی طرف توجہ ضروری ہے کہ دو تناور درختوں نے اس کی باڑھ کو روک دیا۔ میری مراد فارسی اور انگریزی سے ہے جو یکے بعد دیگرے ملکی، تعلیمی اور دفتری زبانیں رہیں۔ تا زمانۂ حال اردو شاعری پر لسانی اعتبار سے فارسی کا اثر اتنا گہرا رہا کہ وہ اپنی سرزمین کے ماحول سے بڑی حد تک بے خبر رہی اور ایسا لہجہ اختیار کیا گویا کوئی ایرانی چند الفاظ کے ہیر پھیر کے ساتھ اظہارِ بیان کر رہا ہو۔ پُرانے شاعروں میں صرف میرؔ اور نظیرؔ کا نام یاد آتا ہے جنھوں نے فارسی کے بارِ گراں سے اردو کی انفرادیت کو بچائے رکھا۔

چھاپے خانے کی ترویج کے ساتھ جب اردو نثر میں ہر قسم کی کتابیں شائع ہونے لگیں تو پڑھنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ لامحالہ زبان ایوان و منبر سے اُتر کر عوام کی سطح تک آنے لگی۔ اسالیب کے تنوع کے باوجود دو واضح رجحانات شروع سے نظر آتے ہیں۔ ایک طرف مرزا رجب علی بیگ سرورؔ، محمد حسین آزادؔ، ابوالکلام آزادؔ، نیازؔ فتح پوری وغیرہ کی انشا پردازی ہے جس میں بلاغت اور حُسنِ بیان کا خاص اہتمام کیا گیا ہے، دوسری طرف دلّی کا وہ روزمرّہ ہے جس کا سلسلہ میر امّن اور غالبؔ سے شروع ہو کر حالیؔ، نذیر احمد اور عبدالحق تک آتا ہے۔

بیسویں صدی کے اوائل میں ایسے لوگوں نے بساطِ ادب پر قدم رکھنا شروع کیا جن کی رسائی براہِ راست انگریزی ادب پر تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مغرب میں رومانی تحریک ختم ہو چلی تھی، لیکن اس کی صدائے بازگشت آسکر وائلڈ اور پیٹر لوئی کی لذت پسندی میں سُنائی دے رہی تھی۔ اردو میں یہ آواز نئی تھی اور اس نے حُسن شناسی اور حُسنِ بیان کے نئے پیرائے ایجاد کیے۔ رومان پسند انشا پردازوں میں سرفہرست میر ناصر علی کا نام آتا ہے جنھوں نے اپنے رسالے "صلائے عام" میں رنگین بیانی کے ایسے جوہر دکھلائے کہ نثر میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا۔ نازک مزاجی میں وہ میر تقی میرؔ سے کم نہ تھے۔ رسالے کا مسودّہ از اوّل تا آخر ہر مہینے بیس سال تک اپنے قلم سے لکھا کیے کیونکہ کسی اور کی تحریر ان کے معیار پر پوری نہیں اُترتی تھی۔ گھر پر کاتب بٹھا رکھا تھا بلکہ ایک پریس بھی لگا رکھا تھا تاکہ کتابت اور طباعت میں غلطی کا احتمال بھی نہ رہے۔ نیازؔ کا طرزِ نگارش عربیت کے جس بار سے بوجھل تھا وہ رومان کو زیب نہ دیتا تھا۔ البتہ انھوں نے ہماری نثر میں آزاد خیالی اور عقلی شعور کا جو رجحان پیدا کیا وہ ہمیشہ یاد رہے گا۔ ۱۹۳۵ء کے

لگ بھگ حقیقت نگاری اور ترقی پسندی کی دھوپ میں رومان پسندی کی چاندنی ماند پڑ گئی مگر اس میں کیا شک ہے کہ اردو ادب میں اس نے روایت پرستی سے ہٹ کر نئی راہیں تلاش کرنے کی صلاحیتیں پیدا کیں۔ سادہ اور سلیس نثر کی اس روایت نے حقیقت نگاری کی اُس تحریک کو متاثر کیا جس کے ترجمان پریم چند، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی اور سعادت حسن منٹو وغیرہ تھے۔

جدید اردو ادب کا ناقد فکشن کے پہلے دور پر نظر ڈالتا ہے تو اسے سرشار کے بعد مرزا ہادی رسوا کا نام سب سے زیادہ متاثر کرتا ہے۔ ان دونوں کی تحریروں کے درمیان سیکڑوں ناولوں کی قطار لگی ہوئی ہے، لیکن ان میں نذیر احمد اور سجاد حسین کے علاوہ کم ہی کی تحریریں قابلِ توجہ ہیں۔ البتہ راشد الخیری اور عبدالحلیم شرر کے ناول اس لحاظ سے قابلِ توجہ ہیں کہ ان میں مسلمانوں کے ماضی اور حال کو مؤثر انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اس منزل سے گزر کر پریم چند نے فکشن کے اس بڑے دور کا آغاز کیا جس کا اثر اب تک باقی ہے۔ ان کا بڑا کارنامہ یہ تھا کہ ناول اور افسانے کو پہلی بار دیہات کی زندگی سے آشنا کیا۔ ان کے کردار عام آدمی ہیں جو عام فہم زبان بولتے ہیں۔ علاوہ ازیں حالی کی طرح انھوں نے بھی ادب میں انسانی اور اخلاقی قدروں کا شعور پیدا کیا۔ اگر حالی کو شاعری میں اصلاح کا نقیب کہا جائے تو فکشن میں پریم چند کو اصلاحی ادب کا نشان بردار مانا جائے گا۔ ہندی اور اردو دونوں میں ان کی تخلیق کی دھوم مچی ہوئی تھی۔

میں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ کس طرح اوائل عمری میں کلکتہ پہنچ کر ہندی صحافت کے ساتھ میرا ذہن جدید انگریزی ادب کی طرف مائل ہوا۔ یہی نہیں بلکہ شدّتِ احساس نے مجھے عوام کی زبوں حالی کو دل گزیں کرنے پر مجبور کیا اور یاد دلایا کہ یہ اس طبقے کے افراد ہیں جو اُس گاؤں میں بھی موجود ہیں جس کا میں مالک تھا۔ ان افراد کا اظہار میں نے تین افسانوں میں کیا جو یکے بعد دیگر ۱۹۳۲ء اور ۱۹۳۳ء میں کلکتہ کے ہندی رسالے "وشوامتر" میں شائع ہوئے۔ خودستائی نہیں امر واقعہ ہے کہ اندازِ نظر اور جدّتِ بیاں کی وجہ سے اُس زمانے میں ان کی بڑی شہرت ہوئی اور کئی ہندوستانی زبانوں میں ان کے ترجمے ہوئے۔ ان میں سے ایک کو اندھا بھکاری کے نام سے میں اردو میں منتقل کر سکا، لیکن "دو مزدور" اور

"مستقبل کی سمت" کے ترجمے کی فرصت نہ ملی۔ میرے ہندی افسانے کے مجموعے "آگ اور آنسو" میں یہ تینوں تاریخ وار شامل ہیں۔ ۱۹۳۵ء میں اسی رسالے میں میرا مضمون "ساہتیہ اور کرانتی" (ادب اور انقلاب) شائع ہوا جسے ہندی میں ترقی پسند تنقید کا سنگ بنیاد قرار دیا گیا ہے۔ یہ کہنا صحیح نہیں ہوگا کہ ترقی پسند تحریک سے پہلے فکشن میں حقیقت نگاری کی مثال نہیں تھی۔ اس کی ابتدا تو پریم چند پہلے ہی کر چکے تھے۔ ترقی پسندی نے حقیقت نگاری کو سماجی بے انصافی کے خلاف احتجاج کی طرف مائل کیا۔ تاریخی اعتبار سے یہ تحریک جولائی ۱۹۳۵ء میں اس مقالے سے شروع ہوتی ہے جو میں نے انجمن ترقی اردو (اورنگ آباد دکن) کے رسالے اردو کے لیے قلمبند کیا تھا۔ اس کا ذکر سجاد ظہیر نے اپنی کتاب روشنائی میں اس طرح کیا ہے۔

> "۱۹۳۶ء یا شاید اس سے بھی کچھ پہلے اختر حسین رائے پوری نے اپنا مشہور مضمون "ادب اور زندگی" لکھا جو انجمن ترقی اردو (ہند) کے سہ ماہی رسالہ اردو میں شائع ہوا۔ میرے خیال میں یہ ہماری زبان میں پہلا مضمون ہے جس میں مبسوط اور مدلّل طریقے سے نئے ترقی پسند ادب کی تخلیق کی ضرورت بتائی گئی اور پرانے ادب کی رجعت پسند قدروں کی تشریح کر کے اس کی سخت مذمّت کی گئی۔ اس اہم مضمون کے مصنّف کی حیثیت سے اختر حسین رائے پوری کو اردو کے ترقی پسند ادب کی تحریک کے بانیوں میں اوّلیت حاصل ہے۔"

یہ مقالہ میرے تنقیدی مضامین کے مجموعے "ادب اور انقلاب" میں شامل ہے۔ انجمن ترقی پسند مصنّفین کی داغ بیل سجاد ظہیر نے ۱۹۳۶ء میں ڈالی تھی اور مجنوں گورکھپوری کی کتاب "ادب اور زندگی" اس کے بعد اشاعت پذیر ہوئی۔

سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی وغیرہ نے بھی حقیقت نگاری کا اسلوب اختیار کیا، گو ان کی توجہ معاشرے کی جنسی زندگی کی خرابیوں تک محدود رہی۔ لہٰذا یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ اُس زمانے کے ادب میں جس رجحان نے سامراج اور استحصال کے خلاف احتجاج کی آواز اٹھائی وہ ترقی پسندی سے تعبیر کیا جائے گا۔ ان دونوں رجحانوں کو الگ الگ خانوں

میں بانٹنا مشکل ہے کیونکہ ایک ہی ادیب اپنی سمت اِدھر سے اُدھر بدل لیتا تھا، لیکن اس نے شعوری طور پر اس اصول کو تسلیم کرلیا تھا کہ ادب کو زندگی کے حقائق کا ترجمان ہونا چاہیے اور اس کے قلم کو حق و صداقت کی حمایت سے دریغ نہیں کرنا چاہیے۔

اس تحریک کا اثر اتنا گہرا اور دور رس تھا کہ اس نے بلاشبہ اس دور کے شعر و ادب کے مزاج کو بدل کر رکھ دیا۔ جنگِ آزادی کی ہنگامہ آرائی میں لازماً نعرہ زنی اور جوش و ہیجان کا اظہار بھی ہوا۔ لیکن ایسی تحریروں کی کمی نہیں جن کی حیثیت مستقل ہے بالخصوص ترقی پسندی نے اس دور کے ہر شعبۂ ادب میں نمایاں کردار ادا کیا۔ آزادی کے حصول کے بعد مختلف اسباب کی بنا پر انجمن ترقی پسند مصنّفین کمزور پڑ گئی لیکن ترقی پسندی کا رجحان ادب کے رگ و پے میں اس طرح سرایت کر گیا کہ اسے مخالفوں کو بھی قبول کرنا پڑا۔

ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی کی بحث آج بھی سنائی دیتی ہے۔ مسئلہ دراصل اظہار سے ابلاغ کے تعلق کا ہے۔ بلاشبہ ادیب کو آزادیٔ اظہار کا حق حاصل ہے لیکن وہ جس جذبے یا واقعے کو نثر یا نظم میں بیان کر رہا ہے اس کے ماحول کا شعوری یا غیر شعوری پرتو ہے۔ غالب نے جب یہ دعویٰ کیا کہ ؏

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں

تو اسے یاد نہ رہا کہ یہ مضامین دراصل ان روایتوں کے مرہونِ منّت ہیں جو اجتماعی ذہن فرد کو ودیعت کرتا ہے۔ اظہار کا پیرایہ خواہ حقیقت پرور ہو یا خواب آور، بہر صورت قاری کو متاثر کرتا ہے۔ یہی وہ تعلق ہے جو ادیب پر سماجی ذمّہ داری عائد کرتا ہے۔ معاشرے کا ہر فرد کسی نہ کسی کام میں مصروف ہوتا ہے اور اس نسبت سے عام انسانوں کی طرح حقوق و فرائض کا سزاوار ہو جاتا ہے۔ احتساب کی فضا میں قابلِ قدر ادب کی تخلیق ممکن نہیں ہے۔ اس کا ثبوت ان تمام ممالک میں ملے گا جہاں اظہار و ابلاغ کی آزادی پر پابندی لگا دی گئی ہے۔

زمانۂ حال میں حکومتوں کے احتساب سے قطع نظر تخلیقی ادب کو ایک نئی مشکل کا سامنا ہے اور وہ ہے نیم خواندگی کے ساتھ ابلاغِ عامہ کا بڑھتا ہوا سیلاب۔ یہ سچ ہے کہ بالآخر ہر

فن کی طرح ادب کا مقصد تفریحِ طبع ہے، لیکن تخلیق کی طرح تفریح کی بھی مختلف سطحیں ہوتی ہیں اور بالغ ذہن اس تخلیقی ادب سے متاثر ہوتا ہے جو زندگی کی اعلیٰ قدروں کا احساس پیدا کردے۔ فلم، ریڈیو اور ٹیلی ویژن، ڈائجسٹ وقتی تفریح کا سامان تو مہیا کردیتے ہیں لیکن ان کی یاد جلد فراموش ہوجاتی ہے۔ صنعتی سماج جس مشینی تہذیب کی تشکیل کررہا ہے اس کا تقاضا یہی ہے کہ اس میں عام آدمی کو سوچنے سمجھنے کی فرصت نہ ہو اور وہ اشیاء کی طرح انھیں خیالات کا خریدار ہو جن کا اشتہار ابلاغِ عامہ میں دیا جاتا ہے۔ اس طرح فن کار اور ابلاغ کا پرانا رشتہ ٹوٹ جاتا ہے۔ اب اس کا تعلق بازار سے ہوتا ہے گویا اس کی تخلیق بھی ایک ایسی شے ہے جو اور اشیاء کی طرح بازار کی طلب اور رسد کے اصول پر بکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری زبان میں سستی کتابوں اور رسائل کے خریدار تو بہت ہیں مگر معیاری اور کلاسیکی شعر و ادب کے خریدار برائے نام ہیں۔

ایک دوسری مشکل یہ ہے کہ سنجیدہ ادب کے پڑھنے والوں کی بڑی تعداد انگریزی داں ہے کیونکہ اردو میں ایسے ادب کے طلب گار کم ہیں لہٰذا اس کی نشر و اشاعت بھی محدود ہے۔ جب کسی انگریزی داں کو اردو زبان میں حسب دل خواہ کتابیں نہیں ملتیں تو وہ آسانی سے انگریزی میں انھیں مہیا کرلیتا ہے۔ اس طرح دیکھتے ہی دیکھتے ایک ایسی پیچیدہ صورت حال پیدا ہوگئی ہے جس کا تصور بھی پہلے نہیں کیا جاسکتا تھا۔ سنجیدہ ادبی تخلیق کے لیے بڑے انہماک اور تسلسل کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ کام ہمہ وقتی توجہ کا طالب ہے۔ مضمون نگاری، افسانہ نویسی اور غزل گوئی پر یہ شرط عاید نہیں ہوتی ہے، کیونکہ وقفے وقفے سے چند نشستوں میں ان سے عہدہ برا ہوا جاسکتا ہے لیکن کوئی بڑی کتاب اس طرح نہیں لکھی جاسکتی ہے جس طرح ہمارے ملک میں معیاری فلم نہیں بنتے اور اگر کبھی بن بھی گئے تو انھیں دیکھنے والے نہیں ملتے، اسی طرح معیاری کتابیں لکھی بھی جائیں تو انھیں چھاپنے اور پڑھنے والے مفقود ہیں۔ جو لوگ پاکستانی تہذیب کے ماضی کا تجزیہ کرتے ہیں انھیں اس کے حالِ زار پر غور کرنا چاہیے۔ یہ مسئلہ محض ادب کا نہیں بلکہ معاشرے کی تہذیبی اور اخلاقی قدروں کا ہے۔

برِصغیر کے مسلمان میں ہمیشہ اپنے تشخص کا گہرا احساس رہا۔ اس کا تنقیدی جائزہ اس

صدی میں لیا گیا جب اسے تاریخ کے اس دوراہے سے گذرنا پڑا جو پاکستان کہلاتا ہے۔ اس جدوجہد میں ہزار سالہ تہذیبی ورثے کی وہ شناخت کارفرما تھی جس کا آغاز سندھ میں عربوں کی آمد سے ہوا تھا۔ اس وراثت کے ایک اہم حصّے کی نوعیت ادبی ہے۔ یہاں فقط اسی کا ذکر مقصود ہے۔ لسانی اعتبار سے اسے فارسی، اردو اور دیگر علاقائی زبانوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

یہ تو سب کو معلوم ہے کہ سندھی نے شاہ عبدالطیف بھٹائی، پنجابی نے وارث شاہ اور پشتو نے خوشحال خاں خٹک جیسے عظیم شاعر پیدا کیے لیکن ہندی میں مسلمان شاعروں کے کارناموں سے اردو داں زیادہ واقف نہیں ہیں۔ ان میں کبیر، ملک محمد جائسی اور عبدالرحیم خان خاناں کا شمار ہندی کے بڑے شاعروں میں ہوتا ہے۔ کبیر ہندی کا سب سے بڑا صوفی سخن ور گزرا ہے۔ اور جائسی کی پدماوت کو لسانی و فنّی اعتبار سے تلسی داس کی رامائن کا پیش رو قرار دیا جائے گا۔ خان خاناں کے سات سو دوہوں کے مجموعے "رحیم ست سئی" میں فکر و حکمت کے موتی بکھرے پڑے ہیں۔ بنگالی نے ٹیگور کے بعد قاضی نذرالاسلام جیسا عظیم شاعر پیدا نہیں کیا ہے۔ میں زیادہ نام گنانا نہیں چاہتا ورنہ یہ حقیقت ہے کہ نثر نہیں تو نظم میں ان زبانوں میں مسلمانوں کا عطیہ بیش بہا ہے۔

غزنوی عہد کے شاعر سعد بن سلمان سے لے کر اقبال تک اس سرزمین نے فارسی شاعری کا جو ذخیرہ جمع کیا اس کی قدر و قیمت پر ہم ناز کر سکتے ہیں۔ جب ایران میں صفوی حکومت کے قیام کے ساتھ بلند شاعری کی صلاحیت سلب ہو گئی تو دہلی میں مغل دربار نے اس نئے دبستان کی سرپرستی کی جسے "سبکِ ہندی" کہا جاتا ہے۔ اس کے بانیوں میں نظیری اور صائب کے نام سرفہرست ہیں جنھوں نے ہندوستان کے ماحول سے متاثر ہو کر اس نئی طرز کی ایجاد کی۔ یہ کیسی عجیب بات ہے کہ فیضی کی مثنوی "نل دمن" سے پہلے یہاں کسی فارسی گو شاعر نے اپنے ماحول کا کوئی اثر قبول نہیں کیا۔ اکبر نے جب ہندوؤں، مسلمانوں میں تہذیبی رواداری کی ہمّت افزائی کی تو اس تحریک کا اثر فارسی شاعری پر بھی پڑا۔ "سبک ہندی" کے موجدوں نے اسے "تازہ گوئی" سے تعبیر کیا۔ سبکِ عراقی کے مقابلے پر اس میں نازک خیالی

اور جدّت طرازی پر زیادہ توجہ دی گئی۔ ابھی تک سبک ہندی کا کوئی خاطر خواہ تجزیہ نہیں ملتا۔ تاہم قیاس یہ کہتا ہے کہ اس زمانے میں مروّج ہندی دوہوں نے کسی نہ کسی حد تک اس رجحان کو متاثر کیا۔ ایک تو دوہے کی ترکیب غزل کے مطلع کے شعر کی طرح ہم وزن اور ہم قافیہ ہوتی ہے۔ اس کے پہلے مصرعے میں کوئی دعویٰ کیا جاتا ہے اور دوسرے میں کسی مثال سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ دوہے ناصحانہ بھی ہیں اور عاشقانہ بھی۔ میرا خیال ہے اگر کوئی سنسکرت اور ہندی کے ناصحانہ دوہوں کے پس منظر میں صائب کا مطالعہ کرے تو سبک ہندی کی ڈور ہاتھ لگ جائے گی۔ شبلی نعمانی نے شعر العجم کو دورِ شاہجہانی کے شاعروں پر یہ کہہ کر ختم کر دیا کہ فارسی شاعری کا بڑا دور اختتام کو پہنچا۔ درآنحالیکہ کوئی انصاف پسند مرزا بیدل کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ اسی طرح فارسی شاعری کی تاریخ کا آخری باب غالب اور اقبال کے ذکر کے بغیر نامکمّل رہ جائے گا۔ لسّانی ناواقفیت کی بنا پر کسی نے ہنوز سبک ہندی سے سنسکرت نیز ہندی شاعری کا تقابلی مطالعہ نہیں کیا ورنہ یہ بذاتِ خود ایک دلچسپ موضوع ہے۔

ہمارے ادبی ورثے کا بڑا حصّہ اردو زبان پر مشتمل ہے۔ اُسے پروان چڑھانے میں مسلمانوں کے ساتھ ہندوؤں کا بھی ہاتھ ہے۔ یہ سیاست کی ستم ظریفی ہے کہ بیسویں صدی میں جب نظم و نثر دونوں میں مسلمانوں کے دوش بدوش ہندو اس کی ترقی میں کوشاں رہے اسے فرقہ وارانہ تعصّب سے نقصان پہنچا۔ حصولِ آزادی کے بعد صورتِ حال یہ ہے کہ پاکستان یا ہندوستان کی اردو مطبوعات کی آمد و رفت بند سی ہو گئی ہے۔ اس سے اردو کتابوں کی نشر و اشاعت محدود ہو گئی۔ میں نے حکومتِ پاکستان اور یونسکو کی ملازمت کے دوران ان پابندیوں کو ہٹانے کی بڑی کوشش کی لیکن سیاسی رکاوٹوں کی وجہ سے بات آگے نہ بڑھی۔

ایجاد اور تخلیق میں وہی گہرا رابطہ کارفرما ہے جو تنقید اور اجتہاد کے رجحانوں میں ہوتا ہے۔ جب کسی معاشرے پر روایتوں کی تہیں جم جاتی ہیں تو انھیں تنقید کی چھری سے ہی صاف کیا جا سکتا ہے اور اس کے لیے اجتہاد کا جذبہ ضروری ہے۔ جس ذہن میں اُپج اور

امنگ ہوتی ہے وہ کبھی فنی تخلیق کی طرف اور کبھی فطرت کے حقائق کی دریافت کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ بڑے ادب اور آرٹ کی پہچان یہی ہے کہ اس میں تنقید اور اجتہاد کی شان مضمر ہو۔

تہذیبوں کی ترقی اور زوال کا براہ راست تعلق فکری زندگی کے نشیب و فراز سے ہے۔ جب کوئی قوم اندھی تقلید کو ضابطۂ حیات بنا لیتی ہے تو وہ آگے کے بجائے پیچھے چلنے لگتی ہے اور تاریخ کی شاہراہ سے بھٹک جاتی ہے۔ اس قانون کا اطلاق فن و ادب پر بھی ہوتا ہے۔ اس صدی کے اوائل تک ہماری شاعری میں روایت پرستی جس طرح غالب رہی اور فلاں کے رنگ یا فلاں کی زمین پر شعر کہنے کا جو چلن رہا اس نے بہتوں کی انفرادیت کو مجروح کیا۔ لفظ معنی سے الگ ہی نہیں ہوا بلکہ بسا اوقات بے معنی ہو کر رہ گیا۔ جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ سلطنت مغلیہ کے زوال کے بعد فارسی ہو یا اردو، نظم ہو یا نثر ہو۔ بیشتر و اکثر رٹی رٹائی اور پٹی پٹائی باتیں ہیں جن کی لامتناہی تکرار سے جی اوبھ جاتا ہے۔ بے شمار مذہبی رسائل ملیں گے جن میں کسی شرح پر شرح لکھی گئی ہے اور علم کے دروازوں پر امام غزالی نے جو قفل جڑا تھا وہ گویا کھلا ہی نہیں۔

گزشتہ صدی میں مغربی ادب میں حقیقت نگاری کی جو تحریک شروع ہوئی اس نے اس صدی کے شروع میں وابستگی کی شکل اختیار کر لی۔ پہلے ادیب سماج کے نیک و بد کے جائزے پر اکتفا کرتا تھا۔ اب وہ اس مہم سے وابستہ ہونے لگا جو ظلم اور بے انصافی کی قوتوں سے نبرد آزما ہو رہی ہے۔ اس رجحان کا پہلا نشان بردار "ایمل زولا" تھا، لیکن صحیح معنوں میں اسے فنی عظمت میکسیم گورکی نے بخشی۔ اس کی آپ بیتی کو شاہکار کا درجہ حاصل ہے اور اس کی تینوں جلدوں کو اردو میں منتقل کرنے میں میرا خاصا وقت صرف ہوا۔ دوسری جنگ عظیم تک ادبِ عالم میں اس تحریک کا بڑا چرچا رہا اور ہماری زبان میں ترقی پسندی اسی کا ایک رُخ تھی۔ بے نواؤں اور بے کسوں کی فریاد کو فن کا موضوع بنانا اور حق و انصاف کی آواز کو ادب میں سمونا یہی وہ نصب العین ہے جو قلم کو انسانیت کا ترجمان بنا دیتا ہے۔

جنگِ عظیم کے بعد جب مغرب میں اصولوں اور قدروں کا جنازہ اٹھنے لگا تو ادیب

معاشرے سے غیر وابستگی محسوس کرنے لگے۔ اس طرح اجنبیت کے اس رجحان نے زور پکڑا جس کا ذکر اب ہم اپنی زبان میں بھی سُن رہے ہیں۔ جنگ ختم ہوتے ہی انگریزی میں پہلے کولن ولسن نے OUT SIDERS اور فرانسیسی میں کامیو (CAMUS) نے STRANGERS میں اجنبیت کی کیفیت کا ایسا مؤثر اظہار کیا کہ یہ تحریک عام ہو گئی۔ تنہائی اور اجنبیت میں فرق ہے۔ ہر زمانے میں حسّاس آدمی کبھی نہ کبھی باہر کیا اپنے گھر کے اندر ذہنی اور روحانی تنہائی محسوس کرتا ہے۔ شیکسپیئر نے ہیملٹ کے کردار میں تنہائی کی المناک تصویر پیش کی ہے۔ اردو شاعری میں میر کی دردمندی میں کسی زخمی کراہ کے ساتھ وہ آہ بھی شامل ہے جو تنہائی کے عالم میں سینے سے نکل جاتی ہے۔ تاہم تنہائی کو اجنبیت سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ایک ایسی کیفیت ہے جو فرد کو معاشرے سے بے تعلق کر دیتی ہے۔ اردو میں اس رجحان کے چلن کی وجہ وہ ذہنی انتشار ہے جو ۱۹۴۷ء اور ۱۹۷۱ء کے واقعات کے بعد رونما ہوئے۔

ان رجحانات کے فنّی امکانات جب ختم ہونے کو آئے تو مغرب ایک بار پھر داستان گوئی کی اس روایت کی طرف پلٹا جہاں سے فکشن کا آغاز ہوا تھا۔ جاسوسی اور سائنس کے ہزاروں ناول ہر سال چھپتے ہیں اور اب تو نامور ادیب پرانی تاریخ کے ملبے سے ضخیم رومانوں کا سامان مہیا کر لیتے ہیں۔ جس طرح جسم و شکل میں مصوّری کے لیے کوئی کشش باقی نہیں رہی اور نئے موضوع کے لیے اس کی توجہ وحشیوں اور بچّوں کے آرٹ کی طرف مبذول ہوئی اسی طرح انسانی زندگی کی یک رنگی سے فکشن کا جی اوبھنے لگا اور وہ خوابوں کی اس کھوئی ہوئی دنیا کو تلاش کرنے لگا جو دورِ جدید سے پہلے تک باقی تھی۔ اس لیے عمرانیات کے ماہروں نے کہا ہے کہ مذہب کی طرح آرٹ کی ابتدا بھی جادو سے ہوئی تھی۔ یہ عالم شعور سے فرار کی وہ کیفیت ہے جو طفلی ہی نہیں بلکہ درماندگی کی حالت میں بھی انسان پر طاری ہو جاتی ہے۔

حُسن کی تلاش

(۱۸)

یہ سچ ہے کہ حُسن و عشق کی باہمی کشش اور کش مکش سے بزمِ حیات کی رونق ہے لیکن دراصل قدرت نے یہ بہانہ بقائے نسل کے لیے تراشا ہے۔ جب آدم و حوا نے نسل آفرینی کا عمل شروع کیا تو انھیں وہم و گمان بھی نہ ہوگا کہ آج کے دن اس کرۂ ارض پر ان کی اولاد کی تعداد چار پانچ ارب تک پہنچ جائے گی اور انسانیت کے لیے سب سے بڑا مسئلہ افزائشِ نسل کی تحدید کا ہوگا۔

غالب نے عشق کو "خللِ دماغ" قرار دیا ہے ؎

کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا

لیکن حافظ نے اسے حاصلِ حیات بتایا ہے ؎

خلل پذیر بود ہر بنا کہ می بینی
بجز بنائے محبت کہ خالی از خلل است

حُسن کا کوئی ایسا معیار نہیں جو سب کے لیے یکساں قابلِ قبول ہو۔ کچھ لوگوں نے حُسن کو محض فریبِ نظر قرار دیا ہے۔ مشہور فرانسیسی مفکر والٹیر اس نتیجے پر پہنچا کہ "حُسن کی کوئی

تعریف ممکن نہیں"۔ حبشیوں کو موٹے ہونٹ پسند ہیں تو گورے پتلے ہونٹوں پر فدا ہیں۔ ایرانی چشمِ نرگس کے بیمار ہیں تو ترک بادامی آنکھوں پر نثار ہیں۔ جرمن سنہرے بالوں پر فریفتہ ہیں تو اہلِ ہند کالے بالوں کے دلدادہ ہیں۔ غرض یہ کہ حُسن فریبِ نظر کی کرشمہ سازی کے سوا کچھ نہیں۔ قدیم یونانیوں کی نظر میں حُسن عورت نہیں بلکہ مرد کا زیور تھا۔ چنانچہ اُس زمانے میں تراشے ہوئے مجسّموں میں فن کا جوہر عورت نہیں بلکہ مرد کی شکل میں نمایاں ہوتا تھا۔ ہندو نظریۂ جمالیات میں اس معمّے کو حل کرنے کے لیے ایک ایسے دیوتا کی تخلیق کی گئی جو آدھا مرد اور آدھا عورت ہوتا تھا اور جسے ہندو دیومالا میں "اردھ ناری ایشور" کا نام دیا گیا ہے۔

اس بیان سے یہ نتیجہ اخذ نہ کیا جائے کہ انسانی حُسن پر میری نظر نہیں پڑی۔ البتہ حُسنِ بے پروا کو میں نے ہمیشہ حسنِ خود آرا سے زیادہ دل آویز پایا۔ بہت سی جلوہ گاہوں میں جانے کا اتفاق ہوا اور ان کی یادوں کے چراغ ابھی دماغ میں روشن ہیں، لیکن ان میں حُسن کی وہ تابانی نظر نہ آئی جو کوہ و صحرا کی ویرانیوں میں نظر کو خیرہ کر گئی ہے۔

دوسری جنگ عظیم سے پہلے کی بات ہے کہ مجھے شملہ سے کوئی سو میل دور کوٹ گڑھ نامی مقام پر چند ہفتے گزارنے کا موقع ملا۔ میرے میزبان کا مکان ایک اونچی پہاڑی پر بنا ہوا تھا جہاں سے ہمالیہ کی برف پوش چوٹیوں کا روح پرور نظارہ ہوتا تھا۔ فضا میں درختوں کی سرگوشیوں، پرندوں کی نغمہ سنجی اور آبشار کے ترنّم کے سوا کچھ سنائی نہ دیتا تھا۔ ایسا سکون مدّتوں کے بعد میسّر ہوا تھا اور میں خوش تھا کہ مکروہاتِ زندگی سے نجات حاصل ہوئی۔ یہاں سے کچھ فاصلے پر پادری اسٹوکس کی قلعہ بند قیام گاہ تھی۔ دراصل یہ امریکن عیسائی مبلّغ تھا جو کسی زمانے میں اس علاقے کے پہاڑی باشندوں کو عیسائی بنانے کے لیے آیا، لیکن خود کسی آریا سماجی ہندو لڑکی پرسو جان سے فدا ہو گیا۔ وہ اس شرط پر شادی کے لیے تیار ہوئی کہ پادری مذہب بدل کر خود آریا سماجی بن جائے۔ پس عشق کا جادو ایسا جاگا کہ بقول میرؔ ع

قشقہ کھینچا، دیر میں بیٹھا، کب کا ترک اسلام کیا

ایک دن اس نے مجھے چائے پر بلایا تو میں سہ پہر کو پُر پیچ کوہستانی راستے پر ٹہلتا ہوا اس جانب چل پڑا۔ سرِ راہ کیا دیکھتا ہوں کہ پہاڑیوں نے ایک میلہ لگا رکھا ہے۔ خرید و فروخت

کا بازار گرم ہے اور مداریوں کے کرتب نے ہنسی دل لگی کی فضا بنا رکھی ہے۔ اتنے میں سامنے کی چٹان پر یک بہ یک تین دوشیزائیں دھانی لباس پہنے اور پھولوں کے گہنوں سے آراستہ اس طرح نمودار ہوئیں کہ ذرا دیر کے لیے گمان ہوا کہ وہ پریاں ہیں جن کا ذکر دیو مالا میں آیا ہے۔ دراصل یہ پادری اسٹوکس کی لڑکیاں تھیں جن کی جامہ زیبی، عشوہ طرازی اور دلبری کبھی نہیں بھولی۔

ایسا ہی ایک سماں ایک بار شیراز میں دیکھنے میں آیا۔ یہ اس زمانے (۱۹۶۷-۷۰ء) کا ذکر ہے جب میں ایران میں یونسکو کے سربراہ کی خدمت انجام دے رہا تھا۔ ہمارا ادارہ تعلیم، ثقافت اور سائنس کے شعبوں میں ملک کے مختلف حصّوں میں سرگرم عمل اور تقریباً تیس ۳۰ غیر ملکی ماہروں پر مشتمل تھا جن میں امریکن، جرمن، فرانسیسی حتیٰ کہ روسی بھی شامل تھے اور اس عجیب الخلقت گروہ میں اور حکومت کے مختلف محکموں میں تعاون برقرار رکھنے کی ذمہ داری مجھ پر عائد ہوئی تھی۔ ہمارا تعلق شیراز کی ایک درسگاہ سے بھی تھا جہاں قبائلی علاقے کے لیے اُستانیوں کی تربیت ہوتی تھی۔ یہ علاقہ "قاش غئی" ترکوں کا تھا جو شیراز کے نواحی دشت زار میں مدّتوں سے آباد تھے۔ ایک بار مجھے جب دورے پر شیراز جانے کا موقع ملا تو وہاں کے ناظمِ تعلیم آقائے بہمن بیگی نے اس درس گاہ کے معائنے کی دعوت دی۔ ان کے ساتھ کالج کے ہال میں داخل ہوا ہی تھا کہ ٹھٹک کر بلکہ سہم کر دروازے پر رُک گیا، کیونکہ میں نے حُسن کی ایسی فراوانی کسی ایک جگہ نہیں دیکھی تھی۔ فارسی شاعری میں "ترکِ شیراز" کا ذکر اکثر پڑھا تھا اور اس کا اصل مفہوم اب سمجھ میں آیا۔ خواجہ حافظ کے ذوق کی داد کیوں نہ دی جائے کہ ایسی ہی کسی حسینہ کے خدوخال کے عوض ثمرقند و بخارا بخش دیا ؎

اگر آں ترکِ شیرازی بدست آرد دلِ ما را
بہ خالِ ہندوش بخشم ثمرقند و بخارا را

مورّخوں کا بیان ہے کہ حافظ کے اس شعر کو پڑھ کر امیر تیمور کبیدہ خاطر ہوا اور جب اس نے شیراز کو فتح کیا تو نحیف و پیر سال حافظ کو طلب کر کے سرزنش کی کہ جن شہروں کی تعمیر میں میں نے زندگی صرف کر دی انھیں ——— اس بے باکی سے کسی کو بخش دینے کی

ہمّت تجھے کیسے ہوئی؟ حافظ نے برجستہ جواب دیا کہ حضورِ والا اگر میں دل کا ایسا سخی نہ ہوتا تو آج کیوں ایسا خستہ حال ہوتا؟

یوں تو حُسن کے بہت سے روپ ہوتے ہیں لیکن مجھے سب سے زیادہ متاثر فطرت کے حُسن نے کیا ہے۔ بالخصوص برف پوش پہاڑوں کے منظر نے، سمندر کی ازلی بے قراری اور اس کی آغوش سے اُبھرے ہوئے طوفانوں کے جلال اور اس کی تہ میں پوشیدہ رازوں کی کیفیت جدا ہے۔ مغربی شاعری، موسیقی اور آرٹ نے ان کی ترجمانی اپنے بڑے بڑے شاہکاروں میں کی ہے۔ اسی طرح پہاڑوں کی سربلندی پر بھی اُن کا تخلیقی جوہر صرف ہوا ہے، بلکہ یہ کہنا بجا ہوگا کہ چند روزہ انسانی حُسن سے ہٹ کر انھوں نے حُسن کے ان سرچشموں کو تلاش کیا جو غیر فانی ہیں۔ اس حُسن کی چھب ہندو، چینی اور جاپانی فن میں بھی ملے گی، البتہ اس کی کمی مُسلم آرٹ میں محسوس ہوتی ہے۔

دنیا کے کئی بڑے ہوٹلوں میں مجھے ٹھہرنے کا اتفاق ہوا۔ لیکن جاپان کے "فوجیا" ہوٹل کا ماحول پھر نہ ملا جو برف پوش کوہ آتش فشاں "فوجی یاما" کے مقابل جھرنوں اور درختوں کے جھرمٹ میں بنا ہوا تھا۔ معلوم نہیں کتنی دیر میں اس پہاڑ کی پُراسرار بلندیوں کو دیکھتا رہا جن کے سائے میں جاپان کی لوک کہانیوں کی تخلیق ہوئی تھی۔ "پامیر" کی وہ سربلند چوٹی "ترچ میر" کس طرح فراموش ہو سکتی ہے جو چاہنے والوں کو پچیس ۲۵ ہزار فٹ اوپر بلا رہی تھی جہاں شاید آسمان پری کا مسکن تھا۔ میں نے اس کا نظارہ قیامِ پاکستان سے پہلے چترال میں کیا تھا جہاں نواب ناصر الملک کی مہمانی نے کافرستان کی سیر کا موقع فراہم کیا، جبکہ اس کا نام بھی بہت کم لوگوں نے سنا ہوگا۔ میرا ایک افسانہ "کافرستان کی شہزادی" (۱۹۴۲ء) اسی پس منظر میں لکھا گیا تھا۔

اگر آسمان صاف ہو تو صبح سویرے "دارجلنگ" کے پاس ٹائیگر ہل سے ہمالیہ کی سربفلک چوٹی کن چنجنگا کا وہ منظر لاجواب ہے جب چڑھتے ہوئے سورج کی کرنیں قوسِ قزح کی سی کیفیت پیدا کرتی ہیں اور رنگ اس تیزی سے بدلتے ہیں کہ انسانی تخیّل دم بخود رہ جاتا ہے۔ ان پہاڑوں کے مقابلے میں ایران کا "کوہ دماوند" اور سوئٹزرلینڈ کے کوہ

"ینگ فرو" میری آنکھوں کو نہیں جچے کیونکہ ان میں قدوقامت کی وہ شان نہیں۔

میں اس خوبصورت منظر کو کیسے بھلا سکتا ہوں جو کبھی کبھی آسمان پر جلوہ افروز ہوتا ہے۔ اس کے لیے اردو میں عربی کا ثقیل لفظ "قوس قزح" استعمال ہوتا ہے لیکن اس پر فارسی کی ترکیب "رنگین کمان" ہی بھلی لگتی ہے۔ اس کا نظارہ تو سب ہی نے کیا ہوگا مگر مجھے وہ سماں یاد ہے جب کشمیر میں نواب جعفر علی خاں اثر کے ساتھ موٹر پر سفر کر رہا تھا۔ وہ ہوم منسٹر کے عہدے پر فائز تھے اور میں امرتسر سے گرمیوں کی تعطیل گزارنے کے لیے "بارہ مولا" گیا ہوا تھا۔ اثر صاحب مجھ سے ملنے آئے اور سری نگر چلنے پر آمادہ کیا۔ راستے میں آسمان پر نظر پڑی تو ہم دم بخود رہ گئے اور موٹر روک کر اس رنگا رنگ آبشار کو دیکھنے لگے جو وادی کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک سورج کی کرنوں نے بکھیر دیا تھا۔

ایسا ہی ایک دل فریب نظارہ افریقہ کے دورانِ قیام میں تنزانیہ کی دشت نوردی میں دیکھا۔ طرفہ تماشا یہ ہوا کہ کئی رنگین کمانیں ایک دوسرے میں جڑی ہوئی حدِّ نظر تک پھیلی ہوئی تھیں۔

میرے حافظے میں حُسن کی کوئی مکمّل تصویر اب باقی نہیں رہی لیکن آواز کا وہ حُسن ہنوز کانوں میں گونج رہا ہے جو شیراز کے بلبلِ ہزار داستان کے زمزمے نے فضا میں بکھیر دیا تھا اور یہ محسوس ہو رہا تھا گویا وہ حافظ کی کوئی غزل سُنا رہا ہے۔ یا وہ آواز جو شملہ کی فضا میں رات کے وقت کسی نامعلوم پرندے کی شعلہ بیانی سے پیدا ہوتی تھی۔ کسی باکمال مُغنّی کی صدا میں بھی وہ موہنی نہیں ہوتی جو کوئل یا پپیہے کی ہوک میں ہوتی ہے، البتہ اس کی تاثیر کو سمجھنے کے لیے کن رس کی ویسی ہی ضرورت ہے جیسے کہ اچھے شعر سمجھنے کے لیے سخن فہمی کی۔

لفظ کی نغمگی کا آواز کی موسیقیت سے گہرا تعلق ہے اور اس ادراک کے بغیر شعر میں وہ ترنّم پیدا نہیں ہو سکتا جو شاعری کی اصل روح ہے۔ اسی طرح جب تک گائک آواز کی نزاکتوں پر حاوی نہ ہو تو سُر اور تال کے علم کے باوجود اس کا فن ادھورا رہ جاتا ہے۔

کیسی کیسی مطربادوں کی خوش نوائیاں فضا میں اوجھل ہو گئیں لیکن ایک آواز کبھی کبھی کانوں میں گونج جاتی ہے۔ مدّت ہوئی پیرس میں سرِ شام میں دفتر سے چلتا ہوا اپنے مکان کے

صدر پھاٹک میں داخل ہوا۔ اس بڑی سی عمارت میں کئی فلیٹ تھے اور مجھے صحن سے گزر کر سامنے کی سیڑھیوں سے اپنی رہائش گاہ تک پہنچنا تھا۔ صحن میں قدم رکھتے ہی میں نے دیکھا کہ ہر فلیٹ کی کھڑکی کھلی ہے اور لوگ سحر زدہ کسی نغمے کی تان کو سُن رہے ہیں۔ میں ایک لمحے کے لیے ٹھٹک گیا۔ گویا یہ لحنِ داؤدی یا کسی مرغِ فردوس کی تان ہو۔ جب مجھے محسوس ہوا کہ آواز میرے فلیٹ سے ہی آ رہی ہے تو حیرانی کے عالم میں تیز تیز اپنے دروازے تک پہنچا۔ اسے کھول کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ پیرزن مادام برٹریر باورچی خانے میں بیٹھی تن بدن سے بے خبر کسی اوپیرا کا گیت گا رہی ہے۔ یہ بلغاریہ کی رہنے والی تھی اور کسی مشہور زمانہ مغنیہ کی خدمت میں مدّتوں رہ چکی تھی۔ نہ اُس کا کوئی پرسانِ حال تھا نہ گھر بار۔ پیرس میں اُس کے قدردانوں کا ایک حلقہ تھا اور بس۔ جب جی چاہتا بے بلائے کسی کی مہمان بن جاتی اور پھر اُٹھ کر کہیں چلی جاتی۔ اس طرح دوسرے تیسرے مہینے وہ ہماری طرف آنکلتی۔ بچّوں کو کبھی قصّے کہانی اور کبھی گٹار سُناتی لیکن آج اندازہ ہوا کہ عمر کے باوجود اس کی آواز میں ایسا رس ہے جس کی لَے دل کی گہرائی سے فضا کی بلندی تک پہنچ گئی ہے۔

یہ آواز ایسی روشن تھی گویا چاندی کی گھنٹیاں بج رہی ہوں پھر ایسی آواز کبھی سننے میں نہیں آئی۔

رنگ کے حُسن کا بیان الفاظ میں نہیں بلکہ تصویروں میں کیا جاتا ہے۔ دنیا کے بڑے مصوّروں نے ان رنگوں کے مشاہدوں میں بڑا وقت صرف کیا ہے جو قدرت نے سبزہ و گل کی دنیا میں بکھیر دئے ہیں۔ ہماری زبان میں گنے چنے رنگوں کے نام ملیں گے مگر یورپین زبانوں میں ان کی تعداد سیکڑوں میں ہے۔ اس کے باوجود رنگوں کے اقسام اتنے وافر ہیں کہ مصوّر کو تجربے اور ایجاد کی نئی نئی سمتیں ملتی رہتی ہیں۔ جس طرح آواز سے موسیقار حُسن پیدا کرتا ہے اور الفاظ سے شاعر، اسی طرح رنگ اور لکیر کے تال میل سے مصوّر حُسن پیدا کرتا ہے۔

مونا لیزا کے زیرِ لب تبسّم میں جو حُسن پنہاں ہے اس کے راز کو آج تک کوئی نہ پا سکا۔ اور ہیملٹ کی ناکام محبوبہ اوفیلیا کی آنکھوں میں خودکشی کا قصد کرتے وقت یاس و حرمان

کا جو درد مصوّر "مولے" کے شاہکار میں نظر آتا ہے اسے الفاظ میں کوئی بیان نہ کر سکا۔

رقص کے حُسن کا ذکر کرتے ہوئے ٹیگور نے لکھا ہے کہ یہ گویا ارض و سما کی اس مسلسل گردش کی نقل ہے جو خالق نے کائنات کی قسمت میں لکھ دیا ہے۔ مہر و ماہ، سیّارے اور ستارے ازل سے رقصاں ہیں اور یہی حال سمندر کے مدّ و جزر کا ہے۔ چشم و ابرو کے اشاروں سے اور موسیقی کی تال پر دست و پا کی خاموش جنبش سے جہانِ معنیٰ پیدا کرنا فن کے حُسنِ تخلیق کا کمال ہے۔

خیال آرائی میں قدیم یونانی اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ ان کی رائے میں موسیقی کی ابتدا اُس صدائے بازگشت سے ہوتی ہے جو سیّاروں کی مسلسل گردش سے پیدا ہوتی ہے۔ ٹیگور نے عالمِ رقص کا ذکر کرتے ہوئے ارض و سما کی گردش کے ساتھ انسان کے رگ و پے میں خون کی گردش کا رشتہ ملایا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ شجر و ثمر، انسان و حیوان، مہر و ماہ، سبھی حال و قال کی کیفیت میں ہیں۔ سائنس کی ایک نئی تحقیق جسے BIO - RYTHM کہتے ہیں، اسی شاعرانہ مفروضے کی تصدیق کرتی ہے۔

تجسیمی حُسن سے سب خود بخود متاثر ہوتے ہیں کیونکہ اسی طرح قدرت بقائے نسل کی ضمانت دیتی ہے، لیکن تجریدی حُسن سے لطف اندوز ہونے کے لیے روحانی اور ذہنی تہذیب درکار ہے بقول غالب ؎

ہر بوالہوس نے حُسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی

جس طرح عشقِ حقیقی اور عشقِ مجازی میں تفریق کی جاتی ہے اسی طرح حُسن کے مجازی اور حقیقی پہلوؤں میں امتیاز کیا جا سکتا ہے۔ بڑے فن کاروں نے اپنے اپنے طریقے سے حُسنِ سیرت کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ دیدۂ بینا ہو تو عام آدمی بھی اس گوہرِ نایاب کو بہ آسانی پرکھ سکتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ ظاہری حُسن دل کو موہ لیتا ہے لیکن حُسنِ سیرت کے آگے دل احترام سے جھک جاتا ہے۔ مجھے کسی حسینہ کی شکل یاد نہیں رہی مگر اُس فلسطینی لڑکی کی یاد تو میں ذہن سے محو نہ کر سکا جسے میں نے "غزہ" کے اسرائیلی قید خانے میں کتاب کا مطالعہ

کرتے دیکھا تھا۔ ظلم اور بے انصافی کی قوتوں سے نبرد آزما کردار میں جو حُسنِ سیرت ہوتا ہے اس کے مرتبے کو اہلِ نظر ہی پہچانتے ہیں۔ یہی وہ نکتہ ہے جہاں جمالیات کے فرسودہ نظریے لاجواب ہو جاتے ہیں اور حُسن کی تلاش بقول حالی خوب سے خوب تر کی جستجو میں مکاں سے لامکاں کی طرف پرواز کرنے لگتی ہے۔

جب میں اپنی زندگی کے سود و زیاں کا حساب کرتا ہوں تو اس میں مجھے نام و نمود، جاہ و منصب کا شائبہ بھی نہیں ملتا البتہ دنیا کے بڑے مفکّروں، ادیبوں اور شاعروں کے مطالعے سے جو فیض اٹھایا وہ حاصلِ حیات ہے۔ اسی طرح اُن آوازوں کی یاد جو مغنیوں کی گلوکاری یا پردۂ ساز سے یا کسی پرندے کی کوک یا کسی پہاڑی جھرنے کی گنگناہٹ میں سُنی اب تک کانوں میں گونج رہی ہے۔

حقیقت کی تلاش

۱۹

زمانۂ طالب علمی میں پیرس میں میری ملاقات ناروے کے ایک باشندے سے ہوئی۔ اُس نے بتایا کہ دانش گاہ میں سالہا سال محنت کے بعد جب وہ فلسفے کی سند حاصل کر چکا تو اُسے محسوس ہوا کہ زندگی کی حقیقت سے وہ اب بھی اتنا ہی نابلد ہے جتنا کہ کم علمی کے وقت تھا۔ اسے خیال آیا کہ حقیقت کا راز کتابوں میں نہیں تو زندگی کے میدانِ کارزار میں مل جائے گا۔ چنانچہ اُس نے جہازی کا پیشہ اختیار کیا۔ آٹھ دس سال تک دنیا کے گوشے گوشے کا سفر کیا اور ہر کس و ناکس سے پوچھتا پھرا کہ اس کے ذہن میں حقیقت کا تصوّر کیا ہے؟ ان سارے جوابوں کا طومار جب کئی جلدوں میں جمع ہو گیا تو وہ وطن لوٹا تاکہ ان کا تجزیہ کر کے خود ایک کتاب مرتّب کرے۔ یہ کائنات کس نے اور کیوں بنائی اور اس میں ہمارے کرۂ ارض کا کیا مقام ہے؟ زندگی کی ابتدا کیوں ہوئی اور اس کا منتہا کیا ہے؟ حیوان اور انسان میں کون سی صفات مشترک ہیں، اور کس نقطے پر ان میں تفریق پیدا ہوتی ہے؟ مکاں کی طرح زماں بھی لامحدود ہے۔ کیا مستقبل پہلے سے وجود میں آچکا ہے اور ہمیں صرف کم فہمی کی وجہ سے اس کا شعور نہیں ہو سکا۔ یہ اور اس قسم کے بہت سے سوالات ہر دور میں پوچھے

گئے اور آج بھی جواب طلب ہیں۔ ازل و ابد کے متعلق تو اختلاف رائے ہو سکتا ہے لیکن اس حقیقت سے انکار کا چارہ نہیں جس سے ہر فرد کو اپنی پیدائش اور موت کے درمیان زندگی میں دوچار ہونا پڑتا ہے۔

اگر پیدا ہونے سے پہلے جانداروں کو معلوم ہو جائے کہ زندگی میں انھیں کن مراحل و مسائل سے گزرنا ہوگا تو غالباً وہ وجود پر عدم کو ترجیح دیں گے، لیکن ایک اتفاقی فعل کی پاداش میں وہ اس جہانِ امکان میں نمودار ہو جاتے ہیں جس کے سیاہ و سفید پر انھیں اختیار نہیں ہوتا۔ نشیب و فراز سے گزر کر لامحالہ جب وہ موت کی مہیب منزل تک پہنچتے ہیں تو آخرت پر ایمان کتنا بھی راسخ ہو قدم آگے نہیں پیچھے لوٹنا چاہتے ہیں، مگر قدرت کا وہ اٹل قانون جو اثبات و نفی اور بقا و فنا کی جدل پر قائم ہے اسے پسپائی کے لیے اجازت نہیں دیتا۔

میں میٹرک کا طالب علم تھا اور میری عمر سولہ سال ہونے کو آئی تھی جب اس قسم کے سوالات میرے ذہن کو پریشان کرنے لگے۔ اپنے شکوک کا اظہار میں نے سائنس کے استاد سے کیا تو اس نے کہا میں فلسفی تو نہیں لیکن تمھیں یہ سمجھانے کی کوشش کروں گا کہ اس کائنات کا کوئی خالق ضرور ہے۔ تجربہ گاہ کی چھت سے ایک لیمپ لٹکا کر نیچے ایک گلوب رکھ دیا اور اسے اس طرح گردش دینے لگا کہ روشنی کبھی ایک حصّے پر اور کبھی دوسرے حصّے پر پڑتی۔ استاد نے کہا کہ سوچو کہ خلا میں یہ کرۂ زمین ایک مقررہ سمت کروڑوں سال سے اس طرح حرکت کناں ہے کہ اس کی رفتار میں سرِمو فرق نہیں آیا۔ اس کُرے کی سطح پر جو کچھ ہے اسے کسی مقناطیسی کشش نے اس طرح پابند کر رکھا ہے کہ اسے اس گردشِ مدام کا مطلق احساس نہیں ہوتا۔ اب بتاؤ کہ وہ کون سی طاقت ہے جو اتنے بڑے کُرے کو مسلسل حرکت میں رکھتی ہے اور وہ توانائی پیدا کرتی ہے جو اس کی رفتار ہمیشہ باقی رکھتی ہے۔ اس مظاہرے کو دیکھ کر میرا سر ایسا چکرایا کہ کئی دن گھنٹوں آسمان کی طرف دیکھ کر حیران ہوتا کہ میں ایسی دنیا کی پُشت پر چپکا ہوا ہوں جو شب و روز پھرکی کی طرح گھوم رہی ہے۔ دماغ نے اس دلیل کو قبول کر لیا کہ کائنات کا کوئی خالق ضرور ہے، لیکن اس کا منشا کیا ہے اور زندگی کا مقصد کیا ہے؟ ان سوالات کا تسلّی بخش جواب نہ ملا۔

برسبیل تذکرہ ۱۹۴۴ء کا ایک دلچسپ واقعہ یاد آیا جب میں دو دوستوں کے ساتھ کشمیر کی اس مہم پر نکلا جس کا ذکر پہلے کہیں آیا ہے۔ سری نگر سے جب ہم ایک موٹر لاری پر اپنے طویل سفر کے لیے ضروری ساز و سامان کے ساتھ پہل گام پہنچے تو قلیوں نے ہمارے ساتھ جانے سے صاف انکار کر دیا، کیونکہ آگے کے راستے میں جان کا خطرہ تھا۔ اتفاقاً آغا صفدر سے ملاقات ہو گئی جو علی گڑھ کے شناسا اور یہاں کے تحصیل دار تھے۔ پہلے تو انھوں نے اس پُرخطر سفر سے باز رکھنے کی کوشش کی لیکن میں نے ایسی طبیعت پائی ہے کہ جب کوئی فیصلہ کر لیتا ہوں تو اسے آسانی سے نہیں بدلتا۔ چنانچہ آغا صفدر کے حکم پر دس بارہ قلی ناچار ہمارا سامان اٹھا کر امرناتھ پہاڑ کی طرف ہمارے نقشِ قدم پر چل پڑے۔ کوہ نوردی کے اصول کے خلاف ہم نے صبح کے بجائے سفر اسی دن دوپہر کو شروع کر دیا کہ مبادا قلی بھاگ نہ جائیں۔ پہلا پڑاؤ چودہ میل دور "چندن باری" نامی مقام پر تھا اور اسے جوانی کی دیوانگی سمجھیے کہ تاریکی شب میں ایک نامعلوم ڈگر پر پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہوئے خدا جانے کس طرح زندہ سلامت ہم اس جگہ تک پہنچے۔

اندھیرے میں دور ایک چراغ روشن نظر آیا۔ قلی تو میلوں پیچھے رہ گئے تھے اور میرے دونوں دوست یقیناً دل ہی دل میں میری شکایت کر رہے ہوں گے۔ بہر صورت عالم ہو میں وہ روشن چراغ ہمارے لیے نورِ رحمت ثابت ہوا۔ جھونپڑی پر دستک دی تو ایک سکھ نے دروازہ کھول کر ہمارا مدّعا دریافت کیا۔ سردی اتنی سخت تھی اور تھکن اور بھوک نے ایسا نڈھال کر دیا تھا کہ اس نے ترس کھا کر ہمیں اندر بلا لیا اور آتش دان کے سامنے مونڈھوں پر بٹھا دیا۔ سکھ نے بتایا کہ امرناتھ کی جاترا کا موسم ختم ہو چکا ہے اور اب مہینوں تک کوئی ادھر سے نہیں گزرے گا۔ سارے دکان دار چلے گئے۔ فقط وہ چند روز کے لیے یہاں رہ گیا ہے۔ ہماری خاطر وہ کچھ پکانے کے لیے تیار ہو گیا اور ہم آتش دان کے سامنے سگریٹ پیتے ہوئے خاموش بیٹھ گئے۔ یک بیک دروازے پر کسی جانور کی غرّاہٹ کے ساتھ رام نام کا نعرہ بلند ہوا۔ تعجب سے پلٹ کر دیکھا تو دراز قد سادھو چیتے کے ساتھ کوٹھری میں داخل ہوا۔ ہم میں سے ہر ایک کے ہاتھ میں بلّم تھا جسے بیک وقت سنبھال کر ہم چیتے کی زد سے پیچھے ہٹ گئے۔ سادھو

نے ہنس کر کہا کہ فکر نہ کرو یہ میرا بچّہ ہے۔ اس کی تنبیہہ پر وہ چپ چاپ کونے میں بیٹھ گیا۔ تاہم ہم رُخ بدل کر احتیاط سے کبھی اُسے اور کبھی سادھو کو دیکھتے رہے۔ اُس نے اپنا جو ماجرا سنایا وہ دلچسپ اور قابل ذکر ہے۔

پندرہ سال قبل وہ مرزاپور میں پوسٹ ماسٹر تھا۔ اچھا خاصا تعلیم یافتہ بلکہ اردو اور فارسی سے بھی بخوبی واقف تھا۔ شہر میں طاعون کی وبا اس طرح پھیلی کہ اس کی بیوی دونوں بچّوں کے ساتھ دفعتاً لقمۂ اجل بن گئی۔ اس حادثے کا اس پر ایسا گہرا اثر ہوا کہ دنیا لاحاصل اور زندگی بے مصرف ہو کر رہ گئی۔ بس اس نے ملازمت اور گھر بار کو خیرباد کہا اور سادھوؤں کے ساتھ ہمالیہ کی طرف چل پڑا۔ کئی سال ان کی صحبت میں گزارے تا آنکہ ایسا گرو ملا جس کے ساتھ ذہنی اور روحانی احساس کی بہت سی منزلیں طے کر لیں۔ اب یہ سادھو کئی سال سے اس علاقے میں رہ پڑا تھا۔ فی الحال اس کا بسیرا چنار کے ایک درخت کے تنے میں تھا۔ کبھی بجلی گری تو پیڑ اس طرح سوکھا کہ صرف اس کا کھوکھلا تنا باقی رہ گیا۔ ہرن کی کھال بچھائے کمبل اوڑھے سادھو اسی میں لیٹا اپنے خیالات میں غلطاں و پیچاں رہتا تھا۔ چیتے کا بھٹکا ہوا بچّہ یہیں کہیں ملا تو اسے پال لیا اور وہ اس سے اتنا ہل گیا تھا کہ دن بھر کی سیر کے بعد شام کو اس کے پاس لوٹ آتا۔ میں نے پوچھا کہ "دنیا تج کر تمھیں کیا ملا"، تو اس نے جواب دیا کہ "دنیا میں رہ کر تم نے کیا حاصل کیا؟" دراصل جب زندگی فانی ہے تو ہر فرد کو اسے بسر کرنے کے لیے اپنے مزاج اور حالات کے مطابق معنی و مقصد پیدا کرنا پڑتا ہے۔

دراصل حیاتِ انسانی کا سب سے اہم جوہر دماغ ہے جس کی سائنٹیفک تحقیق ابھی ابتدائی مراحل میں ہے۔ اس کی لامحدود پیچیدگی کے بارے میں صرف اتنا ہی معلوم ہے کہ سیر بھر وزنی مغز میں لگ بھگ دس ارب خلیے ہوتے ہیں اور کوئی ذہین آدمی بھی فی الحال اس کی پندرہ فی صد صلاحیت ہی کو استعمال کر سکتا ہے۔ لاکھوں سال قبل جب آدمی حیوان کی سطح سے آگے نہ بڑھا تھا، تہذیب کی ترقی کے ساتھ یہ صلاحیت رفتہ رفتہ بڑھتی گئی۔ جس طرح بچّے کی عمر کے ساتھ ذہانت بڑھتی ہے اور وہ سمجھنے بوجھنے، تلاش اور تنقید

کرنے، تجربے اور مشاہدے سے نتیجہ اخذ کرنے کی صلاحیت پیدا کرتا ہے اور اس سارے علم کو دوسروں تک پہلے زبانی اور بعد ازاں بذریعہ تحریر منتقل کرنے کی مسلسل کوشش کرتا ہے جس کے باعث انسان کو نہ صرف حیوان پر فضیلت حاصل ہوئی بلکہ اُسے قدرت کے وسائل سے استفادے کے قابل بھی بنایا۔ بالفاظ دیگر ذہنی ارتقا کا جو عمل وقتِ آفرینش شروع ہوا تھا ہنوز جاری ہے۔ دماغ کی ۸۵ فی صد باقی ماندہ صلاحیت جو ظاہر بروئے کار نہیں آئی اس میں معلوم نہیں کتنی قوت مضمر ہے۔ یہ محض غلط فہمی ہے کہ مذہب اور سائنس میں کوئی بنیادی تضاد ہے۔ سائنس محض اس علم کا نام ہے جو تجربے سے ثابت کیا جا سکتا ہے۔ اس کا یہ دعویٰ نہیں کہ وہ تمام علوم پر حاوی ہو چکا ہے۔ کیونکہ علم کسی نہ کسی عنوان سے زمان و مکاں کی ناپیدا کنار سمتوں کی جستجو ہے۔ وقت کے ساتھ علم ترقی کرتا چلا جاتا ہے اور عقل زیادہ رسا ہوتی جاتی ہے۔ دورِ حاضر نے بیک جست اتنی منزلیں طے کر لی ہیں کہ سو سال پہلے ناقابلِ یقین تھیں۔ عین ممکن ہے کہ کسی خاص موقع پر عقل کم مایہ ثابت ہو لیکن صرف اس وجہ سے اسے ترک کر دینا ایسی جہالت ہے جو بڑی حد تک بنی نوع انسان کی تعصّب پروری اور وہم پرستی کی ذمّہ دار ہے۔

ہر دور میں ایسی شخصیتوں کا ظہور ہوا ہے جن کی ذہنی بالیدگی عام سطح سے بلند ہوتی ہے۔ اس میں کچھ دخل ان کے کردار، عمل اور ریاض کو ہوتا ہے اور کچھ اس امر کو کہ قدرت نے انھیں ذہن کی ان صلاحیتوں سے کام لینے کے قابل بنایا ہے جن تک عام ذہن کی رسائی ممکن نہیں۔ مثال کے طور پر ایک اونچی دیوار کا تصوّر کیجیے جس کے سامنے ہم سب کھڑے ہیں اور اس کے پرے کچھ نہیں دیکھ سکتے ہیں، لیکن اس میں کسی کو کوئی دراڑ مل جاتی ہے جس سے آنکھ لگا کر وہ باہر کی فضا کو دیکھ سکتا ہے۔ اب سائنس داں بھی اقرار کرتے ہیں کہ علوم طبعی جن کا انحصار حواس خمسہ پر ہے تمام علوم پر حاوی نہیں ہیں۔ اس سے یہ مراد نہیں کہ ان دونوں کے درمیان کوئی خلیج ہے۔ مسئلہ دماغ کی باقی ماندہ صلاحیت کو ترقی دینے کا ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ گیارھویں صدی تک جب اسلامی معاشرے نے دین اور علم کو ہم آہنگ رہنے دیا تو وہ عروج حاصل کر سکا لیکن اس کے بعد جب فقہ نے

فلسفے کے ساتھ سائنس کی راہ بھی روک لی تو علم اور معاشرے میں زوال کے آثار پیدا ہونے لگے۔ پھر انجام جو کچھ ہوا وہ ہمارے سامنے ہے۔ یہ کتنی عجیب بات ہے کہ جس مذہب نے علم کو سب سے زیادہ اہمیت دی تھی اسی کے پیرو عقل کے سب سے بڑے دشمن بن گئے۔ حتیٰ کہ ہماری شاعری کا ایک مقبول موضوع خرد دشمنی اور جنوں پرستی قرار پایا۔

ہر فرد کے لیے سب سے اہم مسئلہ اس کی اپنی بقا ہے، لیکن وہ کسی نہ کسی گروہ میں رہنے کے لیے مجبور ہے جو بتدریج خاندان، قبیلے اور قوم کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ بقائے باہمی کا اصول فرد اور گروہ کے رشتے کو جوڑتا ہے۔ انقلاب فرانس کے ذہنی علم بردار روسو نے اس اصول کی تشریح یوں کی ہے کہ آمریت کا دور ختم ہوا اور جمہوریت کی داغ بیل پڑی۔ روسو نے کہا کہ حکومت کا مقصد عوام کی فلاح ہے اور جب وہ عوام دشمنی کی راہ اختیار کرتی ہے تو وہ حکومت کے حق سے بے دخل ہو جاتی ہے۔ روسو کے اس جمہوری فلسفے کے مطابق آزادیِ فرد کا پیدائشی حق ہے اور آئین کو اس کے حقوق و فرائض میں توازن رکھنا چاہیئے۔ اس آوازِ حق نے وہ ذہنی انقلاب برپا کیا جس کی جلو میں جمہوری آئین کی جد و جہد شروع ہوئی اور دنیا کے کئی ملکوں میں ابھی جاری ہے۔

کئی مغربی ممالک میں پچھلی صدی تک عیسوی کلیسا اس تصوّر کا پرزور حامی تھا کہ بادشاہ کو حکومت کا اختیار خدا نے بخشا۔ خلافت راشدہ کے بعد مسلمان حکمرانوں نے بھی یہی شعار اختیار کیا حتیٰ کہ آگے چل کر بادشاہوں نے ظلِ اللہ کے لقب سے خود کو نوازنا شروع کر دیا۔ مسلمانوں میں ذہنی اور سیاسی بیداری دراصل سو سال پہلے شروع ہوئی تو اس کے دو رُخ تھے۔ ایک تو آمریت کے بجائے آئینی جمہوریت کا قیام اور دوسری طرف مغربی تسلّط سے نبرد آزمائی۔

مکروہاتِ زندگی اگر فرصت دے تو ہر ذی شعور کائنات کی لامحیط وسعتوں کے ادراک کی کوشش کرتا ہے۔ سال بہ سال رسد گاہوں کی دوربینوں کے قُطر میں اضافہ ہوتا جاتا ہے، بایں ہمہ خلا کی دوری اور گہرائی وسیع تر ہوتی جاتی ہے۔ علم نجوم کی رُو سے خلا میں کروڑوں بلکہ اَن گنت کہکشائیں ہیں اور ان میں سے ہر ایک میں اربوں ستارے درخشاں و گردش

کناں ہیں۔ وہ بھی اس طرح کہ ایک دوسرے سے فاصلہ برقرار رکھتے ہیں۔ اس لامکاں کی تلاش ابھی شروع ہوئی ہے اور کون کہہ سکتا ہے کہ ان میں زندگی کے آثار کب، کہاں اور کس شکل میں ہویدا ہوں؟ وقت کے پیمانے سے جانچا جائے تو کسی دور دراز ستارے کی روشنی اربوں سال پہلے ہمارے کرۂ ارض کی طرف روانہ ہوئی اور شاید ابھی سرِ راہ ہے۔ اس ہوش ربا کائنات میں آئن اسٹائن کے نظریے کے مطابق زمان و مکاں ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔ وقت کی پُراسرار کیفیت نے ہر دور میں مذہب، فلسفے اور سائنس کو یکساں طور پر حیرت زدہ کیا ہے۔ اس کی مثال اس سمندر کی سی ہے جس کا اور چھور نہیں اور جس کی ہر موج مسلسل حرکت میں ہے۔ حال ماضی بھی ہے اور مستقبل بھی۔ اور حرکت کے سوا کسی شے کو دوام نہیں، لیکن ہم سب کو کبھی نہ کبھی کسی آنے والے واقعے کی خبر ہو جاتی ہے، خواہ وہ ذاتی الہام سے ہو یا کسی نجومی کے وسیلے سے۔ یہی وہ جبر و اختیار کا پیچیدہ مسئلہ ہے جو عقلِ انسانی کو حیران رکھتا ہے۔ کیا زندگی کی راہ کا تعین ہو چکا ہے؟ اور آدمی وہ کٹھ پتلی ہے جو بزعمِ خود اپنے آپ کو خود مختار سمجھنے لگے لیکن دراصل تماشا گر کے اشارے پر بندھی بندھائی لکیر پر چل رہا ہے۔ اس قیاس نے اس اندازِ فکر کو جنم دیا جس کا لازمی نتیجہ تقدیر پرستی ہے۔ حقیقت جو بھی ہو انسان کا مقدر یہی ہے کہ وہ اس حیاتِ مستعار کو با مقصد بنانے کے لیے مسلسل جد و جہد کرتا رہے۔ مذہبی نقطۂ نظر یا مادہ پرستی کے نظریے کے مطابق انسانی زندگی دو متضاد قوتوں کی مسلسل کشمکش میں مبتلا ہے۔ یہ خیر و شر کی قوتیں ہیں جنھیں اسلام نے اللہ اور شیطان، زرتشت نے یزداں اور اہرمن، اور گوتم بدھ نے تم (تاریکی) اور رج (روشنی) کا نام دیا ہے۔ کارل مارکس کے جدلیاتی فلسفے میں یہ وہ معاشی قوتیں ہیں جو دولت آفرینی کے وسائل کے تسلط کی خاطر طبقاتی جد و جہد میں مبتلا رہتی ہیں۔ ان سب نظریوں کا نصب العین یہی ہے کہ خیر، عدل، مساوات اور اخوت کی قوتیں کامران ہوں اور استحصال، جبر اور ناانصافی کی لعنتوں سے انسانیت نجات حاصل کرلے۔ تاریخ اسی جد و جہد کی خونی داستان ہے۔ ہزاروں سال کی کوشش کے باوجود صرف اتنا ہوا ہے کہ انسان پر تہذیب کی ملمع کاری ہو گئی ہے

اور وہ بظاہر امن و عدل کا دعوے دار بن گیا ہے، لیکن جیسے ہی اس کے ذاتی اغراض پر کسی قسم کی پابندی عاید ہوتی ہے تو یہ ملمع اُتر جاتا ہے اور انسان پھر اسی درندے کی شکل اختیار کر لیتا ہے جس کا وہ اوتار رہے۔ تعمیر و تخریب اور عقل و جہالت کے اس تضاد پر ہم جتنا بھی حیران ہوں کم ہے۔ ایک طرف ذہنی ترقی کا یہ کمال کہ توانائی کے نئے ذرائع کی دریافت کے بعد صنعتی انقلاب نے زندگی کی کایا پلٹ دی ہے اور سمندر کی گہرائیوں اور ستاروں کی بلندیوں تک پہنچا دیا۔ افلاس اور بیماری پر قابو پانے کے ذرائع معلوم کر لیے، لیکن دوسری طرف بربریت کا یہ مظاہرہ کہ رنگ، نسل اور قومیت کے نام پر آج بھی ایسے روح فرسا مظالم ہو رہے ہیں جن کی مثال پہلے سننے میں کبھی نہ آئی۔

اس منافقت کا مداوا کیا ہے؟ کیا یہ کہنا درست ہو گا کہ بدی انسان کے ضمیر کا جزوِ اعظم ہے اور بقول اقبال ابلیس نے یہ شکایت کی ہے کہ ؎

اے خداوندِ ثواب و ناثواب
من شدم از صحبتِ آدم خراب

جب بدی کے اس داغ کو دھونے کے لیے عیسیٰ نے صلیب اٹھا لی یا منصور نے سرِ دار نعرۂ حق بلند کیا تو کیا داورِ محشر نے ان کی قربانی قبول کر لی! اور یا بنیادی طور پر یہ فرد کی اخلاقی بلندی اور پستی کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ معاشرے کے اقتصادی عدم توازن کا سوال ہے! تاریخ شاہد ہے کہ معاشرہ ہمیشہ حاکم اور محکوم میں بٹا رہا ہے۔ ان کے نفاق پر مختلف پردے پڑے رہے، لیکن ان کے بنیادی تضاد سے انکار ناممکن ہے۔

سائنس داں کہتے ہیں کہ چند ارب سال قبل لامکاں میں قیامت خیز ہنگامے کے بعد یہ کرۂ زمین وجود میں آیا۔ اس نظریے کو "بینگ" (BANG) کا پُرشور نام دیا گیا ہے "بینگ" کی آواز ہو یا کُن کی، یہ زمین وجود میں آئی اور کروڑوں سال کی تبدیلیٔ آب و ہوا کے ساتھ اس قابل بنی کہ حیات کی نشوونما کر سکے۔ پھر ارتقا کے پُرپیچ مراحل سے گزر کر وہ دوٹنگا جانور نمودار ہوا جو دماغ کی ترقی کے ساتھ ساتھ آدمیت کے منصب کا حق دار کہلایا۔ کہاں چقماق سے آگ جلانے کی ترکیب اور کہاں جوہری توانائی کی ایجاد۔ کہاں

بندروں کی تقلید میں درختوں پر اُچکنے کی مشق اور کہاں خلا نوردی کا کرشمہ! کہاں بیل گاڑی کی آہستہ خرامی اور کہاں ہوائی جہاز کی برق رفتاری۔ بایں ہمہ جہالت اور تعصّب کی یہ شدّت کہ گورا کالے کی رنگت سے بدظن ہے اور ہر زبان دان اپنی بولی کو آسمانی زبان سمجھتا ہے۔ یہاں تک کہ ہر فرد بہ زعمِ خود اپنے کو اس دنیا کا محور گردانتا ہے۔

غور سے سوچا جائے تو فردِ واحد کے ذاتی مسائل بہت کم ہوتے ہیں۔ تھوڑا سا کام کر کے وہ اپنی بود و باش کا انتظام با آسانی کر سکتا ہے۔ اصل مسئلہ وابستگی کا ہے۔ فرد کا زیادہ وقت اپنے وابستگان کے مسائل کو حل کرنے میں ضائع ہو جاتا ہے۔ مشکل یہ ہے کہ انسان تنہا نہیں رہ سکتا۔ ظاہر و باطن اور فرد اور معاشرے کی ان الجھنوں کو دورِ حاضر جس طرح سلجھا رہا ہے اس کا تجزیہ غور و فکر کا محتاج ہے۔ یہ صنعت، سائنس اور ٹیکنالوجی کا دور ہے۔ سرمایہ داری ہو یا اشتراکیت انھیں راستوں پر گامزن ہے۔ فرق صرف دولت آفرینی کے وسائل کی ملکیت کا ہے۔ دو سو سال کی مدّت میں جن ملکوں نے ان راستوں کو اختیار کر لیا وہ مادّی ترقی کی کئی منزلوں سے گزرے ہیں۔ جنوبی امریکہ، افریقہ اور ایشیا، اب ان کی پیروی میں سرگرداں ہیں۔ قبائلی اور زراعتی معاشرے کو بدل کر اُس نہج تک آنے میں بڑی دشواریاں پیش آتی ہیں جن کا تعلق تمدّن کے علاوہ ذہنی تصوّرات اور اخلاقی اور تہذیبی قدروں سے بھی ہوتا ہے۔ ہر معاشرہ اپنی اخلاقی قدروں کی تشکیل کرتا ہے اور کردار ماحول کے مطابق بدلتا ہے، البتہ ہر دور میں چند لوگ ایسے ضرور ملتے ہیں جو صداقتوں کے نشان بردار ہوتے ہیں جن سے تاریخ کی شبِ تاریک میں روشنی کا احساس ہوتا ہے۔ ابتدائے آفرینش سے انسان نے زندگی کو اپنے لیے دوبھر بنا لیا تھا کہ اسے راہِ نجات اس دنیا میں نہیں بلکہ عالمِ بالا میں نظر آئی۔ چنانچہ ہندو اور بدھ کے تصوّرِ حیات کا تقاضا کلّی فنا ہے یعنی نیستی کی وہ کیفیت جو صرف جسم نہیں بلکہ روح کو بھی معدوم کر دے۔ عبرانی مذاہب کے نزدیک یہ دنیا محضِ دارِ فانی ہے اور اس سے نجات حاصل کرنے کے بعد ہی سزا و جزا کے مرحلے سے گزر کر ہی بقائے دوام حاصل ہو سکتا ہے۔ دورِ حاضر کا انسان یہ باور کرنے لگا ہے کہ جدید علوم نے اُس ماحول میں خاطر خواہ اصلاح کی صلاحیت پیدا کر دی ہے اور

کوئی وجہ نہیں کہ وہ دنیا کو امن اور آزادی کا گہوارہ نہ بنا سکے۔ چار سو سال قبل سر ٹامس مور نے یوٹوپیا نامی کتاب میں ایک ایسی خیالی جنّت کا نقشہ کھینچا تھا جس میں انسان رنگ و نسل، مذہب و قومیت کے تعصّبوں سے بالاتر ہو کر ایسے پُرسکون سماج میں رہتے تھے جس میں آقا و غلام اور امیر و غریب کا امتیاز ختم ہو چکا تھا۔ اُس زمانے میں ایسے سماج کا حصول اس لیے ناممکن تھا کہ اس کے مادّی وسائل ناپید تھے، لیکن آج جب علمی ترقی نے دولت کی فراوانی تو مہیّا کر دی ہے مسئلہ صرف اس کی عادلانہ تقسیم کا ہے۔ انسانیت کی تعمیر و تخریب کی ذمّہ داری کسی اور طاقت پر نہیں بلکہ خود انسان پر عاید ہوتی ہے۔ انسان ہی اپنا سب سے بڑا دوست اور اپنا سب سے بڑا دشمن ہے۔

ارتقا کا عمل جاری ہے۔ جب تک قول و فعل، ظاہر و باطن اور فرد و معاشرت میں ہم آہنگی پیدا نہ ہو گی یہ عمل نامکمّل رہے گا۔ زندہ رہنے کے لیے نہ سگِ دنیا بننے کی ضرورت ہے نہ تارک الدنیا۔ فقر و فاقہ کی رہبانیت کی بہ نسبت میانہ روی صحیح راہِ عمل ہے۔ حرص و ہوس کا روگ لگ جائے تو قارون کا خزانہ بھی کم ہے۔ ٹالسٹائے نے اس امر کی تشریح ایک بے مثال کہانی میں کی ہے۔ روس میں جب زارشاہی ختم ہونے کو آئی تو غلاموں کے دن پھرے اور انھیں آزاد کر دیا گیا۔ کسی جاگیردار کو اپنے سن رسیدہ غلام سے بڑا لگاؤ تھا چنانچہ گلو خلاصی کے وقت اس سے پوچھا کہ اب تم کیا کرو گے؟ اس نے جواب دیا کہ مجھے کھیتی باڑی کے سوا کوئی کام نہیں آتا، لیکن میرے پاس کوئی زمین نہیں ہے۔ جاگیردار جو ہزاروں ایکڑ اراضی کا مالک تھا بولا کہ زمین کی کیا کمی ہے جتنی چاہو مُنھ مانگے لے لو۔ غلام کو جب یقین نہ آیا تو مالک نے کہا کہ تم صبح سے شام تک پا پیادہ چل کر جتنی زمین کا احاطہ کر لو وہ تمھاری ملکیت ہو جائے گی۔ یہ سنتے ہی بھری گرمی میں صبح سویرے وہ غلام لالچ کے مارے میدان میں بگ ٹٹ بھاگ پڑا تاکہ سیکڑوں ایکڑ زمین پر قبضہ کر لے لیکن بھاگتے بھاگتے وہ شام تک دھوپ اور پیاس میں ایسا بے دم ہوا کہ آقا کے قدموں پر گر پڑا اور دم توڑ دیا۔ اس کا مقدّر وہی دو گز زمین تھی جو ہر انسان کے نصیب میں لکھی ہے۔

قدرت کی یہ کیسی ستم ظریفی ہے کہ ماں کے حمل کی تاریکی سے نکال کر پھر اسے مادرِ گیتی کے

تاریک گوشے میں دفن کر دیتی ہے، لیکن اس حقیقت سے آگاہی کے باوجود وہ اسی غلام کی طرح حرص و ہوس کے میدان میں دیوانہ وار بھاگا بھاگا پھرتا ہے۔ جب اُس سادھو نے پوچھا تھا کہ تمھیں دنیا میں رہ کر کیا ملا تو اس کا اشارہ اسی اندوہناک گمراہی کی طرف تھا۔

اس سے یہ مراد نہیں کہ اُس سادھو کی طرح دنیا تج کر چنار کے تنے میں وقت گزار دیا جائے۔ مسلسل گردشِ روزگار اور اس بے حرکتی کے درمیان توازن ممکن ہے۔ بے حرکتی کا سب سے بڑا مدعی وہ چینی فلسفی "لی ہو" تھا جس کا قول مشہور ہے کہ اگر چل سکتے ہو تو بھاگنے کی کوشش نہ کرو اور کھڑے رہ سکتے ہو تو نہ چلو، بیٹھ سکتے ہو تو کھڑے نہ ہو اور لیٹ سکتے ہو تو نہ بیٹھو۔ مشرق کی اس بے عملی نے، جسے روحانیت کا نام دیا جاتا ہے، اور زرو زمین کی اس تگ و دو میں جو صنعتی مادّہ پرستی کا امتیاز ہے عقل و اخلاق کی ہم آہنگی توازن پیدا کر سکتی ہے۔

انسان حرص و ہوس کا بندہ ایک تو اپنی فطری نفس پرستی کی وجہ سے ہوتا ہے، اور پھر ماحول کی غیر یقینی حالت کی وجہ سے۔ مذہب اسے نفس کشی کا درس دیتا ہے اور امّید دلاتا ہے کہ اس دنیا میں نہیں تو اگلی دنیا میں غیر یقینی کا وسوسہ ختم ہو جائے گا۔ جہاں تک معاشرے کا تعلق ہے حکومت اس کی زر پرستی کو جائز حدود میں رکھنے کے لیے تحدید و تادیب سے کام لیتی ہے۔ اس غرض سے بھانت بھانت کے جتن کیے گئے۔ کاغذی کرنسی کا چلن تو زمانۂ حال کی بات ہے، قدیم یونان میں کسی حاکم نے تانبے یا لوہے کا سیر یا آدھ سیر کا سکّہ رائج کر دیا کہ اس کے بارِ گراں کو اٹھانے میں اتنی زحمت ہو کہ لوگ دولت کا ذخیرہ نہ کر سکیں۔ علاءالدین خلجی نے کم وزن بیچنے والے دکان داروں کے جسم کا گوشت اتنی ہی مقدار میں کاٹنا شروع کیا تاکہ وہ بے ایمانی سے باز آجائیں۔ اب ان حکمتوں پر عمل کرنے والے نہیں رہے ورنہ افراطِ زر اور ذخیرہ اندوزی کی لعنتوں سے بلا دقّت نجات پا لیتے۔ اس زمانے کی معاشی مشکلات کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ حکومتیں ہر معاملے میں دخل انداز ہوتی ہیں اور شہری بھی اپنے سارے فرائض ان کے سپرد کر کے بری الذّمہ ہونا چاہتے ہیں اور اس طرح اپنے حقوق سے بھی محروم ہو جاتے ہیں۔ جب

حکومت سے یہ کہا جائے گا کہ وہ فقط جان و مال کی حفاظت ہی نہیں بلکہ تعلیم، صحت، بار برداری، کاروبار حتیٰ کہ زچہ خانہ اور قبرستان کی خبر گیری کا ذمّہ سنبھالے تو یوں فرد کی حیثیت محض خدمت گزار یا پیشہ ور کی رہ جاتی ہے۔ اس کی انفرادیت ختم ہونے لگتی ہے اور وہ افزائش اشیاء کی ہیبت ناک مشین کے ادنیٰ پُرزے کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ اس صورتِ حال کا ردِّ عمل نراجیت (ANARCHISM) کا نظریہ ہے جو حکومت کے ادارے کو اس وجہ سے خارج کرتا ہے کہ وہ انسان کو مستقل محکومیت کی لعنت میں گرفتار کر دیتا ہے۔ یہ نظریہ انسانوں کو تلقین کرتا ہے کہ وہ تعاون باہمی کے اصول پر اپنے معاملوں کا حل تلاش کریں۔ اصولاً یہ تصوّر صحیح ہے، لیکن اس پر عمل کا راستہ بڑا کٹھن ہے۔ لہٰذا یہی ماننا پڑتا ہے کہ جمہوریت ہی وہ قابلِ عمل طریقۂ کار ہے جو فرد اور جمعیت کے مفاد میں توازن پیدا کر سکتا ہے۔

دورِ حاضر کی مادّی ترقی کا راز اس امر میں مضمر ہے کہ حیوان یا انسان کی جسمانی مشقّت کا بدل خود کار مشینوں میں مل گیا۔ ان کے بغیر اب زندگی کا تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا بلکہ کئی شعبوں میں انھوں نے وہ تمام حاصل کر لیا ہے کہ آدمی غیر ضروری اور مدّ فضول ہوتا جا رہا ہے۔ عقل رسا اور بے عقلی کی نبرد آزمائی نے جو عدم توازن پیدا کر رکھا ہے اس کی کتنی مثالیں گنائی جائیں۔ ترقی پذیر ملکوں میں اگر چوپائے زیادہ اور دوپائے کم ہو جائیں اور ترقی یافتہ ملکوں میں مشینوں کی بالادستی پر قابو پا لیا جائے تو دورِ حاضر کی بہت سی مشکلیں آسان ہو جائیں گی، لیکن تہذیب ایک بے لگام گھوڑے کی طرح ہے جو ایمان کی عنان اور عقل کی زین سے بے نیاز کسی نامعلوم سمت میں بھاگی جا رہی ہے۔ قدرت نے جب اس کرۂ ارض کی تشکیل کی تو بظاہر اس کا منشا نہ تھا کہ اسے صدہا چھوٹے بڑے ملکوں میں تقسیم کر دیا جائے گا، لیکن تاریخِ انسانی کا سب سے بڑا المیہ قومی تعصّب اور وطن پرستی کا وہ جذبہ ہے جو انسانیت پر مہیب آسیب کی طرح سایہ فگن ہے۔ پیغمبروں اور مفکّروں نے انسانوں کو جن عداوتوں اور نفرتوں سے باز رکھنے کی کوشش کی تھی، وہ نسل، رنگ، نظریے اور زبان کا پرچم اٹھائے ہر طرف ان آدرشوں کو پامال کر رہی ہیں۔

عقل و جہالت اور تعمیر و تخریب کی یہ مسلسل کش مکش کسی نئی دنیا کی تخلیق کی نقیب ہے یا پرانی دنیا کا دمِ واپسیں!

اس صدی کے وسط میں جب مشہور محقّق والی کوسکی (VALIKOUSKY) نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ ہمارے کرۂ ارض میں تقریباً پندرہ ہزار سال قبل کسی دُم دار ستارے کی ٹکر نے قیامت خیز تبدیلی پیدا کر دی تو سائنس دانوں میں تہلکہ مچ گیا۔ وہ ارتقا کے عمل میں کسی حادثے کے قائل نہیں ہیں۔ ان کے نزدیک حیات کے وجود کے ساتھ علّت و سبب کا ایسا آہنی آئین مرتب ہوا جس میں کسی تغیّر کی گنجائش نہیں، لیکن والی کوسکی نے بڑی کاوش سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ کسی سماوی حادثے نے وہ قیامت برپا کی جو طوفانِ نوح اور اٹلانٹس نامی برِّاعظم کی غرقابی کی صورت میں نمودار ہوا جس کا ذکر سب سے پہلے افلاطون نے کیا۔ اس پُرآشوب ہنگامے میں زہرا نامی سیّارے نے ایسا منحوس کردار ادا کیا کہ عہدِ قدیم کے انسان مدّتوں اس کے عتاب سے خائف رہے اور اب بھی اسے بدشگونی سے محمول کرتے ہیں۔ افلاطون کے بیان کے مطابق وہ برِّاعظم غرقاب ہو گیا۔ اس کی تلاش آج بھی جاری ہے۔ اس کے مکینوں میں جو تھوڑے بہت اتفاق سے بچ گئے سمندروں کی لہروں نے انھیں مغرب میں جنوبی امریکہ اور مشرق میں مصر کے ساحل پر پہنچا دیا۔ گویا اس گم شدہ تہذیب کے آثار نئی زمینوں میں ظہور پذیر ہوئے۔ ہماری تہذیبی تاریخ کا سرا یہیں سے ملتا ہے۔ بھولی ہوئی پچھلی داستان کو یاد کرنا ہو تو ان شواہد کا مطالعہ کرنا ہوگا جنھیں بڑی محنت سے محقّق والی کوسکی نے اپنی کتابوں میں لکھا ہے۔ تاریخ کے ابتدائی دور میں حرص و ہوس اور عداوت و نفرت کے وہ رجحان نظر نہیں آتے جن کا سیلاب بعد میں انسانیت کو بہا لے گیا۔ رومان پسند مورّخوں نے اس دور کو خیالی جنّت سے تعبیر کیا، لیکن یہ خیالی جنّت جلد ختم ہو گئی اور پھر آقا و غلام کا وہ رشتہ شروع ہوا جو نام کی تبدیلی کے باوجود ہر معاشرے میں موجود ہے۔ بقول آنند نرائن مُلّا ؎

طاقت کے دوش پر ہے ازل سے بشر کی لاش
بس یہ ہوا کبھی کبھی کاندھے بدل گئے!

محکوم اس بندھن کو توڑنے کا لاکھ جتن کریں لیکن یہ کام اصل میں وہ روشن ضمیر انجام دیتے ہیں جن کے لیے لغت میں مجاہد سے بہتر لفظ نہیں ملتا۔ ظلم اور بے انصافی سے ہی جہاد کا وہ جذبہ اُبھرتا ہے جو کسی نہ کسی عنوان سے ہر دور میں معاشرے کو اصلاح اور ترقی کے لیے مجبور کرتا ہے۔ زمانۂ حال میں جب اتھوپیا کے کسی بادشاہ نے غلاموں کی آزادی کا اعلان کیا تو وہ واویلا مچانے لگے کہ خدارا ہمیں آزاد نہ کرو کیونکہ آزادی سے ہمیں کیا حاصل ہے؟ کارل مارکس کی یہ پیش گوئی بھی غلط ثابت ہوئی کہ صنعتی سماج میں محنت کش لامحالہ انقلاب کے علم بردار ہوں گے۔ اس کے برعکس دیکھنے میں آیا ہے کہ مغربی صنعتی ممالک میں یہی محنت کش سرمایہ دارانہ نظام کے فرماں بردار ہیں۔

یہ بھی ضروری ہے کہ انسان اور قدرت کے متعلق تجزیہ کیا جائے۔ چند سو سال قبل جب انسان نے قدرتی وسائل سے استفادے کی صلاحیت پیدا کی تو بے سوچے سمجھے ان کے استحصال میں لگ گئے۔ جن معدنی ذخیروں کو جمع کرنے میں قدرت نے لاکھوں سال صرف کیے تھے، صنعت کاروں نے دیکھتے دیکھتے ان کا صفایا کر دیا اور اب دنیا پریشان ہے کہ اگلی نسلوں کے لیے یہ ضروریات کہاں سے میسّر ہوں گی۔ قدرت نے افزائش نسل میں توازن اس طرح برقرار رکھا تھا کہ پیدائش اور اموات کی شرح قابو میں رہتی تھی لیکن جیسے ہی جدید طب نے وباؤں کو معدوم کر دیا تو آبادی میں بے تحاشا اضافہ ہونے لگا۔ بنی نوع انسان کے لیے سب سے اہم مسئلہ اب یہ ہے کہ وہ کس طرح اپنی تعداد کو کم کرے اور درختوں اور مویشیوں کی تعداد کو بڑھائے۔ بالخصوص ترقی پذیر ممالک کی آئندہ ترقی کا انحصار اسی عمل پر ہے۔ غرض حقیقت کے کئی رُخ ہیں۔ سب سے پہلے تو اپنی ذات کی تلاش ہے پھر ان اصولوں کی شناخت جو فرد اور معاشرے کے رشتوں کا تعین کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں اس تعلق کا علم جو انسانیت اور قدرت کے مقاصد میں توازن پیدا کرتا ہے۔

بیسویں صدی نے شاید برٹرینڈ رسل جیسا مفکّر پیدا نہیں کیا۔ میں پہلے کہیں لکھ

چکا ہوں کہ کس طرح اس کی تحریروں نے مجھے زمانۂ طالب علمی میں متاثر کیا تھا اور یہ اثر ہنوز باقی ہے۔ اس نے اپنی سوانح حیات میں لکھا ہے:۔

"میری زندگی کے تین مقصد رہے ہیں۔ علم کی تلاش، محبّت کی جستجو اور غمِ دوراں۔"

ان مقاصد کا حصول تو بڑی بات ہے، ان کے معنی سمجھنے کے لیے ہی دل و دماغ کی ضرورت ہے۔ دنیا کے سب سے بڑے سائنس داں نیوٹن کے کانوں میں جب صدائے اجل آئی تو اس نے کہا۔

"لوگوں کا خیال ہے کہ میں علم کی تہ تک پہنچ گیا ہوں مگر میری مثال اس طفل کی سی ہے جو علم کے بحرِ بے کنار کے ساحل پر کھڑا ہوا بکھرے ہوئے سنگ پاروں میں سے اتفاقاً چند چمکیلے کنکروں کو چن لے۔"

محبّت کی رسم آدم و حوّا نے ڈالی تھی اور ان کی اولاد چاہے یا نہ چاہے قدرت انھیں اس سرابِ صحرا کی تلاش میں مصروف رکھتی ہے۔ اس جذبے میں عظمت تب ہی پیدا ہوتی ہے جب وہ جسم سے ہٹ کر ایسی غیر مرئی شکل اختیار کرلے جو عبادت کا حاصل اور فن کا جوہر ہو۔ علم کی بے قراری، محبّت کی خلش اور مظلوم انسانیت کی ہمدردی میں وہ باہمی تعلق ہے جو تہذیب کے ظلمت کدے کا شب چراغ ہے۔ حقیقت کی یہی وہ منزل ہے جس کی طرف کاروانِ حیات بہ مشکل تمام رواں ہے۔

حرفِ آخر

(۲۰)

عہدِ وسطیٰ میں ایمان کو عقل سے ٹکرانے کا رواج تھا اور عیسوی کلیسا نے یہ تاثر دے رکھا تھا کہ عقل اور دین ایک ساتھ نہیں رہ سکتے۔ بڑی طویل کش مکش کے بعد جب کلیسا کی گرفت کمزور ہوئی تو عقلی علوم نے انسانیت کی رہنمائی عہدِ جدید کی طرف کی۔ اسلامی معاشرے میں پہلے تو علم و دین میں کوئی اختلاف پیدا نہیں ہوا لیکن خلافتِ عباسیہ کے زوال کے ساتھ یہ اختلاف اس طرح ابھرا کہ اس کی صدائے بازگشت آج تک سنائی دیتی ہے۔ یہ کہنے کی بات نہیں کہ جس طرح اہلِ ایمان کا بے عقل ہونا ضروری نہیں اسی طرح عقل مندوں کا ایمان سے محروم ہونا لازمی نہیں۔ تاریخ کے پس منظر میں دیکھا جائے تو گزشتہ صدی تک ساری دنیا میں تعلیم فقط خواص تک محدود تھی۔ تعلیم عامہ کی ضرورت مغرب میں صنعتی انقلاب کے بعد اس وجہ سے پیش آئی کہ جاہل مزدور پیچیدہ اور قیمتی مشینوں کو استعمال نہیں کر سکتے تھے۔ اس سے پہلے حکمراں طبقے نے ہر جگہ عوام کو تعلیم سے محروم رکھا۔ اس کی بدترین مثال ہندو قانون کے موجد "منو" کا یہ قول ہے کہ کم ذات (شودر) کے کان میں اگر مقدس وید کے منتر کی آواز پہنچے تو اس میں سیسہ پگھلا کر ڈال دیا جائے۔ مقصد یہ تھا کہ عوام میں سوچنے کی

صلاحیت پیدا نہ ہو۔ پاکستان میں اب تک اس رویے کا مظاہرہ یوں ہوتا ہے کہ قبائلی سردار اور جاگیردار اپنی رعایا میں تعلیم کی روشنی نہیں پہنچنے دیتے اور دیہاتوں میں عموماً عورتوں کی خواندگی پر قدغن ہوتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ علم اور عقل پر علمائے سوء کی تنقید حکمراں طبقے کے مفاد کے تحفظ کے بہلنے کے سوا کچھ نہیں۔ اس زاویۂ نظر سے دیکھیں تو اندازہ ہوگا کہ دانستہ یا نادانستہ ہمارے ملک میں تعلیم بالغاں، تعلیم نسواں اور سائنٹیفک تحقیق سے کیوں پہلوتہی کی جاتی ہے؟

ایک دوسرا قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ انیسویں صدی کے برّصغیر میں اپنا سیاسی اقتدار کلیتاً کھو دینے کے بعد مسلمانوں میں ذہنی انفعال کی جو کیفیت پیدا ہوئی اس نے بے وطنی اور فرار کی ذہنیت پیدا کر دی۔ برّصغیر سے ہزار سالہ تعلق کے باوجود انھوں نے قومیت اور وطنیت کے تصوّر سے منہ موڑنا شروع کر دیا۔ بظاہر وجہ یہی تھی کہ جس سرزمین پر اُن کے اجداد نے صدیوں حکومت کی تھی، وہاں وہ محکوم کی حیثیت سے نہیں رہنا چاہتے تھے۔ اس رویے کو اس سیاسی بیداری نے اور مستحکم کیا جو مغربی تسلّط نے دنیائے اسلام میں پیدا کر دی تھی۔ بالآخر مسلمانوں نے وہ حکمت عملی اختیار کی جس نے پاکستان کو معرضِ وجود میں لا کر بیک وقت قومیت اور اسلامی اتحاد کے تقاضوں میں یگانگت کی امید بندھائی، لیکن ہر نظریاتی تصوّر کو عملی دشواریوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ ہر قومی ریاست کا پہلا فرض اس کے شہریوں کی ترقی اور تحفظ ہے۔ مسلمان دنیا کے تقریباً پینتیس چالیس آزاد ملکوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ ان سب کے مفاد یکساں نہیں۔ عملاً ان میں سے کوئی دوسروں کی خاطر اپنے وجود کی بازی لگانے کو تیار نہیں۔ تاریخی محرکات نے قیام پاکستان کو ناگزیر بنا دیا تھا، لیکن جغرافیے نے اسے جو شکل دی وہ قابلِ عمل نہ تھی اور بالآخر ملک کے دونوں حصّوں نے دو آزاد مملکتوں کی شکل اختیار کر لی۔ دراصل ۱۹۴۰ء کی قرارداد پاکستان میں دو آزاد مسلم مملکتوں کی بات پہلے ہی کہی گئی تھی لیکن اس میں ۱۹۴۶ء میں مسلم لیگ کے اس جلسے میں، جو دہلی میں منعقد ہوا تھا، بنگال کے وفد کے اصرار پر ترمیم کی گئی تھی۔ ایک بار پھر بے وطنی کی نفسیات کا اثر ہماری زندگی کے ہر شعبے پر سایہ فگن ہوا۔ تقسیم کے وقت تقریباً ڈیڑھ کروڑ مہاجر ادھر

سے اُدھر جانے پر مجبور ہوئے۔ ان کی آبادکاری میں جو مسائل پیدا ہوئے وہ ناقابلِ بیان ہیں۔ بعدازاں اس نوآزاد ملک میں قومی یک جہتی کا سوال پیدا ہوا جس سے عہدہ برا ہونے کے لیے جس سیاسی تدبّر اور بصیرت کی ضرورت تھی وہ لیاقت علی خاں کے بعد کم یاب ہوگئی۔ صوبائی، قبائلی اور ذاتی اغراض کی اس کش مکش میں فرار اور بے وطنی کی ذہنیت زیادہ گہری ہونے لگی۔ ایک حدیث کے مطابق "حُب الوطن من الایمان" ہے۔ لیکن لوگ اب حب الوطنی سے گریز کرنے لگے بلکہ ایک گروہ تو اسے اسلام کے منافی بتانے لگا۔ اب یہ تماشا دیکھنے میں آتا ہے کہ ہر کس و ناکس ملک چھوڑ کر باہر جانے کے لیے بے قرار ہے۔ طرفہ تماشا یہ کہ گزشتہ دس سال سے حکومت اس پیشہ ور طبقے کو بھی بلا روک ٹوک ملک بدر ہونے کی ترغیب دے رہی ہے جس کی تعلیم پر ہر سال اربوں روپے خرچ کیے جاتے ہیں۔ ہمارے بچپن میں ہر مسلمان کی زبان سے جو صدا نکلتی تھی "میرے مولا بلا لے مدینے مجھے" اس کی تعبیر کسی اور پیرائے میں نظر آئی۔ یہ کوئی نہیں پوچھتا کہ جب باصلاحیت لوگوں کے لیے ملک میں جگہ نہیں رہے گی تو ملک کی تعمیر کا حق کون ادا کرے گا۔ جب لوگ معاشی اور ثقافتی بحران کا ذکر کرتے ہیں اور نئی نسل کی بے راہ روی پر نکتہ چینی کرتے ہیں تو انھیں غور کرنا چاہیے کہ بے وطنی کا درس دے کر وہ ایک ایسی عمارت کھڑی کر رہے ہیں جس کی بنیادیں کمزور ہیں۔ اس پر طرّہ انسانی رشتے کا وہ سلسلہ ہے جو قبیلے یا برادری تک محدود ہے اور اس رویّے پر قائم ہے کہ اپنوں اور غیروں کو جانچنے کے لیے دو مختلف معیار واجب ہیں۔ اس دوغلے پن کی وجہ سے معاشرے میں جیسی منافقت پیدا ہو چکی ہے اس کا ذکر بے سود ہے۔ ہمارے شعر و ادب، مصوّری اور موسیقی میں وقت کے ساتھ گہرائی کے بجائے جو سطحیت نمایاں ہوتی جاتی ہے اس کی وجہ انھیں امور میں تلاش کرنا چاہیے۔

تاریخ کا طالب علم جب مسلمانوں کے ماضی پر نظر ڈالتا ہے تو حیران ہوتا ہے کہ وہ حکومت کو کسی ضابطے کے تحت منتقل کرنے کا کوئی قانون وضع نہ کر سکے۔ اقتدار کے لیے ہر ملک اور ہر زمانے میں کش مکش ہوتی آئی ہے، لیکن اہلِ مغرب نے قدیم روم کے حقِ وراثت کے اس اصول کو تسلیم کر کے کہ اقتدار بڑے بیٹے کو منتقل ہوگا خانہ جنگی کے خطرے کو محدود کر دیا۔ مسلمان

اس قسم کا کوئی قانون وضع نہ کر سکے۔ یہی وجہ ہے کہ خلافت راشدہ کے بعد ہر حاکم کی جانشینی کا فیصلہ عموماً تلوار کرتی تھی ؎

ہر کہ شمشیر کشد سکّہ زند

کی آواز ہماری تاریخ کے ہر صفحے سے سنائی دیتی ہے۔ سیاسی بصیرت کی اس کمی نے مسلمانوں کو جو نقصان پہنچایا اس کا اثر آج بھی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اس کی بیّن مثال یہ ہے کہ ہمارا سیاسی ذہن دستور (CONSTITUTION) اور قانون (LAW) میں عملاً تمیز نہیں کرتا۔ جمہوری دستور اس اصول پر وضع کیا جاتا ہے کہ اقتدارِ اعلیٰ کے مالک عوام ہیں جو اپنے حاکموں کو ایک مقررہ مدّت کے لیے منتخب کرتے ہیں اور ان کے اختیار کو انتظامیہ، مقنّنہ اور عدلیہ میں اس طرح تقسیم کرتے ہیں کہ ان میں مناسب توازن موجود رہے، لیکن مطلق العنان بادشاہت کی روایت دنیا کے بیشتر حصّوں میں بالعموم اور مسلمانوں میں تا زمانۂ حال بالخصوص اتنی مستحکم رہی ہے کہ ان کا حکمراں طبقہ عوام کے جمہوری حق کو تسلیم کرنے پر آسانی سے آمادہ نہیں ہوتا۔ چنانچہ اسلامی ممالک میں اس صدی کے آغاز میں دستور سازی اور حقوقِ انسانی کی جو تحریک شروع ہوئی وہ ہنوز اپنے مقصد کو حاصل نہ کر سکی۔ اس امر کا اقرار کرنا چاہیئے کہ دنیا کے بیشتر ممالک میں آمریت اور جمہوریت کے متضاد رجحان برسرِ پیکار رہیں۔ فرق یہ ہے کہ اسلامی ممالک میں عوام دشمن عناصر مذہب کی غلط تفسیر اپنے حقوق کے تحفظ کے لیے کرتے ہیں جس سے مسئلہ زیادہ پیچیدہ ہو جاتا ہے۔

مسلم معاشرے کی دوسری بڑی کمی یہ ہے کہ وہ فرسودہ اوہام کو ثقافتی میراث سمجھتا رہا ہے اور ایسے اداروں کی تعمیر میں ناکام رہا ہے جو دورِ جدید میں بقا کے لیے از حد ضروری ہیں۔ بلدیہ اور ضلع کونسل جیسے معمولی اداروں کو بھی چلانے سے ہم قاصر ہیں جو برطانوی دورِ حکومت میں بخیر و خوبی فرائض انجام دیتے تھے۔ کوئی کام بغیر سفارش اور ذاتی ملاقات کے آسانی سے نہیں ہو سکتا۔ فرد کی شناخت شہری کی حیثیت سے نہیں بلکہ خاندان، قبیلے اور صوبے کے حوالے سے ہوتی ہے۔ اس کے برعکس ترقی یافتہ ملکوں کی پیش رفت کا راز یہی ہے کہ تمام شہری بلا امتیاز ان حقوق کے مستحق ہیں جنھیں قانون نے قبول کیا۔ صدیوں سے لوگ مقامی

معاملات میں تعاون اور معاشی ذمہ داری کے عادی ہو چکے ہیں اخلاق کا تصوّر انفرادی نجات پر نہیں بلکہ معاشرے کی بہتری پر قائم ہے۔ ضمیر کا تقاضا فقط یہ نہیں کہ وہ ہمہ وقت آخرت کی فکر میں غلطاں و پیچاں ہوں بلکہ اس دنیا کو عدل و انصاف کی ان بنیادوں پر قائم کریں جو فی الحقیقت رضائے الٰہی ہے۔ چور بازاری، منافع خوری، بے انصافی اور استحصال کے ساتھ دینِ حق کا منشا پورا نہیں ہو سکتا۔ یہ بھی سچ ہے کہ اداروں کی کارکردگی کو بہتر بنانے کے لیے صحیح افراد کا انتخاب ضروری ہے اور یہ تقاضا تب ہی پورا ہو سکتا ہے جب انھیں ذاتی اثر و رسوخ نہیں بلکہ محض قابلیت کے معیار پر جانچا جائے۔ پاکستان میں وفاقی ملازمتوں کو صوبائیت کی بنا پر مخصوص کرنے سے قومی یک جہتی کو بے اندازہ نقصان ہوا۔ ستم بالائے ستم یہ کہ بہت سے جوہر قابل، جو مقابلے کے امتحانوں میں سرفہرست ہوتے تھے، صوبائی گوشوارے سے خارج ہو کر کہیں کے نہ رہتے تھے۔ اس سلسلے میں مجھے ایک دلچسپ لطیفہ یاد آیا۔ کوئی تیس سال پرانی بات ہے جب میاں افضل حسین فیڈرل پبلک سروس کمیشن کے صدر اور حسن شاہد سہروردی رکن تھے۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے غیر ملکی وظیفوں کا اعلان ہوا تو مناسب امیدواروں کے انتخاب کے لیے کمیٹی تشکیل دی گئی جس میں وزارتِ تعلیم کی نمائندگی میرے سپرد ہوئی۔ مشرقی پاکستان سے ایک اردو داں نوجوان آیا جو ہر لحاظ سے نہایت موزوں تھا، لیکن کسی وجہ سے میاں صاحب کو پسند نہ آیا۔ جب وہ کوئی نقص نہ نکال سکے تو پوچھا کہ آپ ڈھاکہ میں کب سے مقیم ہیں۔ جواب ملا کہ قیامِ پاکستان سے پہلے والد نے وہاں ملازمت اختیار کر لی تھی۔ میاں صاحب مطمئن نہ ہوئے۔ انہوں نے اعتراض کیا کہ آپ خود وہاں پیدا نہیں ہوئے۔ نوجوان اعتراض کا مافیہ سمجھ گیا تو کاغذ سمیٹ کر یہ کہتا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ اسکالرشپ کا تعلق نطفے کے محلِ وقوع سے ہے۔ اس جملے پر میں اور سہروردی صاحب قہقہہ مار کر ہنس پڑے اور میاں صاحب کا چہرہ غصّے سے سُرخ پڑ گیا۔ میں کئی سال فیڈرل پبلک سروس کمیشن کا ممتحن رہ چکا ہوں اور وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ جو جو امیدوار سرفہرست ہوتے تھے وہ صوبائی کوٹے کا مطالبہ پورا نہ ہونے کی وجہ سے خارج الفہرست کر دیے جاتے تھے۔

جب دن بھر کی لڑائی کے بعد شام کو میدان میں موت کا سنّاٹا چھا جاتا ہے تو گدھوں کے غول کمیں گاہوں سے نکل کر مردہ اور نیم مردہ انسانوں کا گوشت نوچنے لگتے ہیں۔ کچھ ایسا ہی حال قیامِ پاکستان کے وقت نظر آیا۔ جب ہجرت کی خانماں بربادی کے جلو میں موقع پرستوں کے گروہ نے متروکہ جائدادوں پر دست درازی کے بعد لوٹ کھسوٹ کے ایسے ایسے طریقے ایجاد کیے کہ رفتہ رفتہ فریب کاری اور کام چوری کو ہنر اور فرض شناسی اور کارگزاری کو عیب سمجھا جانے لگا، شہروں کی زندگی پر دیکھتے دیکھتے نودولتیوں کا قبضہ ہو گیا۔ یہ لوگ اخلاق، روایت اور تہذیب کی قدروں سے قطعی ناآشنا تھے لیکن حصولِ زر کے ایسے استاد تھے کہ ملک کی جیب کاٹ کر رکھ دی۔

سترھویں صدی میں ہالینڈ میں مالتھس (MALTHUS) نامی مفکّر پیدا ہوا جس نے پیش گوئی کی کہ آنے والی صدیوں میں انسانیت کے لیے سب سے بڑا مسئلہ افزائشِ نسل ہو گا۔ ایک وقت ایسا آئے گا جب کھانا کم پیدا ہو گا اور کھانے والے زیادہ ہوں گے۔ اس طرح فاقہ کشی بنی نوع انسان کا نصیب ہو کر رہ جائے گی۔ بیسویں صدی میں برّصغیر کی آبادی تا ایں دم تگنی ہو چکی ہے یعنی تیس کروڑ سے بڑھ کر نوّے کروڑ تک پہنچ چکی ہے اور تخمینے کے مطابق اگلے بیس سال میں ڈیڑھ ارب ہو جائے گی۔ جن ملکوں کو ترقی یافتہ کہا جاتا ہے انھوں نے اموات کے ساتھ پیدائش کو بھی جائز حدود تک قابو میں رکھ کر اس توازن کو برقرار رکھا ہے جو قانونِ قدرت کے مطابق ہے، لیکن پاکستان جیسے ترقی پذیر ممالک میں اس طرف خاطر خواہ توجہ نہیں دی جاتی ہے بلکہ کثرتِ اولاد کو قدرت کا فیضِ عام سمجھا جاتا ہے۔ جب تک معاشرہ خاندانی منصوبہ بندی کو فرضِ اوّل نہ سمجھے گا خاطر خواہ ترقی کا تصوّر نہیں کیا جا سکتا۔ بدعنوانی اور چھینا جھپٹی کا تجزیہ کیجیے تو معلوم ہو گا کہ مال کم پیدا ہو رہا ہے اور اس کے طالب بہت ہیں۔ اس پر طرّہ وہ نودولتا پن ہے جو ہر لقمے کے ساتھ بھوک کو بڑھاتا جاتا ہے۔

مشتے نمونہ از خروارے کی طرح میں نے چند مسائل کی طرف سرسری اظہارِ خیال کیا ہے جن سے ہمیں عہدہ برآ ہونا ہے۔ ان مسائل کا بار آنے والی نسلوں پر دھکیل دینا یا ان

کے لیے بیرونی طاقتوں کو موردِ الزام ٹھہرانا یکسر بے انصافی ہے۔ جاگیردارانہ طرزِ فکر، نئی زندگی کی تعمیر نہیں کر سکتا اور نہ بیرونی قرضوں سے مستحکم ترقی کے تقاضے پورے ہو سکتے ہیں۔ صحیح قیادت، تنظیم اور محنت کے بل بوتے پر ہی قوم ان دشواریوں پر قابو پا سکتی ہے جس سے وہ دوچار ہے۔ کئی سنگین غلطیاں یاد آتی ہیں جو ہمارے اربابِ حل و عقد سے سرزد ہوئیں۔ لیکن چند صفحات میں ان کا بیان ممکن نہیں۔ جب فضا سازگار ہوگی اور مورخ کو موقع ملے گا تو وہ ان تلخ حقیقتوں کو شاید بے نقاب کر سکے، تاہم دھندلکے میں مسافر اسی توقع پر چلتا رہتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح منزل مل جائے گی۔ کسی مصور نے "اُمید" کے نام سے ایک تصویر بنائی ہے جس میں انسانیت ایک نابینا عورت کی شکل میں کرۂ زمین پر بیٹھی ہوئی ہے۔ ہم اسی امید و بیم کی حالت میں مبتلا ہیں۔

تحریکِ پاکستان کے جوش و خروش میں یہ سوچا بھی نہیں گیا تھا کہ اس سرزمین کے باشندوں میں لسانی و ثقافتی اختلافات رونما ہو سکیں گے، لیکن دیکھتے ہی دیکھتے بنگالی اور اردو کے تنازع نے ویسی ہی تلخی اختیار کر لی جیسی کسی زمانے میں اردو اور ہندی کے قضیے نے کی تھی۔ علاقائی زبانوں کی موجودگی کے باوجود یہ صورت مغربی پاکستان میں پیش نہ آئی۔ اس کی ایک وجہ ان میں اور اردو میں رسم الخط کی یکسانیت ہے۔

اردو زبان کی قومی حیثیت مسلّم ہے لیکن اس کے دوش بدوش علاقائی زبانیں پروان چڑھ رہی ہیں اور ان کے ادب کو بھی فروغ حاصل ہو رہا ہے۔

مصنّف اور قاری کے لیے ادب شوق کی چیز ہے۔ البتہ آزادی کی فضا میں ہی اچھّے ادب کی تخلیق ممکن ہے۔ عجیب بات ہے کہ برطانوی دورِ حکومت میں ادیب کو وہ گھٹن محسوس نہ ہوتی تھی جس سے وہ آج دوچار ہے۔ احتساب کے علاوہ نشر و اشاعت کی ایسی پابندیاں سدِّ راہ ہیں جن کا تصوّر بھی پہلے نہیں کیا جا سکتا تھا۔ تاہم اردو خوانوں کی تعداد میں اضافے کے ساتھ ساتھ عام پسند کتابوں اور جریدوں کی کمی نہیں رہی۔ معیاری ادب کا معاملہ الگ ہے۔ اس کی تخلیق کے لیے ریاض کی ضرورت ہے جس کا اندازہ صرف اہلِ ذوق ہی

کر سکتے ہیں۔

پاکستانی ثقافت کے رنگ و روپ پر بحثوں کا سلسلہ جاری ہے۔ اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔ برِّصغیر کی تقسیم تک مسلمان اپنے کو ایک ہی تہذیب کا وارث سمجھتے تھے لیکن یہ شیرازہ تقسیم ہند کے بعد منتشر ہونے لگا اور اب تاریخ اور جغرافیہ میں کش مکش شروع ہو گئی۔ خالص ثقافتی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو تہذیب پر کسی قوم یا ملک کا اجارہ نہیں، لیکن قومی سیاست میں ایسی رواداری کی گنجائش نہیں ہوتی۔ بہر صورت جب تک ہندوستان میں اردو کا چلن رہے گا اور یہ زبان پاکستان کے قومی اتحاد کی ضامن رہے گی دونوں ملکوں کے مابین خیر سگالی کا ایک مضبوط پل باقی رہے گا۔

ثقافتی زندگی میں فنونِ لطیفہ کی اہمیت کو ہمارے عوام کیا، حکمران بھی کم سمجھتے ہیں۔ بات صرف شعر و ادب کی نہیں، بلکہ موسیقی، مصوّری اور اُن سارے فنون کی ہے جو حیاتِ انسانی میں حیوانی جبلتوں کو دبلتے اور روحانی مسرّتوں سے آشنا کرتے ہیں۔ ہماری آئے دن کی زندگی میں جس سختی، کرختگی اور جارحیت کا مظاہرہ ہوتا ہے وہ اس امر کا ثبوت ہے کہ ہم میں تمیز اور رواداری کی کمی ہے۔ درسی نصاب میں مناسب ترمیم کر کے اس کمی کو کسی حد تک دور کیا جا سکتا ہے۔

میں نے کم عمری میں جو حقیقت کی تلاش شروع کی وہ پیرانہ سالی میں بھی جاری ہے۔ ظاہر کی آنکھ نے تماشا گاہ عالم میں بہت کچھ دیکھا اور چشم باطن نے روح کی گہرائیوں کو کچھ حد تک پہچانا۔ اب نہ کوئی تمنّا ہے نہ کوئی خواہش۔ ماضی ایک دولتِ صادق کی طرح پہلو بہ پہلو چل رہا ہے۔ اب خواب اور بیداری میں کوئی فرق نہیں رہا۔ گلبانگِ فجر کے وقت جب میں آسمان کی طرف دیکھتا ہوں تو ستارۂ صبح مُسکرا کر کہتا ہے۔ یونانی اساطیر کا یہ گمان صحیح ہے کہ جسم خاکی سے جدا ہو کر روحیں افلاک میں تاروں کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ اخترِ سوختہ تو میرے قریب آ۔ تیرے لیے ایک خاص مقام کا تعیّن ہو چکا ہے۔

امیرِ اندلس عبدالرحمٰن ثالث کے وزیر باتدبیر المنصور کے متعلق کہا گیا ہے کہ جب کسی مہم

سے لوٹتا تو اپنی قبا کی گرد کو ایک کوزے میں جھٹک دیتا۔ جب مہم جوئی میں زندگی ختم ہوئی اور اس نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا تو کوزے کی خاک اس کے کفن پر چھڑک دی گئی۔ میں اتنی گردِ راہ کہاں سے لاؤں لیکن بساط میں جو باقی رہ گئی اسے ان اوراق پر جھٹک دیا ہے۔

ایران میں میرے ایک دوست ڈاکٹر برجندی تھے جن کی دانش مندی اور ذکاوت کے سب قائل تھے۔ ایک بار میں نے ان سے کہا "کیسی عجیب بات ہے کہ انسان پر نصیحت کا کوئی اثر نہیں ہوتا اور ہر نسل ماضی کی حماقتوں کو دہراتی رہتی ہے۔" انھوں نے کیا خوب جواب دیا کہ مفکّروں کی تمام نصیحتوں اور تاریخ کے جملہ تجربوں کا ماحاصل ایک مختصر سی کتاب میں تحریر کیا جا سکتا ہے، لیکن ہر فرد کا مقدّر یہی ہے کہ وہ کولھو کے بیل کی طرح ایک ہی لکیر پر اس فریب میں سرگرداں رہے کہ وہ کوئی نئی ایجاد کر رہا ہے تاوقتیکہ وہ عدم کے اسی نقطے پر نہ لوٹ آئے جہاں سے اُس نے پہل کی تھی۔

اس کتاب میں میں نے اپنے ماحول، مشاہدے اور مطالعے کا ذکر کیا ہے۔ اس لحاظ سے صحیح معنوں میں یہ سوانح حیات نہیں بلکہ ایسی تحریر ہے جس میں آپ بیتی کم اور جگ بیتی زیادہ ہے۔ محفلِ ادب سے طویل غیر حاضری کے بعد چند سال قبل اس کی طرف لوٹنے کی مہلت ملی تو حضرتِ صہبا کی فرمائش پر رسالہ "افکار" کے لیے ایک سلسلۂ مضامین سپردِ قلم ہوا۔ بات سے بات نکلتی گئی اور کتاب کا نقشہ ذہن میں اُبھرا ہی تھا کہ بصارت کو، جو پہلے ہی کمزور ہو چکی تھی، ایک جرّاح کی نشتر زنی نے اس طرح متاثر کیا کہ قلم نے ساتھ چھوڑ دیا۔ میری رفیقۂ حیات اور فرزندوں نے سہارا نہ دیا ہوتا تو کبھی کا جان سے گزر چکا ہوتا، تاہم اس پریشاں دماغی کی کیفیت میں کبھی کبھی خلش ہوتی رہی کہ کاش یہ ناتمام کتاب کسی طرح پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے۔ اس کے لیے کسی علم کے شائق نویسندہ کے تعاون کی ضرورت تھی۔ پہلے فاتح فرخ نے اس کام کا بیڑا اٹھایا لیکن وہ جلد ہی لاہور چلے گئے، پھر لیلیٰ خورشید سلمہا نے بڑے عزم و صبر سے باقی ماندہ حصّے کو قلم بند کیا۔ خدا خدا کر کے مسوّدہ تیار ہوا تو صہبا صاحب نے طباعت و اشاعت کی ذمّے داری سنبھال لی اور آخری پروف دیکھنے کی زحمت ڈاکٹر

جمیل جالبی نے گوارا فرمائی۔

جب یہ کتاب چھپے گی تو میں اسے خود نہیں پڑھ سکوں گا، لیکن سچ تو یہ ہے کہ اشاعت کے بعد کتاب پر مصنّف نہیں بلکہ قارئین کا حق ہوتا ہے اور اس کی خوبی اور خامی کا فیصلہ وہی کر سکتے ہیں۔ میں انسان دوستی اور انسان بیزاروں کی بھول بھلیّوں سے گزر کر انسان شناسی کی منزل تک پہنچا ہوں۔ یہ روحانی اور ذہنی سفر آسان نہ تھا اور اس کے بیان میں مجھے لامحالہ اختصار سے کام لینا پڑا۔ ناسازگار حالات نے کئی گفتنی مضامین کو بھی ناگفتہ رہنے دیا۔

کفن بیار تو تابوت و جامہ نیلی کُن
کہ روزگار طبیب است و عافیت بیمار

پاکستان کا منفرد علمی، ادبی اور تہذیبی ماہنامہ

افکار

گزشتہ چالیس سال سے پابندیٔ وقت کے ساتھ شایع ہو رہا ہے اور اس کی عام اور خاص اشاعتیں یونیورسٹیوں، کالجوں، اسکولوں اور لائبریریوں میں محفوظ کی جاتی ہیں۔

افکار ـــــ ملک کا واحد ماہنامہ ہے جس نے جوشؔ، حفیظؔ، فیضؔ اور ندیمؔ ایسے مشاہیر پر اُن کی زندگی میں جوشؔ نمبر، حفیظؔ نمبر، فیضؔ نمبر اور ندیمؔ نمبر شایع کر کے زندہ دوستی اور اعترافِ عظمت کی روایت قایم کی۔ یہ خاص نمبر ملک اور بیرونِ ملک حوالے کا کام دیتے ہیں۔ زندہ و باکمال شخصیتوں پر اتنے جامع و مستند ضخیم نمبر اس سے پہلے کبھی شایع نہیں ہوئے۔

پاکستان کے علاوہ انگلستان، امریکہ، کینیڈا، افریقہ، سعودی عرب اور خلیج کے ملکوں وغیرہ میں اردو دوستوں کا وسیع حلقہ افکار کا ذوق و شوق سے مطالعہ کرتا ہے۔

افکار ـــــ پاکستان کا واحد ادبی ماہنامہ ہے جو محکمۂ تعلیم کراچی، لاہور، پشاور، راولپنڈی، کوئٹہ، جنرل ہیڈ کوارٹرز آرمی اور ایئر فورس سے باضابطہ منظور شدہ ہے۔

گھر کے ہر باشعور فرد کے لئے ایک معیاری ماہنامہ

زرِ رفاقت سالانہ ـــــ رجسٹری سے -/۹۴ روپے۔ فی شمارہ چھ روپے

بیرونی ملکوں سے ـــــ ذریعہ ہوائی جہاز:۔ ۱۵ پونڈ ـــــ ۴۰ ڈالر

مینیجر ماہنامہ افکار۔ رابسن روڈ۔ کراچی

صہبا لکھنوی

کی مشہور تحقیقی کتاب

اقبال اور بھوپال

(داؤد انعام یافتہ)

کا دوسرا ایڈیشن کئی قیمتی اضافوں، دیباچہ طبع ثانی اور متعدد نادر و نایاب خطوط اور تصاویر کے ساتھ شایع ہو چکا ہے ——— نئے ایڈیشن میں اقبال نامے میں تحریف، راس مسعود کے چھے نادر خطوط، اقبال کے وظیفے سے متعلق نواب حمید اللہ خاں کی مرتبہ قیمتی یادداشت، اقبال کے احکام وظیفے کی فوٹو کاپی، اقبال کے بھوپال نیاز مند ممنون حسن خاں کے چند اہم انکشافات، قرآن مجید کے حواشی سے متعلق اقبال کا ایک نایاب خط ڈاکٹر تاثیر کے نام اور شیخ اعجاز احمد کی بعض توضیحات اور نئی معلومات شامل ہیں۔

○ بہترین گیٹ اپ ○ مضبوط جلد صفحات ۴۰۸

○ بڑا سائز ○ قیمت بیالیس ۴۲ روپے

ملنے کے پتے

① اقبال اکیڈمی پاکستان

۱۱۶۔ میکلوڈ روڈ۔ لاہور

② مکتبۂ افکار۔ راس روڈ کراچی

۱۹۳۰ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک کا زمانہ برِّصغیر کی تاریخ میں صحیح معنوں میں نشاۃ الثانیہ کا دور تھا جس نے ہماری قومی فکر و نظر میں انقلاب برپا کر دیا۔ اس دور نے ایسے ایسے مفکر و مدبّر پیدا کیے جنھوں نے ہم کو نئے موڑ اور نئے زاویوں سے دیکھنا دکھانا سکھایا۔ انھیں میں ایک بہت اہم نام ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کا ہے۔ ان کے عہد آفریں مضمون "ادب اور زندگی" اور چند دوسرے مضامین سے ترقی پسند تحریک اور انجمن کے اصول و نظریات کے تعیّن اور ترتیب و تدوین میں بہت مدد ملی۔ خصوصیت کے ساتھ "ادب اور زندگی" ترقی پسند تنقید کا سنگِ بنیاد ثابت ہوا۔ اسی دوران میں انھوں نے اردو زبان کو مغربی اور بالخصوص روسی ادب سے بھی روشناس کرایا۔ اس کے علاوہ "محبّت اور نفرت" کے عنوان سے اُن کے افسانوں کا بھی ایک مجموعہ شائع ہوا ــــ پھر ملک کی تقسیم کے بعد منصبی مصروفیات کی وجہ سے ان کے لکھنے لکھانے کی رفتار سست رہی۔

ادھر پھر ایک مدّت کے بعد "افکار" کے گزشتہ شماروں میں ان کی خود نوشت کا سلسلہ قسط وار شائع ہوتا رہا۔ اور اب یہ "گردِ راہ" کے نام سے کتابی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔ آپ بیتی کے پیرائے میں دراصل یہ پچھلے پچاس ساٹھ برسوں کی ادبی، تہذیبی، سیاسی اور سماجی تاریخ کی زندہ دستاویز ہے اور ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کا نام ہی اس کے مستند اور معتبر ہونے کی سب سے بڑی ضمانت ہے۔ وہ راہی بھی رہے ہیں اور رہبر بھی۔ اُن کی یہ کتاب بھی ادب و تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے سنجیدہ حلقوں میں ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھی جائے گی۔

ــــ مجنوں گورکھپوری

ادیب، ناقد، عالم، معلّم ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کا نام برِّصغیر کے علمی اور ادبی حلقوں میں قریب قریب نصف صدی سے آشنا اور معتبر ہے، آپ نے ترقی پسند تحریک کے ابتدائی دنوں میں اپنے تخلیقی سفر کا آغاز کیا اور اس تحریک کے سربرآوردہ اراکین میں شامل رہے۔ شرق و غرب کے مختلف علوم و السنہ میں استعداد پیدا کی، کچھ عرصہ بعض اداروں میں تعلیم و تدریس سے منسلک رہے، بعد ازاں بین الاقوامی علمی اور ثقافتی تنظیم یونیسکو کے عہدے دار کی حیثیت سے مختلف ممالک میں مصروفِ کار رہے اور دیس پردیس کے ادبی مشاہیر سے دوستانہ کیا، غرض گزشتہ نصف صدی کی علمی ادبی سیاسی اور ثقافتی زندگی کے مختلف شعبوں کا مختلف مقامات پر غائر نظر سے مشاہدہ کیا، اب کشاکشِ روزگار سے فراغت کے بعد آپ نے اس بھرپور زندگی کے تجربات اور مشاہدات کی یادداشتیں رقم کی ہیں، "گردِ راہ" کے صفحات میں ہمارے عصری دور کا یہ منظر نامہ پڑھنے والوں کے لیے یقیناً دلکش اور بصیرت افروز ثابت ہوگا۔

ــــ مسعود مفتی